۱۷۳

رجسٹرڈ نمبر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لقد وجدت مجال القول ذا سعۃ
فان وجدت لساناً قائلاً فقل
(اعشی)

زبان

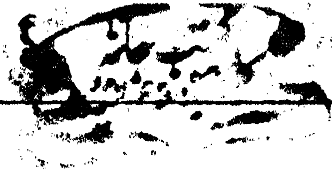
کاٹھیاواڑ کا پہلا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

مرتبہ

عبدالرحمن خوشتر (منگرولی)

سالانہ (چار روپیہ)

ششماہی (دو روپیہ)



زبان ۱۴۳

جلد ۱ | نمبر ۱

فہرست مضامین ماہ جولائی سنہ ۱۹۲۶ء

صفحۂ ادارت

خلاق عالم نے جس ماہ میں (روز عاشورہ) عالم کون وفساد کو آفرنیش کیا ہے، ہمارا رسالہ بھی اسی ماہ سے عالم وجود میں آتا ہے، اس لئے امید ہے کہ آغاز ۱۳۴۵ھ کے ساتھ ساتھ اگر تاقیامت نہیں تو کم ازکم میری زندگی کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کے بھی بھلے برے دن ضرور گذاریگا بلکہ جب تک زبان دہن میں اور دل پہلو میں ہے یہ **"زبان"** جسم میں جان کی طرح میری حیات کا ایک جزو لاینفک ہو کر رہیگا۔

پندرہ بیس سال سے زاید عرصہ ہوا کہ ریاست جوناگڈھ نے ایک محکمہ تاریخ قایم کیا تھا جس میں چند لایق اہل قلم جوناگڈھ کی تاریخ کے متعلق تحقیقات کر رہے تھے۔ ان اصحاب میں سے جناب منشی غلام محمد صاحب مرحوم (ساکن اولپاڈ گجرات) اعلی تاریخی مذاق رکھنے والے اور مستثنی قابلیت کے بزرگوار تھے، جنھوں نے آج سے بارہ سال قبل داعی اجل کو لبیک کہا اپنی حین حیات میں ریاست جوناگڈھ کی ایک ضخیم تاریخ بنام "مرآۃ مصطفی آباد"[1] مرتب کر چکے تھے جو ان کی وفات کے زمانہ سے لیکر اب تک غیر مطبوع حالت میں پڑی ہوئی تھی کتاب مذکور ملک سورٹھ کی مستند تاریخ ہے جس کے ضمن میں کاٹھیاواڑ کی تاریخ و جغرافیہ سے متعلق نادر تحقیقات کا ذخیرہ فراہم کیا گیا ہے۔

ہمیں یہ سنکر بڑی مسرت ہوئی کہ مرحوم کے خلف الرشید شیخ غلام احمد صاحب (پرنسپل وکٹوریہ جوبلی مدرسہ پوربندر) کی تحریک سے ریاست جوناگڈھ نے اپنے خرچ سے اس کتاب کی اشاعت منظور فرمائی ہے جو بمبئی میں اعلی پیمانہ پر باتصویر چھپ رہی ہے اور عنقریب حلیہ طبع سے آراستہ ہو کر نکلے گی۔

آجکل بعض دیسی ریاستیں ملک وقوم کی جو قابل تقلید خدمات انجام دے رہی ہیں اس بنا پر ہمیں ریاست جوناگڈھ سے جو ایک زبردست اسلامی ریاست ہے بہت کچھ توقعات رکھنی چاہئے، اگر وہ سردست اپنے دفاتر کی زبان اردو

---

[1] اس کے علاوہ مراۃ محمدی (اردو) (۲) تاریخ گجرات (انگریزی) اور مراۃ عالمگیری (گجراتی) چھپ چکی ہیں۔ جو مولوی غلام رسول انبا سورتی۔ بھنڈی بازار بمبئی یا خلافت پریس ڈونگرے بمبئی سے مل سکتی ہے۔

نہیں کرسکتی تو کم از ایک دار التراجم یا دار التصانیف ہی کی بنیاد ڈال دے جس میں غیر زبانوں کی بہترین اور نادر تصانیف اردو میں ترجمہ کی جائیں اور ایسی کار آمد کتابیں چھپوائی جائیں جس سے ملک و قوم کو فائدہ ہو۔

یقین ہے کہ شہریار سورٹھہ عالی جناب نواب مہابت خانجی صاحب بہادر جہاں اور صدہا کاموں میں اپنی فیاضی و دریا دلی کا ثبوت دے رہے ہیں وہاں ہماری اس درخواست پر بھی توجہ فرمائیں گے۔ ساتھ ہی عالیجناب شیخ محمد بہائی صاحب وزیر ریاست سے بھی جو ایک پابند صوم و صلوٰۃ پکے مسلمان ہیں توقع ہے کہ وہ بھی ایسے کارہائے نمایاں سے اپنی علم پروری اور ملکی و قومی ہمدردی کا ثبوت دیں گے۔

ہماری غفلت اور خود فراموشی اس درجہ تک پہنچ گئی ہے کہ ہم اپنے ہاں کے کسی جوہر قابل کی قدر و قیمت سے اس وقت تک بیخبر رہتے ہیں جب تک "باہر والے" اس کے نتائج دل و دماغ سے ہمیں آگاہ نہ کریں۔

کاٹھیاواڑ کے صدر مقام راجکوٹ کی خاک نے ایک ایسا باکمال عربی علم و ادب کا عالم پیدا کیا ہے جو اپنی ادبی تحقیقات کے لحاظ سے اس وقت ہندوستان بلکہ ممالک اسلامیہ کے معدودے چند افراد میں شمار ہو سکتا ہے۔ ہماری مراد اپنے محترم جناب مولانا مولوی میمن عبد العزیز صاحب سے ہے جو آجکل مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں عربی کے پروفیسر ہیں۔

ہمارے اس لایق "عزیز کاٹھیاواڑ" کا چرچا مصر کے بازار علم میں ہو رہا ہے چنانچہ وقتاً فوقتاً مصر کا مشہور علمی رسالہ الزہراء ان کے مقالات شائع کرتا اور ان کے نتائج افکار سے ہمیں مطلع کرتا رہتا ہے۔

رمضان کے مجلہ الزاہرا میں ایڈیٹر صاحب محب الدین خطیب اطلاع دیتے ہیں کہ مولانائے موصوف کی مندرجہ ذیل کتابیں ان کے مطبع سلفیہ میں زیر طبع ہیں۔

(۱) ابو العلاء و ما الیہ (ابو العلاء المعری کے تنقیدی سوانح)

(۲) الغایت (معری کا وہ غیر مطبوعہ کلام جو اس کے دواوین میں نہیں پایا جاتا)

(۳) زیادات شعر المتنبی (متنبی کا غیر مطبوعہ کلام)

کتب ذیل ان کی تصحیح کے ساتھ چھپ رہی ہیں:-

(۱) رسالہ "کلا" لابن فارس

(۲) ما تلحن فیہ العلوم للکسائی

(۳) رسالۂ ابن العرابی الی الامام فخر الدین رازی

ہم علامہ موصوف کو ان کی ان ادبی فتوحات پر مبارک باد پیش کرتے ہوئے بحیثیت ہموطن ہونے کے ان سے یہ استدعا کرنے کا پورا استحقاق رکھتے ہیں کہ وہ اس رسالہ کے ذریعہ اپنی علمی معلومات سے اپنے ہموطنوں کو بھی مستفید فرماتے رہیں تاکہ "نزدیکان بے بصر دور" کی طرح ان کے نتائج طبع سے محروم نہ رہیں۔

دوسری قابل فخر ہستی جس کو کوہ گرنار کی پرانقلاب تلہٹی نے پیدا کرکے کلہ کوہ سے بھی بلند آسمان علم وکمال پر مثل کوکب چمکایا وہ ہمارے دوست قاضی احمد میاں صاحب اختر (جوناگڑہی) ہیں جو دنیائے ادب میں خاصی شہرت رکھتے ہیں اور جن کے نتائج افکار سے ہندوستان کے نامی اور چوٹی کے رسائل متفیض ہوتے رہتے ہیں۔

آپ ساعد اندلسی کی کتاب "طبقات الامم" کا اردو میں ترجمہ کررہے تھے جو اب تکمیل کو پہنچ گیا ہے اور عنقریب مجلس دار المصنفین اعظم گڈھ کے سلسلہ تصانیف میں شائع ہوگا آپ کو اس ترجمہ میں بڑی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے کتاب میں جا بجا نہایت مفید اور پرازمعلومات ذیلی حواشی بھی دیئے ہیں جن کے لئے ان کو متعدد مستند عربی کتب کی ورق گردانی کرنی پڑی ہے، اس ترجمہ کو اردو کے خزانہ میں ایک گراں بہا اضافہ سمجھنا چاہیئے۔

ناانصافی ہوگی اگر ہم قاضی صاحب موصوف کی ان مساعی جمیلہ کا اعتراف نہ کریں جو انہوں نے ترتیب زبان کے متعلق معقول مشورہ اور مضامین کی فراہمی وغیرہ میں کی ہیں تراجمات اور اخبار علمیہ کے عنوانات آپ نے اپنے لئے مخصوص کرلئے ہیں اور بلاناغہ ہر ماہ مستقل طور پر اس پر لکھنے کا ہم سے وعدہ فرمایا ہے یا یوں سمجھئے کہ جو کام ہمارا تھا اس کا ذمہ لیکر ہمیں ایک زبردست ذمہ داری سے سبکدوش کردیا ہے۔

بیجا نہ ہوگا اگر اس سلسلہ میں منگرول کی دو زبردست خاموش ہستیوں کا ذکر بھی کردیا جائے ان میں سے ایک ہمارے استاذی مولانا مولوی حکیم سید محمد حسن صاحب ترمذی ہیں جن کے علمی وادبی مضامین آج سے دس بارہ سال پیشتر طبی رسائل میں نکلتے رہتے تھے، نیز عربی کا ایک قلمی نسخہ اسباغ زایا (حصہ اول) جو کیمیاوی صحول معالجات پر مشتمل ہے عرصہ ہوا پبلک کے فائدہ کے لئے اردو میں ترجمہ کرکے چھپوادیا ہے۔

آپ عربی و فارسی علم و ادب کے جید عالم ہیں عرصہ سے مضامین لکھنا چھوڑ دیا ہے تاہم "زبان" کے لیئے مضمون عطا فرمانے کا وعدہ فرمایا ہے۔ جس کے لئے ہم آپ کے بیحد ممنون ہیں۔

دوسری ہستی جناب سید محمد علی صاحب ترمذی پروفیسر بہار الدین کالج جونا گڈھ کی ہے جن ہیں مبدء فیاض نے استدلال و تحقیق کی اعلیٰ قابلیت ودیعت فرمائی ہے عربی فارسی میں بھی کامل دستگاہ ہے باوصف اس کے اب تک خاموش اور علمی دنیا سے الگ ہیں لیکن یقین ہے کہ وہ "زبان" کے لئے "قفل خموشی" توڑ دیں گے اور علمی دنیا کو اپنی وسیع معلومات سے مستفیض فرمائیں گے۔

رسالہ مرتب ہو کر مطبع میں جارہا تھا کہ ہمنے یہ نوید روح پرور سُنی کہ ہمارے اور "زبان" کے سب سے بڑے محسن و معاون جواں بخت و فیض رساں عالیجناب نواب محمد سرور علیخاں صاحب بہادر والئی ریاست کوروائی (سنٹرل انڈیا) کی شادی کتخدائی دارالاقبال بھوپال کے موجودہ نوجوان فرمانروا ابندا اقبال نواب محمد حمید اللہ خاں صاحب دام اقبالہٗ کی بڑی صاحبزادی صاحبہ سے بغیر کسی دہوم دھام کے حسب شرع شریف ہوگئی۔

ہمارے مسلمان رؤسا عموماً ایسی تقاریب کے موقعوں پر ناچ گانے اور فضول رسومات کی ادائیگی میں کروڑوں روپئے برباد کر کے مقروض ہوجاتے ہیں انہیں اس کی تقلید کرنی چاہئے۔

اب ہم اپنے کرم گستر و کرمفرما نواب صاحب بہادر کی خدمت میں (دوہری) دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے دست بدعا ہیں کہ خدائے "حسن و عشق" اس "پیکر محبت و مجسمہ اخلاص کو حیات جاوید عطا فرمائے اور ان میں باہمی محبت و اخلاص رہے۔ آمین!

"ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد"

یہ بھی ہمارے رسالہ کی خوش قسمتی ہے کہ اس کا پہلا ہی نمبر اس تقریب سعید کی یادگار میں زیور طبع سے آراستہ ہو کر دنیائے صحافت میں رونما ہوتا ہے

اڈیٹر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

زبان

ماہ جولائی سنہ ۱۹۲۶ء

افتتاحیہ

زلافِ حمد و نعت اولیٰ ست برخاکِ ادب خفتن
سجودِ میتواں کردن درودِ میتواں کردن

الحمدللہ کہ برسوں سے جو "خیالی معشوق" صرف دل و دماغ کے لئے، وجہ نشاط بنا ہوا تھا آج "کاغذی پیکر" میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو کر نہ صرف باصرہ نوازہی ہو رہا ہے بلکہ اپنی "حیات علمی" کا ثبوت بھی دے رہا ہے اگرچہ اس کی "جلوہ گاہ" ایک پُر شور مقام پر واقع ہوئی ہے لیکن اس کی یہ شوریت "نمک پاش" نہیں، بلکہ "حسن" کو "حسن ملیح" بنانے والی ہے۔

آج رسالہ "زبان" کا اجرا، جہاں سے عمل میں آرہا ہے یہ وہ مقام ہے جس کو حضرت داغ دہلوی، حضرت جلال لکھنوی حضرت تسلیم لکھنوی اور حضرت شمشاد لکھنوی فرنگی محلی وغیرہما ایسی مستند، اہل زبان، اور فخر روزگار ہستیوں نے اور دیگر نامی نامی فضلاء و کملاء نے گاہ گاہ اپنے قدوم فیض لزوم سے رشک گلزار بنایا

اور جن سے ایک عرصہ تک اہلِ منگرول مستفیض ہوتے رہے ہیں، اس لحاظ سے یہاں سے اردو کے ایک ماہوار رسالہ کا اجرا کسی طرح بھی غیر موزوں نہیں ہو سکتا، اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ع

"آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند"

لیکن اب بھی یہاں ایک ایسی ہستی ہے جو کاٹھیاواڑ میں مغتنمات میں سے ہے اور جس پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں اور وہ ہمارے تاجدار منگرول عالی جناب نواب شیخ محمد جہانگیر میاں صاحب دام اقبالہٗ ہیں جن کو نہ صرف اردو اور اس کے ادب سے گہری دلچسپی ہے بلکہ اردو کے سچے حامی و معاون ہیں اسی طرح آپ کے خلف اکبر عالی جناب شیخ عبد الخالق صاحب بہادر ولیعہد ریاست منگرول کو بھی اردو سے ایک گونہ عشق ہے بدیں سبب یہاں نسبتاً اردو کا زیادہ چرچا ہے تاہم ایک "زبان" کے اردو رسالہ کو کسی ایسے مقام سے شائع ہونا چاہئے تھا جو حقیقتاً "زبان اردو کا" مرکز و مسکن ہے۔ یا اس کا اجرا وہیں سے مناسب ہو سکتا تھا جہاں سے اس (زبان اردو) نے "اردوے معلیٰ" اور "اردوئے مطلا" کے واجبی و حقیقی خطابات حاصل کئے اسی طرح عنان ادارت بھی انہیں کے ہاتھ میں ہونی چاہئے تھی جو "اہل زبان و زباندان" ہونے کے بجا طور پر مستحق ہیں۔

برخلاف اس کے میں کاٹھیاواڑی نژاد ہوں اور زبان ایک ایسے گوشے سے اپنی آواز بلند کر رہی ہے جہاں سے "یقینی یاس" ہے کہ اس کا "ہمنوا" اور "ہمزبان" اور اس کی صدا پر "لبیک" کہنے والا ایک بھی نہ نکلے گا۔

مقام (کاٹھیاواڑ) کی غیر موزونیت اور زمین کی شوریت کے علاوہ "اردو سے بیگانہ وحشی" اور "فقدان مذاق" یہ دو ایسی چیزیں ہیں کہ زبان تو کیا کسی ہونہار رسالہ کو کبھی پھولنے پھلنے اور پروان چڑھنے نہ دیں۔

جہاں اس قسم کے سیکڑوں ہلاکت آفریں اسباب اس کی زندگی خطرے میں ڈالنے والے ہیں وہاں ایک زبردست سبب یہ بھی ہے کہ یہاں عوام کی زبان گجراتی اور بعض مسلمانوں کی "گجراتی آمیز اردو" ہے، غالباً یہ کہنا غیر صحیح نہ ہوگا کہ یہاں اردو اور اس کے لٹریچر سے کسی کو (باستثنائے چند) مس تک نہیں ہے۔

"ہر قوم کے حالات و خیالات طرز تمدن و معاشرت کا آئینہ یا مکمل تاریخ اس کی زبان کا لٹریچر سمجھا جاتا ہے" دنیا کے کسی خطہ میں کوئی ایسی متمدن قوم نہیں ہے جس کو اپنی مذہبی، علمی، اور تاریخی روایات سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے کلیتہً "زبان غیر" کا محتاج ہونا پڑتا ہو، لیکن ہم اہل کاٹھیاواڑ اس کی "زندہ مثال" موجود ہیں جو نہ صرف اپنے مذہب و تاریخ ہی سے کما حقہٗ واقف نہیں بلکہ اپنی مادری زبان (اردو) سے بھی نا آشنائے محض ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ یہاں کی ملکی دفتری اور تجارتی زبان گجراتی ہے اور اس کی تعلیم بچوں کے لئے ازبس ضروری ہے لیکن اردو اسقدر بھی غیر ضروری نہیں ہے جسقدر سمجھی جاتی ہے بلکہ اب تو اس نقدان علم (فارسی و عربی) کے زمانہ میں ہر مسلمان کو اردو کا جاننا نہایت ضروری اور فرض ہے کیونکہ ہمارے اسلاف کے بیشتر علمی کارنامہ اردو میں منتقل ہوگئے ہیں اور روز بروز ہوتے جاتے ہیں کسقدر افسوس ہے کہ ہم اردو اور دینی تعلیم کو صرف اُنہیں لوگوں کے لئے مخصوص سمجھتے ہیں جن کا خاندان مولوی قاضی، اور ملا ہوتا ہے اور جو وعظ و قضارت یا امامت کرکے یا مکتب قایم کرکے اپنی گذر اوقات کرتے ہیں۔

اوّل تو یہاں کے مدارس کی اردو تعلیم ہی ایسی ضعیف و ناکارہ ہوتی ہے کہ طلبا مدرسہ چھوڑتے وقت اس کو بھی وہیں چھوڑ جاتے ہیں اور اگر اتفاق سے کسی بچہ کا اردو کی طرف فطری میلان ہوتا ہے اور وہ اس کو شوق سے پڑھتا ہے تو اکثر والدین یہ کہہ کر کہ "کیا اردو پڑھ کر ملّا[1] بنتا ہے" بلکہ ملّاجی (اُستاد) سے بھی یہ کہہ کر کہ ہمارے بچّہ کو اردو پڑھا پڑھا کر کیا اپنی طرح ملا بناؤ گے اور کھانے کمانے کے قابل نہ رہو گے" بچّہ کو اردو پڑھنے پڑھانے کی جانب سے بددل کردیتے ہیں۔

اتنا ہی نہیں بلکہ اگر کسی کی زبان سے دانستہ یا اتفاقیہ کوئی صحیح تلفظ ادا ہو جاتا ہے تو "بڑا ہندوستانی ہوگیا ہے" یا "ہندوستان اسی (آداب گفتگو) میں کھویا" وغیرہ وغیرہ طعن آمیز فقروں سے اس کو شرمندہ بلکہ آیندہ اردو بولنے سے مانع آتے ہیں۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ جہاں کا یہ ماحول اور یہ "بدمذاقی" ہے وہاں کب اور کس طرح اردو اور تہذیب کو فروغ حاصل ہوگا؟

اردو سے اسقدر بیگانہ وشی دیکھتے ہوئے اور ان تمام مایوس کن اسباب کے باوجود میں اسی پرشور اور "پتھریلی" سرزمین سے ایک اردو رسالہ کو معرض وجود میں لا رہا ہوں کن اسباب کی بنا پر؟ محض اپنے بعض کرمفرما احباب کی حوصلہ افزا مراعات کی امید پر اور ابنائے ملک کی قدردانی کے بھروسے پر! اگر ابنائے ملک نے میری اس "ادنیٰ سعی" کی حوصلہ افزا داد دی تو انشاءاللہ بہت جلد میں اپنے ان عزایم میں جن کا ذکر آگے آئیگا کامیاب ہوجاؤنگا اور "ہجوم ناامیدی" "میری اس سعی لاحاصل" کی لذت کو خاک میں نہ ملاسکیگی!

(اڈیٹر)

[1] ملّا کے معنی نہایت حقیر لئے جاتے ہیں حالانکہ ملّا بننا کارے دارد ہے۔ ۱۲

باشندگانِ جزیرہ نمائے کاٹھیاواڑ اقتصادی و مالی حیثیت سے خواہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر گئے ہوں لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تہذیب و تمدن میں علی الخصوص علم و فضل میں تو سب سے پیچھے ہیں۔

نمبر۱ کاٹھیاواڑ کا کل رقبہ زمین ۲۰۷۷۹ مربع میل ہے

نمبر۲ کاٹھیاواڑ کی کل آبادی (ہندو مسلمان اور جین وغیرہ) / ۲۵،۳۸،۴۹۷

نمبر۳ کاٹھیاواڑ میں مسلمانوں (ذکور) کی آبادی / ۱،۶۱،۱۰۲

نمبر۴ اس میں تعلیم یافتہ مسلمان (ذکور) / ۱۴۰۰۴۵ اور (اناث) / ۳۶۸۲

نمبر۵ انگریزی داں (ذکور) / ۱۹۳۱ اور (اناث) صرف ۵۹

نمبر۶ غیر تعلیمیافتہ ذکور / ۱۹۱،۷۷۰ - اور اناث / ۱۶۷۷۸۰

نمبر۷ اور گجراتی بولنے والے / ۲۳۹۳۷۹۴ ہیں

یہی وجہ ہے کہ یہاں سے گجراتی زبان میں اخبارات و رسائل بکثرت شائع ہوتے ہیں اور اردو کا ایک بھی رسالہ یا اخبار نہیں نکلتا۔

ان حالات کے ماتحت میں برسوں سے اس ضرورت کو محسوس کرتا تھا کہ کاٹھیاواڑ سے کسی ایسے اردو اخبار یا رسالہ کا اجرا کیا جائے جو ہمارے خیالات و جذبات کی صحیح ترجمانی کرنے والا ہو اور جس کا واحد مقصد ملک میں محض اردو کا مذاق عام کرنا اور صحیح اردو کو رواج دینا ہو اور جو نہایت سادہ اور عام فہم زبان میں ملک کو خواب غفلت سے بیدار کرے قومی ضروریات سے آگاہ اور مذہبی احکامات سے خبردار کرے اور جو تاریخی روایات سے واقف اور تمدنی و اقتصادی نقائص کی طرف توجہ دلائے لیکن یا تو ان خیالات کو عملی جامہ پہنانے کا ابھی تک وقت نہیں آیا تھا یا کوئی صورت نہیں نکلتی تھی بہرکیف اب جبکہ اسکا وقت آگیا بجائے اس کے کہ مجھے خوش ہونا چاہئے میں، "اپنے تئیں" ملول و غمگین،، پاتا ہوں! کیونکہ جو مطمح نظر میرا ہے وہ بہت ارفع و اعلیٰ ہے چنانچہ

نمبر۱ Kathiawar Directory part IV vol. I p. 96.

نمبر۲ Census of India 1921 vol. VIII part-II p. 4.

نمبر۳ " " " " " " p. 61

نمبر۴ و ۵ و ۶ " " " " " " p. 113

نمبر۷ " " " " " " p. 126

"اشاعت اردو" کی غرض سے طلبہ اور ایسے متوسط الحال طبقہ کے افراد میں جن کو اردو سے دلچسپی ہے رسالہ کی مفت کاپیاں تقسیم کی جائیں، چھوٹے چھوٹے اخلاقی اور سبق آموز فسانے اور مذہبی رسالہ پمفلٹ کی صورت میں عام طور پر مفت تقسیم کر کے ملک میں اردو کا مذاق عام کرنے کی کوشش کی جائے اس میں سے ایک خدمت بھی میں تنہا نہیں ادا کر سکتا۔

اس کے لئے ایک مستقل سرمایہ کی ضرورت ہے اور اگر ملک کے چند سربرآوردہ افراد اس طرف توجہ مبذول فرمائیں تو کوئی بڑی بات بھی نہیں ہے صرف پانچ چھ ہزار روپے سالانہ کافی ہو سکتے ہیں۔

"اس لئے ملک کے ان سربرآوردہ حضرات کی خدمت میں بصد ادب التماس ہے کہ وہ ابنائے ملک کی بہبودی کی خاطر اس طرف ضرور توجہ فرمائیں اور اردو تعلیم کے لئے بھی نہایت شدومد سے سعی اور ایک مشترکہ سرمایہ سے غربا کو مفت اردو تعلیم دلانے کا شعبہ قایم کریں اور اسی سرمایہ سے اردو کی اشاعت بھی کی جائے۔

بحالت موجودہ جبکہ میں اپنے قلیل ذاتی سرمایہ سے بلا کسی خیال منفعت کے اسکا محرک ہوا ہوں اگر "زبان" میں اغراض بالا کی تفصیلی رعایت کو مدنظر رکھوں تو رسالہ کی زندگی معلوم۔ اول تو ملک میں اتنے اردو پڑھنے والے ہی نہیں ہیں کہ رسالہ ان کی خریداری سے اپنے بار کا آپ متحمل ہو سکے اور اگر کچھ ہیں بھی تو ان میں مفلوک الحال اور ایسے غریب ہیں کہ اپنی قلیل آمدنی سے رسالہ کو نہیں خرید سکتے ان حالات کی بنا پر مجھے اپنے رسالہ کے اغراض و مقاصد میں تبدیلی کرنی پڑتی ہے۔

زبان اہل کاٹھیاواڑ ہی کے لئے محدود نہیں اس سے وہ تمام اردو داں حضرات خواہ مشرقی ہند کے ہوں یا جنوبی ہند کے بے دریغ متمتع ہو سکتے ہیں ہاں کاٹھیاواڑی نژاد ہونے کے لحاظ سے گاہے گاہے وطن کی خدمات سے اغماض نہ کرونگا۔

دستور عام کے مطابق ہر اڈیٹر اپنے رسالہ کے پہلے نمبر میں افتتاحیہ مضمون کے ذیل میں رسالہ کے اغراض و مقاصد کی تشریح کر دینا اپنا فرض اولین سمجھتا ہے لہذا میں بھی اس "بدعت حسنہ" کا ادا کرنا ضروری خیال کرتا ہوں۔

اکثر رسائل اپنے افتتاحیہ میں لمبے چوڑے دعادی لیکر عالم وجود میں آتے ہیں اور لوگوں کو اپنی طفلانہ اداؤں سے لبھانے کی سعی کرتے ہیں مگر زبان اس قسم کی خوشامدوں سے بے نیاز ہے اور ہمیشہ

بے نیاز رہے گا۔

"زبان" کی خدمات کی ذمہ داری کا بار لیکر آیا ہے وہ اس کے آئندہ اوراق خود بتا دیں گے زبان کا دعویٰ نہیں ہے لیکن وہ کوشش کریگا کہ ہندوستان کے اعلیٰ رسائل میں اسکا شمار ہو ہیں اگر زبان کو عامیانہ خیالات کی جولانگاہ بنانا نہیں چاہتا تو اپنے بعض کرمفرما احباب کے مشورہ کے مطابق خالص علمی (جس میں ادبیات کی چاشنی نام کو نہو) بناکر بالکل خشک اور ٹھوس بھی بنانا نہیں چاہتا البتہ ایسے ادبی مضامین سے جس میں صرف پرشکوہ اور شاندار الفاظ ہی الفاظ ہوتے ہیں اور جو معانی و مطالب سے معرا ہوتے ہیں اور جن میں غلط اور غیر مانوس ترکیبیں، لایعنی جملے، اور عریاں خیالات ہوتے ہیں زبان کو آلودہ نہ ہونے دونگا مگر اس کو "قبول عام" کا شرف دینے کے لئے ان تمام دلچسپیوں کا خیال رکھا جائیگا جس کا جواز اہل ثقافت اہل علم نے دے رکھا ہے اس میں (۱) مقالات (۲) مترجمات (۳) ادبیات (۴) اخبار علمیہ اور (۵) تنقید و تبصرہ کے مستقل عنوانات ہوا کریں گے جن کی ضمن میں (۱) علوم و فنون کے متعلق ہر قسم کے مضامین ہوں گے۔ (۲) عربی انگریزی اور گجراتی کے اعلیٰ خیالات اُردو میں منتقل کئے جائیں گے (۳) بہترین شاعرانہ خیالات "شعر منثور"، اور مختصر اخلاقی وسبق آموز فسانے۔ اور اخلاقی و نیچرل نظمیں اور تازہ غزلیات ہوا کریں گی (۴) جدید علمی خبریں ہونگی اور حیرت انگیز سائنس کے اختراعات سے آگاہ کیا جائیگا (۵) مطبوعات جدیدہ پر ناقدانہ اور منصفانہ رائے کا اظہار کیا جائیگا۔

ہیچمدان
عبدالرحمٰن خوشتر (منگردلی)
ایڈیٹر رسالہ "زبان"

اعلان

جن حضرات کی خدمت میں رسالہ زبان نمونتاً حاضر ہوا ہے وہ اپنی آئندہ خریداری و عدم خریداری کی اطلاع دفتر زبان میں اگست کی ۱۰ تاریخ تک روانہ فرماویں ورنہ دوسرا نمبر قیمتاً وی۔ پی سے حاضر ہوگا جسکا وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہے۔

(مینیجر)

مقالات

علم اور اسلام

از

پروفیسر موسیو رینان

(مترجمہ مولانا مولوی محمد اسمعیل صاحب "اصلاحی" اعظمگڈہی)

ذیل کا گراںبہا مضمون مع ایک مختصر نوٹ کے ہم کو اپنے کرمفرما دوست جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈہی کی وساطت سے ملاہے جس کو شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہوئے اُمید کرتے ہیں کہ قاضی صاحب موصوف حسب وعدہ بہت جلد اس کی دوسری شق بھی روانہ فرماکر مشکور فرمائینگے۔

(اڈیٹر)

" فرانس کے مشہور فلسفی اور ماہر السنہ سیاطیقی موسیو رینان نے "اسلام اور علم" کے نام سے ایک لکچر پیرس کی سربون یونیورسٹی کے سامنے دیا تھا جس میں اس نے یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی ہے کہ "اسلام اور علم دو متضاد چیزیں ہیں" جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اسکا اُردو میں ترجمہ نہیں ہوا اور نہ اس کا جواب سوائے علامہ جمال الدین افغانی کے کسی نے دیا ہے۔ مصر کے ایک عالم یوسف علی ہندی بے نے رینان کے اس لکچر کا عربی میں ترجمہ کیا ہے جس کے شروع میں رینان کی مختصر سوانح عمری اور آخر میں بعنوان "الحدید یفلح بالحدید" اس کے ہم مذہب، ہمقوم، اور ہموطن موسیو مسمر کے جواب کا بھی ترجمہ کرکے شامل کردیا ہے جو اس نے اصل فرانسیسی میں لکھا ہے۔ میری استدعا پر میرے دوست مولوی محمد اسمٰعیل صاحب نے اس کا ترجمہ کرنا شروع

کیا تھا لیکن ابھی وہ رینان کے سوانح اور لکچر ہی کا ترجمہ کرنے پائے تھے کہ بعض ضروری کاموں کی وجہ سے اپنے وطن تشریف لے گئے - اب میں موسیو مسمر کے جواب کا ترجمہ کر رہا ہوں جو انشاء اللہ آیندہ کسی اشاعت میں ہدیہ ناظرین ہوگا۔

اختر (جوناگڈہی)

پیدایش

۲۷ فروری ۱۸۲۳ء کو شہر ٹریگیر (Treguier) خاندان رینان میں ایک متوسط الحال والدین کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوا - اس بچہ کی عمر ابھی پانچ برس کی بھی نہ ہونے پائی تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھہ گیا اور باپ نے ہنریٹ نامی ایک ۱۷ سترہ سالہ بہن کے سوا کوئی چیز بطور میراث کے نہ چھوڑی۔

ابھی بچہ کا نام ارنسٹ ہے جو آگے چلکر فرانس بلکہ یورپ کے معدودے چند مشاہیر علما میں شمار کیا گیا۔

تعلیم

ارنسٹ کے لئے اکلیروس کے گرجا کے مدارس یتیمی کے علاوہ جو اس کے شہر میں جاری تھے تعلیم کی کوئی صورت نہ تھی چنانچہ پندرہ سال کی عمر میں اس نے ٹریگیر (Treguier) کے تمام خیراتی مدارس کی تعلیم ختم کرلی جس کے بعد وہ کلیۃ القدیس نقولہ میں داخل ہوگیا یہاں رینان کو اشیا ر (کائنات) ان کی ماہیت اور ان کے علل و اسباب پر غور و فکر کرنیکا خیال پیدا ہوا اور اس نے کلمات سحر سے اسکی ابتدا کی جس کے ساتھہ ہمارے علما اور فلاسفہ کو قدیم عشق ہے۔

فلسفہ کی تحصیل

۱۸۴۰ء میں مدرسۂ ایسی (Issy) میں داخل ہوا - جہاں اس نے ریڈ اور مالبرانچ کا فلسفہ پڑہنا شروع کیا پھر حکما ر جرمنی مثلاً ہیگل اکانٹ اور ہرڈر کے فلسفہ کی تحصیل کی - اس زمانہ میں وہ اپنی بہن کو ایک خط میں لکھتا ہے کہ :-

" فلسفہ حقایق اشیا پر بحث و تجسس کے لئے انسانی قوتوں کو اُبھارتا ہے لیکن یہ ابھی صرف نصف صدی سے مروج ہے اور میری تمام توجہ علوم ریاضیات پر مرکوز ہے "

لیکن ہمارے اس نوجوان فلسفی نے اپنے شکوک کا حل ریاضیات میں نہیں بلکہ علم اللغات میں پایا - اسلئے وہ سان سولپیس کالج میں داخل ہوگیا - جو علم الالسنہ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے مشہور ہے وہاں وہ ملل قدیمہ کی زبان یعنی عبرانی کی تحصیل میں مصروف ہوگیا اب رینان پوری ذہانت کے ساتھہ مذہبی کتب کی حقیقت اور ان کے اصول

پر غور و فکر کرنے لگا اور اس میں اسے علوم الیقینات یعنی منطق اور ریاضیات سے بڑی مدد ملی اس نے دیکھا کہ سفر نامہ اشعیار ([illegible]) کا دوسرا حصہ نہ صرف اسلوب بیان اور زبان کے لحاظ سے بلکہ تاریخی حیثیت سے بھی مختلف ہے اور سفر دانیال تو محض ایک قصہ گو کی حیثیت رکھتا ہے جو قدیم اور موضوع ہے۔

رینان کے نزدیک آسمانی کتب کا معیار صداقت یہ ہے کہ "کسی آسمانی اور الہامی کتاب میں اگر ایک غلطی بھی تسلیم کرلی جائے تو اس کے پورے حصہ پر فاسد کا حکم لگایا جائیگا"

مذہب اور فلسفہ کا موازنہ

فلسفہ کی تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد سان سولپیس کالج میں رینان ہمیشہ مذہب اور فلسفہ پر بحث کیا کرتا اور دونوں کا آپس میں موازنہ بھی کرتا تھا اور اسی زمانہ میں اس نے ابوالعلا معری فلسفی کے اس خیال کی تردید کی کہ :-

کَمْ اُمَّۃٍ لَعِبَتْ بِھَا جُھَّالُھَا
کتنی امتیں (مذاہب) تھیں کہ انکے جاہل (امتوں) نے ان کو بازیچہ بنایا

فَتَنَطَّسَتْ مِنْ قَبْلُ فِی تَعْذِیْبِھَا
اور پہلے ہی سے ان کے عذاب کی جستجو میں پڑ گئے

اَلْخَوْفُ یُلْجِئُھَا اِلیٰ تَصْدِیْقِھَا
خوف ان (مذاہب) کی تصدیق پر مجبور کرتا ہے

وَالْعَقْلُ یَحْمِلُھَا عَلیٰ تَکْذِیْبِھَا
اور عقل ان کی تکذیب پر آمادہ کرتی ہے

وَجِبِلَّۃُ النَّاسِ الْفَسَادُ فَظَلَّ مَنْ
انسانوں کی سرشت ہی میں فساد ہے پس وہ شخص محفوظ ہے جو

یَسْمُو بِحِکْمَتِہٖ اِلیٰ تَھْذِیْبِھَا
اپنی عقلمندی سے (فطرت انسانی) کی تہذیب کی طرف متوجہ ہوا

جب اس کے خیالات کی اشاعت ہونے لگی تو اسے اکلیروس (گرجا) والوں کے ہاتھوں مطمئن ہوکر مسائل پر بحث کرنے کا موقع نہ ملتا تھا اس لئے وہ سان سولپیس کالج کو خیرباد کہہ کر استافنس کالج میں آگیا۔ جہاں اسے آزادی اور اطمینان کے ساتھ اپنے خیالات اشاعت کی امید تھی اس لئے کہ یہ مدرسہ اکلیرکیہ یعنی گرجا کا نہ تھا لیکن چونکہ یہ کالج سلسلۂ مدارس اکلیروس کی آخری کڑی تھا اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے اظہار خیالات میں اکلیروس کا بڑی حد تک پابند ہے لہذا یہاں بھی اسے پوری مسرت نصیب نہ ہوئی اس لئے وہ مذہبی زندگی

سے بالکل کنارہ کش ہوکر موسیو کروزیہ مدرسہ شبینہ (Night School) میں صدر مدرس کے عہدہ پر معمور ہوگیا اور دن کا پورا وقت السنہ سامیہ وغیرہ کی تحصیل میں صرف کیا کرتا۔

اجراجیہ فی الفلسفہ کی ڈگری حاصل کرنا

سنہ ۱۸۲۷ء میں اس نے پیرس اکاڈمی سے سند فضیلت حاصل کی اور اسے اپنی تالیف "تاریخ مقارنۃ اللغات اسامیہ" کے صلہ میں اجراجیہ فی الفلسفہ کی ڈگری ملی اور سنہ ۱۸۴۹ء میں فرانسیسی گورمنٹ نے اسے اٹلی کی ایک علمی مہم پر بھیجا۔ خدمت مفوضہ کی تکمیل کے بعد رینان واپس آکر پیرس کی پبلک لائبریری میں ملازم ہوگیا اور اپنی بہن ہنریٹ کے ساتھ رہنے سہنے لگا۔ پروفیسر رینان اکثر مسائل پر غور وفکر کیا کرتا اور "رسالۂ العالمین" (Revue des deux mondes) اور اخبار الدنیا (Debats) میں اپنے مسلسل مضامین مذہبی تاریخی اور اخلاقی شائع کراتا رہا۔ سنہ ۱۸۵۲ء میں اس نے اپنی کتاب ابن رشد اور اس کا فلسفہ شائع کی جس کے صلہ میں اسے ڈاکٹری کی ڈگری ملی اور یورپ میں اسکی شہرت کو چار چاند لگ گئے اسی وقت سے رینان کا شمار فرانس کے اکابر فلاسفہ میں ہونے لگا۔ سنہ ۱۸۵۷ء میں ماہر علوم السنہ قواطرمیر (Quatremere) کا انتقال ہوا تو السنہ سامیہ کی پروفیسری کا عہدہ خالی ہوا اس زمانہ میں فرانس بھر میں رینان کے سوا ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو اس عہدہ کا اہل سمجھا جاتا مگر فرانس کا کیتھولک فرقہ رینان جیسے ملحد شخص کا ایک ایسے مذہبی عہدہ پر تقرر کسی طرح منظور نہیں کرسکتا تھا اور نہ کیا لیکن امیراطور فرانس رینان کے رسالے اور مضامین پڑھکر اس کی بے نظیر قابلیت سے واقف ہوگئے اور اسے فلسطین کی مہم آثار قدیمہ پر بھیجنا چاہا۔ رینان نے بھی اس کو قبول کرلیا اور اپنی بہن ہنریٹ کو ساتھ لیکر روانہ ہوگیا یہ واقعہ سنہ ۱۸۶۰ء کے موسم گرما کا ہے۔ ۲۴ ستمبر سنہ ۱۸۶۱ء کو مقام ایشط میں اس کی بہن کا انتقال ہوگیا۔ مس ہنریٹ کی موت نے رینان سے ایک قوی الارادہ۔ نرم دل اور شفیق بہن چھین لی جو اس کے تمام اعمال زندگی میں بہترین معاون اور اسکی مربی تھی۔ بہن کی مفارقت نے اسے اسقدر نڈھال اور حواس باختہ کردیا کہ رینان اس کا مرثیہ بھی نہ لکھہ سکا اور جہاز پر سوار ہوکر وطن روانہ ہوگیا۔ جہاز میں اس کی حالت نہایت خراب تھی اکثر شدت تکلیف سے غشی اور بدحواسی طاری رہتی تھی۔ اگر سمندر کی فرحت زا ہوا اس کے قویٰ کو بحال اور تازہ کرکے کسیقدر اس کا غم غلط نہ کردیتی تو قریب تھا کہ وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دہو بیٹھتا۔ فرانس پہنچنے پر وزیر تعلیمات نے فرنچ کالج میں السنہ سامیہ کی پروفیسری کے عہدہ پر اسے فائز کردیا۔

السنہ سامیہ کی پروفیسری

رینان نے جو اپنا پہلا لکچر دیا اس میں اس نے تصریح کی کہ (حضرت) مسیح علیہ السلام خدا نہیں (ہیں) بلکہ وہ صرف ایک بےمثل انسان تھے اس زلزلہ خیز آواز نے کیتھولک گرجاؤں میں تہلکہ ڈال دیا اور انہوں نے رائے عامہ (پبلک) کو اس کے خلاف اُبھارا اور اس طرح ثابت کر دیا کہ رینان کے لکچروں سے امن عامہ میں خلل پڑنے کا اندیشہ ہے چنانچہ اس کی زبان بندی کا حکم نافذ ہو گیا اور اس کے لکچر موقوف ہو گئے۔

۲ جون ۱۸۶۴ء کو پروفیسر رینان نے پیرس کے اخبارات میں پڑھا کہ اسی السنہ سامیہ کے عہدۂ پروفیسری سے پیرس پبلک لائبریری کی سکرٹیری شپ کے عہدہ پر منتقل کر دیا گیا ہے۔

پروفیسر مذکور نے اس جدید عہدہ کو قبول نہ کیا اور اس کے بعد سے بطور ایک مصنف کے صرف اپنے قلم کو ذریعۂ معاش بنا کر آزادانہ زندگی بسر کرنے لگا۔ فرانس کی علمی مجالس (سوسائیٹیوں) نے رینان کے فضل و کمال کا اعتراف کیا اور ۱۸۷۹ء میں "المجمع العلمی الفرانساوی" نے اسے اپنا رکن منتخب کیا اور ساتھ ہی فرانس کالج کا نگراں بھی مقرر کیا اور اس کے علم و فضل کے اعتراف میں اسے ایک تمغہ دیا اور اس نے اپنی بقیہ عمر ایک ممتاز اور بلند پایہ محسن علم کی حیثیت سے بسر کی جو غربا اور مساکین اور حاجتمندوں کے ساتھ نہایت ہمدردی اور رحمدلی کے ساتھ پیش آتا تھا۔ جب اس کا انتقال ہو رہا تھا تو اس نے نہایت اطمینان اور فارغ البالی کے ساتھ کہا کہ:-

> اس وقت میں اپنا فرض پورے طور پر ادا کر چکا ہوں اس لئے میری یہ موت مبارک اور مسعود موت ہے جبکہ یہ بالکل بدیہی حقیقت ہے کہ دنیا میں کسی چیز کو موت سے مفر نہیں ہے۔

(باقی دارد)

تبادلہ

جن معاصرین کرام کی خدمت میں زبان بطور تبادلہ حاضر ہوا ہے وہ براہ کرم اپنا اپنا رسالہ تبادلہ میں روانہ فرما کر مشکور فرمائیں۔

(مینجر)

فن تعلیم

(از جناب محمد اسمٰعیل صاحب ابراہانی۔ بی اے۔ جوناگڑہی)

"ذیل کا فلسفیانہ مضمون اگرچہ کاٹھیاواڑ کی ایجوکیشنل کانفرنس کی ایک اُردو تقریر کا ملخص ہے لیکن ہم اس کے ذریعہ مقرر کو کاٹھیاواڑ کے ایک جدید انشا پرداز کی حیثیت سے علمی دنیا میں روشناس کرانے کا فخر حاصل کرتے ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ صاحب مضمون ہمارے اس فخریہ دعوے کا ثبوت گاہ گاہ اپنی جنبش قلم سے دیتے رہیں گے۔"

اڈیٹر

جاننا چاہیے کہ نفس انسان تین حالتوں میں عمل کرتا ہے۔ انسان کو یا تو کسی چیز کا مطلق علم حاصل ہو سکتا ہے یا خوشگوار یا ناگوار اثر سے رنج و راحت کا احساس ہوتا ہے یا وہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے پس نفس انسان میں وہ جوہر یا قوت ہے جو معلوم کرتی، محسوس کرتی یا ارادہ کرتی ہے ان تین قوتوں کو تعلّم، احساس اور ارادت کہتے ہیں۔ تعلّم سے نفس کو کسی چیز کا ادراک حاصل ہوتا ہے قوتِ احساس وہ قوت ہے جس کے ذریعہ سے رنج و راحت اور کسی قسم کی اور کیفیات نفس پر طاری ہوتی ہیں۔ قوت ارادہ۔ اس قوت سے کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ہمارے ارادہ میں تحریک ہوتی ہے۔

یہ تینوں حالتیں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ملی جلی ہوئی رہتی ہیں۔ چھوٹے بچوں میں قوت ارادت کم اور قوت احساس زیادہ ہوتی ہے۔ اس لئے زیادہ تر بچوں کے احساس کو تحریک دیکر تعلیم کی طرف راغب کرنا چاہیئے اس کے مختلف طریقے ہیں۔

مذکورہ بالا تینوں قوتوں کو تربیتِ نفس کہتے ہیں۔ اُن میں سے قوتِ تعلّم کا تعلق عقلی تعلیم کے ساتھ اور احساس و ارادت کا تعلق اخلاقی تعلیم کے ساتھ ہے۔

قوت تعلّم چار بڑی قوتوں پر مشتمل ہے۔

(۱) **قوتِ** مدرکہ۔

(۲) **قوت حافظہ**
(۳) **قوت متخیلہ**
(۴) **قوت عقل یا فیصلہ**

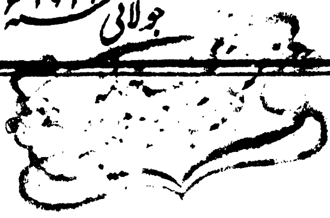
(۱) **قوت مدرکہ** وہ قوت ہے جس میں حواس کے ذریعہ سے باہر کی چیزوں کا علم حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ حواس پانچ ہیں۔ (۱) **باصرہ** (۲) **شامہ** (۳) **ذائقہ** (۴) **سامعہ** (۵) **لامسہ**۔ یہ پانچ علم کے دروازے ہیں اور ان کو تربیت دینے کے مختلف طریقے ہیں۔

قوت باصرہ اور **لامسہ** نہایت ہی ضروری قوتیں ہیں۔ ان کی ترقی کے لئے بچوں کو الگ الگ قسم کے رنگ دکھا کر ان میں تمیز کرانی چاہئے اور مختلف چیزوں کا مشاہدہ کرا کے ان کی خاصیتوں کو معلوم کرانا چاہئے۔ مثلاً کسی چیز کا قد اس کی شکل، رنگ حرکت وغیرہ۔ جاننا چاہئے کہ **کنڈر گارٹن** اور **اسباق الاشیاء** جو بچوں کی تعلیم میں داخل ہیں ان سے دوسری قوتوں کے علاوہ بچوں کی **قوت مشاہدہ** اور **قوت لامسہ** کی ترقی مقصود ہے۔

(۲) **قوت حافظہ** وہ قوت ہے جو حاصل کئے ہوئے علم کو ذہن میں محفوظ رکھتی ہے اور ضرورت کے وقت اسکو پیش کرتی ہے۔ یہ قوت نہایت ہی ضروری ہے۔ حافظہ کے بغیر ہم کسی علم میں ترقی نہیں کر سکتے۔ ہمارے ہاں کے مدرس بہت سی باتیں طوطے کی طرح بچہ کو رٹا دیتے ہیں جس سے اکثر مرتبہ بچہ کا دماغ بہت کمزور ہو جاتا ہے البتہ بچہ کا حافظہ بہت تیز ہوتا ہے اور اس سے فائدہ اٹھا کر بہت سی باتیں لفظ بہ لفظ ہی یاد کرانی چاہئیں مثلاً حساب کے پہاڑے قواعد کی تعریفیں اخلاقی نصیحتیں وغیرہ۔ مگر یاد رکھنا چاہئے کہ جہاں جہاں ممکن ہو بچہ کو یہ باتیں سمجھا دینی چاہئیں اور جہاں ممکن نہ ہو وہاں ان کو یہ کہدینا کافی ہے کہ "تم بڑے ہو گے تب اس بات کو سمجھ لو گے" تاکہ بچہ کے دل پر یہ نقش جما رہے کہ یہ بات میں نے فضول نہیں سیکھی یہ کام کی چیز ہے جس کی حقیقت مجھے آئندہ معلوم ہو گی۔

حافظہ کی ترقی کے لئے مضمون بلحاظ ترتیب اور سلسلہ وار بیان کرنا چاہئے۔ بار بار سوالات کے ذریعہ سے تمام باتیں دوہرا دوہرا کر بچوں کے ذہن نشین کرانی چاہئیں اور ان میں **توجہ قایم** رکھنے کی عادت ڈالنی چاہئے اور اس کے لئے مدرسین کا طریقہ تعلیم دلچسپ اور برتاؤ ہمدردی والا ہونا چاہئے۔

(۳) **قوت متخیلہ** اس قوت کے ذریعہ سے نفس گذشتہ خیالات میں کمی بیشی کر کے اسی قسم کی یا بالکل



نئی صورتیں اپنے ذہن میں پیدا کرلیتا ہے۔ تخیل کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) تخیل ترکیبی۔

(۲) تخیل اختراعی۔

تخیل ترکیبی وہ ہے جس کے ذریعہ سے جو چیزیں ہمنے دیکھی ہیں ان کا حافظہ کے ذریعہ سے تصور کرنا یا متعدد دیکھی ہوئی چیزوں پرسے ایسی صورتیں بنانا جن کا واقعی طور پر وجود بھی ہو۔ مثال کے طور پر ہمنے پہاڑ بھی دیکھا ہے اور آگ بھی دیکھی ہے لیکن ایسا پہاڑ نہیں دیکھا جس میں سے آگ نکلتی ہو جسکو **کوہ آتش فشاں** یا جوالاُمکھی کہتے ہیں۔ اب ہم پہاڑ اور آگ کو ساتھہ ملا کر ایک جلتے ہوئے پہاڑ کا تصور **تخیل ترکیبی** کی مدد سے کر سکتے ہیں۔

تخیل اختراعی سے ہم کو سروکار نہیں ہے کیونکہ یہ شاعروں یا افسانہ نگاروں کے کام کی چیز ہے۔

بچوں کی قوتِ تخیل کا روز ان کے کھلونوں میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ گڑیا کو جاندار سمجھکر وہ اس کو کھلاتے ہیں، پلاتے ہیں اور محبت کرتے ہیں اور تخیل کے زور سے طرح طرح کے لطف حاصل کرتے ہیں۔ لکڑی کا گھوڑا بناتے ہیں اور بڑے شہسوار بن کر اس کو دوڑاتے ہیں گھاس کھلاتے ہیں پانی پلاتے ہیں ان کو ان باتوں سے بڑی فرحت حاصل ہوتی ہے۔ اکثر والدین خود بھی کبھی بچے تھے اور ایسے کھیل کیا کرتے تھے ان کو فراموش کرکے وہ بچوں کی ان حرکتوں کو فضول اور لغو سمجھتے اور ان پر خفا ہوتے ہیں۔ اس سے بچوّں کو بڑا صدمہ پہُنچتا ہے۔ اور ان کا تخیل خراب ہوتا ہے اس لئے اُن کو کھیلنے دینا چاہئے اور طرح طرح کے کھلونے دلوانے چاہئیں یہ فضول خرچی نہ ہوگی۔ البتہ بچوّں کے اکثر کھلونوں کی نگرانی کرنا ضروری ہے۔

(۴) **قوت عقل یا فیصلہ** اسی قوت کی بدولت ہم کو دوسرے حیوانات پر شرف حاصل ہے۔ اس قوت کے ذریعہ سے ہم کسی دو خیالوں کا مقابلہ کرکے ان کی نسبت اپنی رائے قایم کرسکتے ہیں اور نتیجے نکال سکتے ہیں اس میں دو قوتیں شامل ہیں۔

(۱) **قوت اوّل** خیالات کا مقابلہ کرکے حکم لگانا جس کو **قوت فیصلہ** کہتے ہیں۔

(۲) **قوت دوم۔ استدلال**۔ اِس کے ذریعہ سے دو حکموں پر سے ہم ایک نتیجہ نکال سکتے ہیں۔ یہ عقل کی اعلیٰ قسم ہے اور اس کی تربیت بہت دیر سے ہوتی ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ میں اس مختصر مضمون میں اُن تمام باتوں کو مثالوں کے ساتھہ بوضاحت بیان

نہیں کرسکتا کیونکہ طوالت کا خوف مانع آتا ہے اور اس کے لئے میرے پاس کافی وقت بھی نہیں ہے۔ لہذا ان باتوں کی نسبت جو مدرسین زیادہ جاننا چاہتے ہیں ان کو اس فن کی کتابیں پڑھنا چاہیئے۔

المختصر **قوتِ تعلم** کے ماتحت چار قوتیں جو ہمنے بیان کی ہیں ان کا تعلق **عقلی تربیت** کے ساتھہ ساتھہ ہے اور **تاثر** اور **ارادت** کا تعلق **اخلاقی تعلیم** کے ساتھہ ہے۔ مدرسین کے لئے ان **قویٰ** کی تربیت کے اصولوں سے واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔

نوائے دلگیر

(مولانا سید نظام الدین شاہ صاحب دلگیر اکبرآبادی)

مرگئے ہم گل چراغ داغ ہجراں ہوگیا
صبح سے پہلے ہی جل بجھنے کا ساماں ہوگیا

اے بہ حسرت دیکھنے والی دلِ برباد کی!
کچھ خبر ہے کب یہ اُجڑا کب یہ ویراں ہوگیا

اُف رے بیدردی، مرے زخموں کی حسرت دیکھکر
مسکرا کر بولی "اب خالی نمک داں ہوگیا"

تیرے پیکاں کی بدل دیں جذب دل نے خواہشیں
میرا دشمن بن کے آیا میرا مہماں ہوگیا

بن گیا وجہ ندامت تیرا خونِ بے کسی!
مرنے والے! خنجر قاتل پشیماں ہوگیا

بڑھ گئی غربت میں ناکامی سے ہمت اور بھی
بے سروسامانیوں میں خوب ساماں ہوگیا

اب نہ وہ نالہ نہ وہ شیون نہ وہ فریاد ہے
کیا اسیر غم ترا مانوسِ زنداں ہوگیا

دیکھہ لی نازک کلائی کرچکیں بس آپ قتل
آپنے احساں کیا اور مجھ پہ احساں ہوگیا

آنیوالی! تو خدا بستہ ہی آتی شام وصل
تیری بے رنگی سے پھیکا رنگِ احساں ہوگیا

آپ کی زلفوں کو دیکھا میں نے سجادہ بدوش
آج سچا یہ مرا خواب پریشاں ہوگیا

میری چشم شوق میں سکتہ کا عالم دیکھہ کر
اُن کی محفل کا ہر اک آئینہ حیراں ہوگیا

خامۂ قدرت نے لکھی جب کتاب زندگی
درد میرے صفحۂ ہستی کا عنواں ہوگیا

مدتوں دلگیر اُس دل پر مجھے آیا ہے رشک
جو کسی کی یاد میں دم بھر پریشاں ہوگیا

مترجمات

سلطان محمود (سنہ ۸۶۳ھ تا سنہ ۹۱۷ھ) (۱۴۵۹ء تا ۱۵۱۱ء) کی وجہ تسمیہ بیگڑھ

مراۃ سکندری کے مصنف نے سلطان محمود کے لقب بیگڑھ سے ملقب ہونے کی دو وجہیں بیان کی ہیں :-

(۱) سلطان نے جوناگڈھ اور چانپانیر کے دونوں قلعے فتح کئے تھے اس لئے اس کو "بے گڑھ"، (دو قلعوں والا) کہا گیا۔

(۲) گجرات میں بیگڑھ اس بیل کو کہتے ہیں جس کے سینگ کسی ہم آغوش ہونے والے آدمی کے کھلے ہوئے ہاتھوں سے مشابہ ہوتے ہیں، اور چونکہ محمود کی مونچھیں بھی اسی طرح کی تھیں اس لئے اسکو بیگڑھ کہا گیا۔

مصنف مذکور نے ان وجوہات کا ذکر کرتے ہوئے کوئی فیصلہ کن رائے نہیں ظاہر کی، اس نے صرف "واللہ اعلم بالصواب"، پر اپنے قول کو ختم کر دیا ہے۔ یہاں ہم بعض دلائل اس بات کے ثبوت میں پیش کرنا چاہتے ہیں کہ آخری وجہ دراصل صحیح ہے، اور کہ وہ لفظ گجراتی ( ) ہے جس کے معنی اوپر کو اٹھے ہوئے سینگوں والے بیل کے ہیں۔ پہلی وجہ تسمیہ باوجود عام طور پر تسلیم کئے جانے کے ناقابل توجہ ہے۔

۱- بولوگنا (Bologna) کا یورپین سیاح وارتھما (Varthema) جو سنہ ۱۵۰۶ء میں سلطان محمود کے عہد حکومت میں گجرات میں آیا تھا، لکھتا ہے :-

سلطان کی مونچھیں اس قدر لمبی ہیں کہ وہ ان کو لے کر اپنے سر پر اس طرح

باندھ لیتا ہے جس طرح ایک عورت اپنا جوڑا باندھتی ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان کی لمبی اور گھنی مونچھوں نے اس کی رعایا کو متعجب کر دیا، اور انھوں نے اپنے ہاں کے بیلوں کے سینگوں کی تشبیہ میں اس کو ویگڑو (वेगडो) یا بیگڑہ کے نام سے مشہور کر دیا۔ جیسے اہل جرمنی نے "قیصری مونچھوں" کو۔

۲۔ شہنشاہ جہانگیر ۱۰۱۶ھ-۱۶۱۷ء میں۔ یعنی مرآۃ سکندری کی تصنیف سے صرف ۱۰ سال قبل۔ احمد آباد میں تھا۔ وہ اپنی توزک میں سرکھیج شریف اور سلطان محمود بیگڑہ کے مزار پر جانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"بیگڑہ اہل گجرات کی زبان میں چڑھی ہوئی مونچھوں والے کو کہتے ہیں اور چونکہ سلطان محمود کی بھی اسی طرح کی مونچھیں تھیں لہٰذا لوگ اس کو بھی بیگڑہ کہتے ہیں"۔ ۵۱

یہاں اگرچہ جہانگیر نے اصل لفظ گجراتی (वेगडो) کا ذکر نہیں کیا جس سے لفظ "بیگرہ" بنا ہے تاہم یہ ظاہر ہے کہ ۱۶۱۷ء ایسے قریب العہد زمانہ میں لکھتے ہوئے جہانگیر اس دو قلعوں والے نظریہ سے قطعاً ناآشنا تھا کیونکہ اس نے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

۳۔ جو لوگ گجراتی زبان سے واقف ہیں وہ فوراً سمجھ جائیں گے کہ پہلی وجہ تسمیہ میں دو قلعوں کی فتح کا جو نظریہ قائم کر لیا گیا ہے وہ کسقدر کمزور اور ضعیف ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ لقب اصل گجراتی زبان کے لحاظ سے (बेगडो) (بے گڑھو) ہوتا نہ بیگڑہ۔

گجراتی لٹریچر میں کہیں بھی پہلے معنوں میں بیگڑہ کا استعمال نہیں پایا جاتا۔

لفظ (वेगडो) گجراتی زبان میں چڑھے ہوئے سینگوں والے بیل کے لئے اب بھی کاٹھیاواڑ کے کاشتکاروں میں مستعمل ہے۔ مسٹر اے۔ کے فاربس راس مالا ۵۲ کے ایک منظوم قصہ میں ایک بھیل کا ذکر کرتے ہیں جس کا نام "ویگڑو" تھا۔ وہ شعر جس میں اس بھیل کے ذو معنی نام پر مذاق کیا گیا ہے صاف طور پر ظاہر کرتا ہے کہ لفظ "ویگڑو" عام زبان میں انہی معنوں میں مستعمل تھا ۵۳۔ اسی لفظ (वेगडो) کے مقابلہ میں بھیلو (भीलो) بولا جاتا ہے جس کے معنی بغیر سینگ کا بیل" ہیں۔ یہ لفظ بھی

۵۱ توزک جہانگیری

۵۲ دیکھو فصل دوم باب پنجم

۵۳ دیکھو راس مالا (گجراتی اڈیشن) صفحہ ۶۱۳

گجراتی میں ان معنوں میں عام طور پر بولا جاتا ہے[۵]۔

یہاں یہ بتانا غیر ضروری ہے کہ لفظ "ویگڑو" فارسی میں آکر "بیکرہ" ہو گیا ہے۔

(رسالۂ رائل ایشیاٹک سوسائٹی شعبۂ بمبئی)

لفظ "مسیح" کی اصلیت

اصل میں یہ لفظ عبرانی میں "مشیح" سُریانی میں "مشیحو" اور کلدانی میں "مشیحا" ہے جو لفظ "مشح" سے مشتق ہے، اور جس کے معنی "مسح" کے ہیں۔ علامہ احمد فارس الشدیاق اپنی کتاب الجاسوس علی القاموس (صفحہ ۴۹) میں لکھتے ہیں کہ یہودیوں میں یہ دستور تھا کہ جب اُن میں کوئی بادشاہ بنایا جاتا تو احبار یہود اس کے جسم کو تیل مَلا کرتے تھے۔ اس لئے جب کوئی "مسح" کیا جاتا تو وہ اس کو "مسیح الرب" کہتے تھے، جو اُن کے ہاں بادشاہ کا مترادف سمجھا جاتا تھا۔ جب اپنے انقراض مملکت کے بعد یہود مسیح (یعنی بادشاہ) کی آمد کے منتظر ہوتے جو اُن کو اس ذلت اور تباہی سے نجات دے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام مبعوث برسالت ہوئے اور ان سے معجزات ظاہر ہوئے تو وہ ان پر ایمان لائے اور ان کو "مسیح ناجی" ماننے لگے۔ مگر انھوں نے جب آپ کو تارک الدنیا اور اُن کے فرشتوں کا ارضی نہیں بلکہ سماوی ہونا معلوم کیا تو کہنے لگے کہ آپ کا "مسح" الٰہی اور روحانی ہے مگر اس قول سے اُن لوگوں کی تشفی نہ ہوئی جو مجازی نہیں بلکہ حقیقی "دنیوی مسیح" کے منتظر تھے۔ چنانچہ اب تک یہود کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام دراصل مسیح نہ تھے۔ بادشاہ یا حاکم کو تیل ملنے کا رواج آج بھی حبش میں پایا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ لوگ اس بات کے مدعی ہیں کہ ان کے سلاطین سلیمان علیہ السلام کی اولاد سے ہیں۔ اب تک توراۃ کی بعض سُنتوں مثلاً ختنہ، اباحت تسری وغیرہ پر ان کا عملدرآمد ہے۔

(الزہراء)

---

[۵] راس مالا صفحہ ۲۲۶۔

جرمنی کی تعلیمی حالت

ولایت آدرنہ کے سابق محقق تعلیمات (مفتش المعارف) اور ترکی مدرسۃ المعلمین کے پروفیسر کمال بک جو گذشتہ ماہ میں جرمنی کی تعلیمی حالت کے معائنہ کے لئے بھیجے گئے تھے وہاں کی تعلیمی ترقیوں کی نسبت اطلاع دیتے ہیں :-

"آجکل باشندگان جرمن کی تعداد چھ کرور تیس لاکھ ہے جن میں فیصدی ۹۸½ لکھے پڑھے لوگ پائے جاتے ہیں گویا فی ہزار مرد اور عورتوں میں صرف پندرہ اشخاص ایسے ہیں جو نوشت و خواند کی نعمت سے محروم ہیں۔

جرمن بچہ چھ برس کی عمر میں مدرسہ اولیہ (پرائمری اسکول) میں داخل کر دیا جاتا ہے اگر اس کے والدین اتنی استطاعت رکھتے ہیں کہ اس کو کالج کی اعلیٰ تعلیم دلا سکیں تو صرف مدرسہ اولیہ میں چار سال تک اس کو رہنا پڑتا ہے جہاں سے وہ سند حاصل کر کے مدرسہ ثانویہ میں داخل ہو سکتا ہے اور اگر بچوں کے والدین صرف ابتدائی تعلیم دلانا چاہتے ہیں تو اس کو مدرسہ اولیہ میں آٹھ سال تک تعلیم دی جاتی ہے جس کے بعد وہ منتہی ہو کر نکلتا ہے اس وقت اس کی عمر ۱۴ برس کی ہوتی ہے اب اس کو اختیار ہے کہ وہ اُن مدارس میں داخل ہو جو مدارس ([illegible]) یا (بیروت) کہلاتے ہیں یہاں چار سال کے بعد وہ سند پا کر نکلتا ہے اُس وقت اُس کی عمر ۱۸ سال کی ہو جاتی ہے اس حالت میں وہ فینانس Finance کے کسی شعبہ میں ملازم ہو جاتا ہے یا کسی تاجر کے دفتر میں کلرک ہوتا ہے یا اپنی حالت کے مطابق کوئی مستقل کام شروع کر دیتا ہے۔

سنہ ۱۹۲۴ء سے سنہ ۱۹۲۵ء تک جرمنی میں سرکاری مدارس کی تعداد ۵۲۷۷۹ تھی جس میں ۱۴۷۰۵۲ مدرسین ۴۹ ہزار استانیاں اور طلبہ ۸۸۹۸۳۲۰ (ذکور و اناث) ہیں معلمین کے لئے جو ۱۱ (غیر سرکاری) مدارس قایم ہیں اُن کی تعداد ۲۸۰ ہے جن میں ۸۵۸۰۰ طلبہ (ذکور و اناث) ان کے علاوہ اور قسم کے مدارس بھی ہاں ہیں جو اندھوں، بہروں اور گونگوں کے لئے بنائے گئے ہیں جن کی تعداد ۱۷۹ ہے اور اُنمیں ۱۲۵۰۰ طلبہ

(ذکور واناث) تعلیم پاتے ہیں۔

جرمنی میں مدارس ثانویہ تین قسم کے ہیں:۔

قسم اول۔ ریئال جمنیاز۔

قسم دوم۔ جمنیاز۔

قسم سوم۔ اپر ریئال شولہ

یہ مدارس اُن اعلیٰ مدارس سے مختلف اور جداگانہ ہیں جن میں طلبہ بعد کو داخل ہوتے ہیں۔ اب اگر کوئی طالب علم ہندسہ کے مدرسہ میں داخل ہونا چاہتا ہے تو اُس کو اپر ریئال شولہ میں داخل ہونا پڑتا ہے کہ وہاں بہ نسبت اور علوم کے ریاضیات اور طبعیات کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا جاتا ہے یہاں اجنبی زبانوں میں فرانسیسی اور انگریزی سکھائی جاتی ہے لاطینی زبان کے لئے اس میں کوئی انتظام نہیں ہے اگر کوئی طالب مکمل تعلیم کے بعد ادبیات عقلیات اور الٰہیات میں مشغول ہونا چاہے تو اُسے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد مدرسہ جمنیاز میں داخل ہونا پڑتا ہے جہاں ریاضیات اور طبعیات کی طرف بہت کم توجہ کیجاتی ہے غیر زبانوں میں سے صرف فرانسیسی زبان سکھائی جاتی ہے اور خاص طور پر لاطینی اور قدیم یونانی زبانوں کے سیکھنے کا انتظام بھی ہے مدارس ثانویہ کی مدت تعلیم ۹ سال ہے۔

جرمنی کی تعلیمی وسعت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ وہاں ۱۵ ۵ قسم جمنیاز کے مدارس ہیں جنہیں ۲۰۶۰۰ مدارس اور ۲۱۳۷۵ اطلبہ (ذکور واناث) ہیں ۳۲۱ مدارس ریئال جمنیاز کے ہیں جن میں ۷۰۱۰ مدارس ہیں اور ۹۴۹ ۴۹ اطلبہ (ذکور واناث) ہیں اپر ریئال شولہ نامی مدارس کی تعداد ۵۰۰ ہیں جن میں ۹۸۳۰ مدرسین اور ایک لاکھ چوراسی ہزار آٹھ سو ستائیس طلبہ (ذکور واناث) ہیں۔

یہ نظام تعلیم سنہ ۱۹۱۶ء سے مدارس اولیہ وثانیہ میں بھی قائم ہے جسپر شخصی حکومت کے زمانے سے لیکر موجودہ عہد جمہوری تک انقلابات کا کوئی اثر نہیں پڑا ہے۔

کمال بک موصوف کی جرمنی کے ایک نامور فاضل جون دوتی سے ملاقات ہوئی تو اس نے ترکی کو نصیحت کرتے ہوئے دوران گفتگو میں کہا:۔

"جرمنی لوگ جب اپنے نظامات میں کوئی تبدیلی کرنا چاہتے ہیں (خواہ وہ کیسی ہی معمولی کیوں نہ ہو) تو اسپر عرصہ دراز تک غور و خوض کرتے رہتے ہیں اور اپنے

صیغۂ تعلیمات میں پورے تدبّر اور مطالعہ طویل کے بعد کوئی ترمیم کرتے ہیں۔"

تعلیم قانونی سے ان کی غرض و غایت یہ ہے کہ ایک ایسی نیک اخلاق جماعت پیدا ہو جو تمدنی، شخصی اور علمی حیثیت سے صاحب عقل و تدبیر ہو اس کو اپنے قوم و وطن کے ساتھ انس و محبت ہو اور دیگر اقوام کے ساتھ مصالحت کی روح اسمیں پیدا ہو۔

یہ آخری شق موجودہ عہد جمہوری کی پیداوار ہے۔

مذہبی تعلیم جرمنی میں جبری اور لازمی ہے الّا یہ کہ یہ کہ طلبہ کے والدین اس سے اتفاق نہ کریں جرمنی میں ایک تعلیمی بورڈ قایم ہے جو جرمن کے تمام مدارس کا انتظام کرتا ہے اس کے ممبروں میں سربرآوردہ اساتذہ اور طلبہ کے نگراں اشخاص شامل ہیں اس مجلس انتظامیہ کی قرارداد کے مطابق تمام مدارس میں عمل درآمد ہوتا ہے۔

مدارس ابتدائیہ و ثانویہ میں سے امتحانات کا نظام بالکل موقوف کردیا گیا ہے البتہ یہ اعلیٰ مدارس میں قایم ہے وہ بھی صرف اس حد تک کہ ان میں اساتذہ جو لکچر تیار کرتے ہیں انہیں میں امتحان لیا جاتا ہے جو عشرہ میں ایک مرتبہ تحریری صورت میں ہوا کرتا ہے سال کے آخر میں ان نتائج کا اوسط نکال کر اس پر طلبہ کے کلاسوں کی ترتیب رکھی جاتی ہے۔

فی الحال جرمنی میں ۲۳ یونیورسٹیاں ہیں جن کے اساتذہ کی تعداد ۴۵۶۴ ہے ان میں ۸۵۱۷ طلبہ اور ۱۸۴۴ طالبات ہیں ان کے علاوہ ۱۲۱۶۵ ایسے طلبہ اور ۳۳۸۰ طالبات ہیں جو صرف ان یونیورسٹی کے لکچروں میں شریک ہوتے ہیں علاوہ بریں جرمنی میں حسب ذیل مدارس قائم ہیں۔

۶ مدارس تجارت کے - ۱۱ مدارس صنعت و حرفت کے ۱۱ مدارس موسیقی کے ۱۶ مدارس فنون لطیفہ کے ۴ مدارس زراعتی ۳ مدارس جنگلات کے اور ۳ مدارس معدنیات کے ہیں۔

(الزہرا)

نظام تعلیم کی تجدید

مسٹر ایس - وی رامامورتی ایم - اے، آئی - سی، ایس نے اپریل کے رسالۂ ینگ مین آف انڈیا

میں عنوانان مندرجہ بالا پر ایک فاضلانہ مقالہ سپردقلم کیا ہے جس میں وہ ہمکو بتاتے ہیں کہ ہندوستانمیں قلیل التعداد آدمیوں کی تعلیم کے اخراجات کا بار کثیر التعداد غیر تعلیمیافتہ اشخاص کے سر پڑ الاجارہا ہے۔ مؤخر الذکر دیہات کے رہنے والے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو زیادہ تر ٹیکس ادا کرنے والے ہیں۔ وہ ہماری تعلیم کا بار اُٹھاتے ہیں تو اس کے عوض میں انہیں کچھ بھی نفع نہیں ہونچتا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ

"آپ اپنی یونیورسٹیوں کو بند کردیجئے پھر بھی آپ، دیہاتی زندگی کو اُن سے غیر متاثر پائیں گے وہ کتابیں جو یہ دیہاتی پڑھتے یا سُنتے ہیں وہ ہماری یونیورسٹیوں اور ان کے پیداکردہ افراد کے دماغوں کی ممنون نہیں ہے، وہ اجتماعی، معاشرتی اور اخلاقی زندگی جو یہ دیہات والے بسر کرتے ہیں ہماری یونیورسٹیوں کی تعلیم وتعلم سے کچھ بھی اثر پذیر نہیں ہوتی۔ پس اگر کسی ملک کی اعلیٰ تعلیم ایک قومی معاملہ ہے جس کا معاوضہ غریب دیہات والے ادا کررہے ہیں تو یہ کتنی بڑی غلطی ہے کہ ان سے ایک ایسے کام کا معاوضہ لیا جارہا ہے جن سے ان کو کوئی فائدہ نہیں ہونچتا۔

مضمون نگار موصوف ہماری یونیورسٹیوں کی "پیداوار" سے بھی مطمئن نہیں ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:-

"ہماری یونیورسٹیاں صحیح معنوں میں علم وفن کی تعلیم گاہوں کی بجائے صرف ذہنی "قلی پن" کی درسگاہیں ہیں۔ ہمارے معلمین، ہمارے ڈاکٹر، ہمارے انجنیر اور وکلا ریں سے بہت تھوڑے ایسے ہیں جو صحیح معنوں میں "ماہرفن" کہے جاسکتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نقل تو کرسکتے ہیں مگر خود اپنی طبیعت سے کچھ نہیں پیدا کرسکتے۔ ہمارے گریجویٹوں کی ایک تعداد کثیر گورنمنٹ کی ماتحتی کی ملازمتوں پر مٹی ہوئی ہے۔ ان کی تعداد روزافزوں ہے حالانکہ سرکاری ملازمتوں کے لئے ان کی ضرورت نہیں رہی، یہی وجہ ہے کہ ان کی ایک بڑی تعداد بے روزگار پھررہی ہے۔ پس یہ جو ہم آئے دن گریجوٹوں کی تعداد کو بڑھارہے ہیں تو تضیع مال واوقات نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

"اصل میں ہونا یہ چاہئے کہ جو شخص ماہر فن بننا چاہے اس کو یونیورسٹی کی تعلیم سے روک دیا جائے اور گریجویٹ کو ایک کلرک یا اس کے برابر فایل ہونے سے باز رکھا جائے"

....

ادبیات

شوالہ

(۱)

یوں تو ارض انتف کا ایک ذرہ بھی ایسا نہ تھا جس میں الوہیت والہیت کی آئینہ بندی نہو، اور جس سے اس مشہور تاریخی سرزمین کے قدیمی تقدس کا پتہ نہ چلتا ہو، مگر آذر کا قبیلہ اپنی سامریت اور دیویت کے لئے دور دور مشہور تھا - اس قبیلہ میں دو بُت تھے - ذی روح اور متحرک۔

ایک کا نام زارہ تھا دوسرے کا نام ثمرہ یا ثمرہ - ان کا مندر آذر کا وہ عظیم الشان محل تھا جو انتف کے مندر کے دریا کے کنارے سبزہ زاروں سے گھرا ہوا تھا - مندر ایک پہاڑ پر واقع تھا جو کثیر سبزہ سے ڈھکا ہوا تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سبز گھاس کا ایک انبار لگا ہوا ہے یا پہاڑ خود مخمل بن کر رہگیا ہے - پجاری نہایت عقیدت کے ساتھ اس مندر میں صبح و شام جاتے، جہاں روحانی تزئین کے علاوہ جسمانی تفریح کے سامان بھی نہایت وافر تھے - آذر، زارہ اور ثمرہ کا باپ مندر کی دیویوں اور دیوتاؤں کے مقدس استھان پر جب دُعا کرتا، اس کی دعاؤں کا مقصد صرف حصولِ حسن ہوتا تھا ——— اس کی دعائیں قبول ہو چکی تھیں یعنی مندر کی دیویوں نے اسے دو کنواریاں ایسی حسین دیدی تھیں کہ انتف کی پوری سرزمین ان کے جواب مثال سے قطعاً خالی تھی - مگر آذر ہنوز اپنی دعاؤں کو ناکام سمجھتا تھا - وہ حسن چاہتا تھا - مگر ایسا جو اس کی آغوش تمنا میں پریشان ہو سکے - وہ عورت ڈھونڈتا تھا، مگر ایسی جو دنیا کے تمام نظارہ سے اُسے بے نیاز کر دے ———

ہاں زارہ اور ثمرہ کی ماں انتقال کر چکی تھی -

آذر جب سورج طلوع ہونے کے بعد اپنے محل سے نکل کر شوالۂ انتف میں چلا آتا تو اس کے بعد شوالہ

سے اور تمام ماحول سے نگاہوں کی گرم کرنیں اس کے محل میں طلوع ہوتیں۔ اس کی لڑکیاں گھبرا جاتیں، اور گھر سے نکلنے کے لئے مجبور ہو جاتیں۔ انہیں محل کی بلند دیواروں میں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ نگاہیں چھن چھن کر ان کے نازک رخساروں پر جمی جاتی ہیں، وہ دیواروں کے پیچھے ہزاروں آنکھوں کو چشم براہ محسوس کرتی تھیں۔ ہاں تو وہ گھبرا جاتیں اور خدا جانے وہ کیا جذبہ تھا جو انہیں کھینچکر کبھی لب بام اور کبھی بیرون در لے آتا تھا۔

جس وقت آذر کی جبین نیاز، حسن کی بڑی دیوی عنصرہ کے قدموں میں جھکی ہوئی اپنی عبودیت و عقیدت کا صندل عنصرہ کی پیشانی پر چڑھا رہی تھی، عین اسوقت زارہ اور ثمرہ اپنے بام پر کھڑی ہوئی سواد انتف کی جنت بکنار فضاؤں کا رس اپنی سانسوں میں بھر رہی تھیں۔ اور اپنے ٹھنڈی عنبر بار سانسوں کو ہواؤں میں ملا کر فضاؤں کو پیام مسرت پہونچا رہی تھیں۔ حسن پرست نوجوان شوالہ کے بہانے پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہوئے، ان دوشیزہ دیویوں کی پرستش کر رہے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ کسی طرح اون کی گداز نوجوانیوں میں، ان کے اچھوتے شباب میں، اور ان کے شہابی چہروں میں جذب ہو جائیں۔ مگر ہمسایہ نگاہوں کا خوف انہیں بار بار چوکنا کر دیتا تھا۔ اور وہ اپنے مسلسل نظارہ کو کبھی کبھی شوالہ کی عظیم المناظر عمارت دیکھنے میں صرف کر دیتے تھے۔

انہیں تماشائیوں میں ایک نوجوان تھا۔ ہرناق۔ جو سب سے زیادہ بے قرار، سب سے زیادہ بیچین۔ اور سب سے مچلنے والی تمناؤں کو اپنے دل میں سنبھالے پھر رہا تھا۔ اسے شوالہ کی حرمت کا مطلق خیال نہ تھا۔ وہ سراپا نظر اور یکسر نظارہ ہو کر صرف، زارہ اور ثمرہ کی شوالہ شکن دیویت میں کھویا ہوا تھا۔ آخر وہ پہاڑ سے جلد جلد اترا اور نشیب کی جھاڑیوں میں کہیں غائب ہو گیا۔

(۲)

آذر کی نیازمندی، دیویوں اور دیوتاؤں کی بارگاہ میں کہاں تک مقبول نہ ہوتی، اس کا، اعتکاف اور اسکا ہر سجدہ، محویت کا ایک بہترین مظاہرہ تھا۔ اسے عنصرہ کے غیر متحرک قدموں میں جھکے جھکے نیند آ گئی۔ وہ عالم خیال میں ایک مجسم دیوی کے سامنے کھڑا تھا، جو اس سے کہہ رہی تھی۔

آذر۔ سر اٹھا۔ گھر جا۔ اور اس شوالہ کے لئے ایک ایسا بت بنا جس کا سر عنبر سارا کا ہو، جبین اور چہرہ صندل کا ہو، گردن شیشہ کی ہو، سینہ بلور کا ہو، رانیں یاقوت سرخ کی ہوں اور پاؤں زبرجد کے ہوں،، اس کی زلفیں مشک سے بنا اور آنکھیں شراب سے، دل موسیقی سے اور زبان گلاب کی پتیوں سے۔ اسی طرح ترکیب دینے کے بعد اسے دیویت کی ریشمی ردا میں چھپا کر لا، اور شوالہ میں ایک طرف کھڑا کر دے۔ میں اس میں جان ڈالونگی

اور پھر وہ تیری اور صرف تیری ہو گی - اگر اپنی دُعا کا نتیجہ دیکھنا چاہتا ہے تو اُٹھ اور میرے حکم کی تعمیل میں مصروف ہو جا۔"

آذر کی آنکھ کھلی تو اُسکا سر بڑی دیوی کے قدموں پر بدستور جھکا ہوا تھا - وہ ایک لطیف کرب کے ساتھ اُٹھا - مودب بیٹھا - اور دیوی کے چہرہ کو پُر معنی نگاہوں سے دیکھنے لگا - اُسے اپنا خواب بالکل یاد تھا - وہ وحشی کی طرح اُٹھا ادھر اُدھر دیکھا اور شوالہ سے رخصت ہو کر اُترا - اور اپنے محل میں پہونچکر خواب پر غور کرنے لگا۔

اس کا احساس تازہ تھا - اس کی آنکھیں بیدار تھیں! وہ سوچ رہا تھا کہ دیوی نے جس دیوی کی تصویر کھینچکر بتائی ہے اگر میں اُسے تیار کر سکا تو واقعی دُنیا میں اُس کا جواب نہ ہوگا - لیکن عنبر، صندل، شیشہ، بلور، یاقوت، سُرخ زبرجد، مشک، شراب - اتنی مقدار اتنی جلد کس طرح مہیا کر سکتا ہوں - اگر یہ چیزیں مہیا ہو جائیں تو کیا ان کی ترتیب میرے ہاتھوں سے ممکن ہے - کیا میں ایسا بت واقعی تیار کر سکتا ہوں اور کیا پھر وہ ذی روح ہو کر میری تمناؤں کی آغوش کو مقدس بنا سکتا ہے ؟

آذر ابھی اس خیال میں تھا کہ زارہ اس کے سامنے سے مچلتی ہوئی نکل گئی، اور ثمرہ بھی زارہ کے پیچھے بھاگتی نظر آئی - آذر اُٹھا - پوچھا کیا ہے کیوں بھاگ رہی ہو - زارہ نے اپنی برق پاش ہنسی کو روکتے ہوئے کہا "کچھ نہیں ثمرہ مجھے چھیڑ رہی تھی دیکھئے اب بھی چھیڑ رہی ہے"

آذر " کیا ہے ثمرہ، اپنی چھوٹی بہن کو تم کیوں پریشان کر رہی ہو۔

ثمرہ " ابا جان - ہرناق مشک مانگنے آیا تھا - میں نے کہا تھوڑے بال کاٹ کر دیدو - تو یہ ایسی بھاگیں کہ مجھے بھی اپنے ساتھ پریشان کر دیا۔

آذر - ہرناق - مشک - بال - اور زارہ! ــــ ثمرہ میں نہیں سمجھا - مشک سے اور زارہ سے کیا تعلق ہے ؟"

ثمرہ " ابا جان آج مجھے نیا تجربہ ہوا ہے، جبکہ شوالے کا گھنٹہ زور زور سے بج رہا تھا - اور ہم دونوں سر جھکائے بڑی دیوی کی یاد میں کھڑے تھے - یکایک زارہ کے گیسو اڑے، مجھے اُن میں سے ایک خاص خوشبو اُڑتی ہوئی محسوس ہوئی جو بالکل مشک کی سی تھی - پھر جو میں نے غور کیا تو زارہ کے بال واقعی مشک سے بنے ہوئے تھے "

زارہ " دیکھئے یہ مجھے بنا رہی ہیں - میں ہرناق کو اپنے بال کیوں دیتی - وہ تو مشک مانگنے آیا تھا - ثمرہ ہمیشہ ایسی ہی باتیں کیا کرتی ہیں "

آذر نے زارہ کو بغور دیکھا۔ اور اوس کی جسمانی ترکیب پر ایک گہری نظر ڈالی، اس نے معلوم کیا کہ ایک دیوی کا بُت بنانے میں جن اجزا کی ضرورت ہے، وہ سب زارہ میں اپنی اپنی جگہ موجود ہیں۔ وہ متحیر ہو گیا۔ اس سے پہلے آذر نے زارہ کو اس نگاہ سے کبھی نہ دیکھا تھا۔ لیکن اُسے اکثر اپنے گھر میں شراب، مشک، اور عنبر کی خوشبو آیا کرتی تھی تاریکی میں اکثر روشنی ہو جایا کرتی تھی۔ اور موسیقی کی نازک صداؤں سے اکثر اوسکی سماعت وجد کرتی تھی۔ مگر وہ ان سب باتوں کو شوالہ کی بڑی دیوی کا تصرف سمجھا کرتا تھا۔ اور اسی لئے شوالہ کی ہم سائیگی پر اُسے ناز تھا۔ آج جب اس نے یہ کیفیت اور عنبریت اپنی حقیقی بیٹی زارہ میں دیکھی تو وہ حیران رہگیا۔ اور کہنے لگا یہ مجسمہ تو بنا بنایا میرے گھر میں موجود ہے۔ مگر میرے کس کام کا۔ وہ کوئی اور آذر ہے جو اس بُت سے بغیر محنت اور تراشنے کے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔ اب میں کیا کروں، مجھے تو بُت بنانا چاہیئے۔ میرے خواب کی تعبیر میرے سامنے موجود ہے...... مگر میں دیکھتا ہوں کہ میری تمناؤں میں کچھ کمزوری سی پیدا ہو چلی ہے........ ہرناق کیوں آیا تھا........ اُسے مشک کی ضرورت کیوں ہے، کیا وہ بھی کوئی بُت بنانا چاہتا ہے جس کی بشارت دیوی نے دی ہو........ آذر بہت پریشان تھا، اس کا دماغ اُلجھ رہا تھا۔ لڑکیاں اُس کے سامنے سے چلی گئی تھیں، مگر اُس نے زارہ کو پھر آواز دی۔ وہ آئی۔ کہا بیٹھ جاؤ۔ زارہ نے اپنی لچکدار گردن کو خم دیا اور بیٹھ گئی۔ اس کے باریک ریشمی لباس میں اوس کا تمام جسم جھلک رہا تھا۔ اور آذر یقین کے ساتھ دیکھ رہا تھا کہ دیوی کی بشارت کا مجسّمہ اُس کی بیٹی زارہ ہے۔

(۲)

کئی دن سے آذر شوالہ میں نہیں آیا۔ بڑی دیوی اُس سے ناراض ہے دیوتاؤں کو حکم دیدیا گیا ہے کہ مقدس استھان کے لئے کوئی اور نیازمند تلاش کریں۔ جو آذر سے بہتر پیشانی اور آذر سے بہتر کنواریاں رکھتا ہو۔ حکم کی تعمیل ہو جاتی مگر تمام انتقن میں آذر کی کنواریوں سے زیادہ حسین لڑکیاں نہ مل سکیں۔ سارا اور سمدان میں ایسی دو لڑکیاں ضرور تھیں مگر وہاں کے سب سے بڑے دیوتا نے ان کو انتقن کے اہل شوالہ کی نذر کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ سارا اور سمدان سے اگر یہ دونوں لڑکیاں انتقن بھیجدی جائیں تو یہاں وہ صبح نہ ہو گی، اور اگر کرۂ شمس کے روٹھے ہوئے دیووں کو منا بھی لیا تو سارا اور سمدان کی رات اپنی رنگینیاں کھو دے گی۔ سارا میں دوپہر کی طرح شام گرم ہو گی اور سمدان میں رات کو کیف

ذرا بھی روشنی نظر نہ آسکے گی۔ نہ کوئی تارا آسمان پر طلوع ہو سکے گا۔

دیوی نے اپنے وقار خاموشی کو قایم رکھتے ہوئے زبان حال سے کہا میں آذر سے اس لاپرواہی اور غیر حاضری کا بدلا ضرور لونگی۔ اور اب وہ دیوی اُسے دی جائیگی جو اس سے زیادہ میرے قدموں پر سجدے کر سکے گا۔

خادمان شوالہ نے دیوی کے غصّے کی چنگاریاں محسوس کیں۔ اور ایک رات جبکہ شوالہ گھنٹے کی زبان خاموش اور پہاڑ کا سبزہ خواب میں تھا۔ ہرناق کو ارض انتف سے اُٹھا کر دیوی کے قدموں میں جھکا دیا۔ ہرناق کی آنکھیں خواب آلودہ نہ تھیں اشک آلودہ تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر وہ تبخالے تازہ تھے جو دعاؤں کی گرمی سے ابھی پھلے پھر نہ تھے۔ وہ دیوی کے قدموں پر اپنا سر نیاز دیکھ کر اس یقین میں تھا کہ خواب دیکھ رہا ہے۔ اور دیوی اس کے اثرات قلب کو اپنی جاذب مگر سنگین نگاہوں سے پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یکایک ناقوس کی پُر شور صدا نے ہرناق کو چونکا دیا۔ اور اب وہ سمجھا کہ جسے خواب سمجھ رہا تھا وہ خواب نہ تھا بلکہ ایک بیدار کشش تھی جو اُسے اس کی خلوت سے کھینچ کر شوالے میں لے آئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنا سر اُٹھائے اور اس ناگہانی انقلاب پر غور کرے مگر کسی نے اُسے مجبور کر دیا اور وہ کسمسا کر بدستور سجدہ میں پڑا رہ گیا۔

شوالہ کا گھنٹہ گونجا۔ اور صبح کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ آذر اپنی گھبراہٹ اپنے چہرہ پر لئے ہوئے کسی طرف سے دوڑا ہوا آیا وہ چاہتا تھا کہ دیوی کے قدموں میں سر جھکا دے مگر اس نے اپنی جگہ ہرناق کو سجدہ میں پایا۔ اُسے غصہ آ گیا۔ وہ ضبط نہ کر سکا۔ اور ہرناق کا پیراہن پیچھے سے کھینچکر اُسے وہاں سے دور کرنا چاہا۔ مگر ہرناق نے دیوی کے آہنی پاؤں پکڑ لئے۔ پیراہن پھٹ گیا۔ اور آذر پیراہن کا ایک ٹکڑا لئے ہوئے دور جا پڑا۔ اس کا سر شوالہ کی دیوار سے ٹکرا گیا۔ اُسے چکر آ گیا وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

ہرناق ابھی تک سجدہ کر رہا تھا۔ اُجالا بڑھتا چلا جاتا تھا۔ اور شوالہ کے پجاری صندل اور لوبان لئے ہوئے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ زبانوں پر دیویوں کا نام تھا۔ اور تیوروں سے عقیدت برس رہی تھی۔ ایک پجاری نے آذر کو فرش پر کرب میں پایا اس نے اُٹھایا۔ اور کہا۔ "کیا تم رات بھر شوالہ میں رہے ہو؟"

آذر: "نہیں میں اس گنوار کو یہاں سے نکالنا چاہتا ہوں جو سجدوں کے بہانے دیوی کے پاؤں کا صندل چاٹ رہا ہے۔ وہ قیمتی صندل جو میں نے یمن سے منگوایا تھا اور جس کی تہیں دیوی کے قدموں پر چڑھائی تھیں"

پُجاری نے ہرناق کی طرف دیکھا۔ جو اب تک سجدہ میں تھا۔ اور جس کی آنکھوں سے نکلے ہوئے آنسو

ایک گز زمین کی آبیاری کر چکے تھے - وہ ہرناق کے پاس گیا - اُسے آواز دی - اور کہا "صبح ہو چکی ہے - اُٹھو - تم کون ہو اور دیوی کے استھان سے کیا چرا رہے ہو" ہرناق چونکا - اُس نے سر اُٹھایا - دیوی کو ہاتھ جوڑ کر سلام کیا - اور پجاری سے کہا "شوالہ میں کوئی شخص چوری کرنے نہیں آتا - اور اے پاکباز برہمن، میں تو چرا کر منگوایا گیا ہوں"

پجاری "یعنی"

ہرناق "یعنی مجھے دیوی کی آلہانہ قوتیں سوتے سے یہاں اٹھا لائی ہیں - میں خود نہیں آیا ہوں"

پجاری "اچھا تمہارا معاملہ بڑے دیو کے سامنے پیش کیا جائے گا، تم اُٹھو اور ہمیں صبح کے مراسم پورے کرنے دو"

ہرناق مجبوراً اُٹھا اور ایک گوشہ میں کھڑا ہو گیا - آذر غصہ کی تیز نگاہیں ہرناق پر ڈالتا ہوا باہر نکل گیا - پجاری صبح کے مراسم ادا کرنے لگے - دیوی کے معتقد آتے تھے اور سلام کرکے چلے جاتے تھے - مگر ہرناق ہاتھ باندھے اور آنکھیں بند کئے شوالے کے ایک کونے میں مجرمانہ حیثیت سے ابتک کھڑا ہوا تھا - اور اُس کی محویت اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ شوالے میں یکایک آنے کا مسئلہ بھی اب اُسکے دماغ سے باہر تھا -

(باقی آیندہ)

محمد شفیع شفیع اکبرآبادی

ہستیٔ معصوم

(جناب مولوی محمود الرب صاحب خالد بنگالی)

عنوان کو پڑھکر غالباً آپ کا خیال قدرتاً فرشتوں کی جانب منتقل ہو گیا - لیکن نہیں - میں یہاں کچھ اور ہی کہنا چاہتا ہوں - آجکل کارنامہ مادیات سے غرض رکھتا ہے اور مادی تحقیقات سے بالقصد آگے بڑھنا نہیں چاہتا - اس لئے روحانیاتِ محض کا ذکر بیجا ہے - جبکہ سرے سے عالم غیر کا وجود ہی معرضِ انکار میں ہے -

ہاں تو یہاں "ہستیٔ معصوم" سے وہ لطیف ہستی مراد ہے - جسے صحیح معنی میں چہرۂ کائنات کا آب و

رنگ کہہ سکتے ہیں۔شاعرانہ زبان میں ادب کی ساری لطافتیں ایک سالن میں آپ جمع کرلیں جب بھی جملہ نا تمام ہی رہے گا۔اور کہنے والے کے لئے جو تھوڑا سا مذاق تنقید بھی رکھتا ہو نہیں معلوم کیا کچھ کہنا باقی رہجائے گا۔اسلئے بیان کی سادگی سفارشی ہے۔کھلے لفظوں میں کہدوں میری غرض "مخلوق نازک ترین" یعنی عورت سے ہی!

زباں پہ بارخدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے

ممکن ہے کسی کو عورت کے معصوم ہونے میں کلام ہو۔لیکن اسے کیا کیجئے میں ہزاروں گناہوں کے ساتھ بھی اس چیز کو معصوم ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔اسے خوش مذاقی سے (بدمذاقی کہنا خلاف تہذیب ہوگا) آپ میرا شیوہ نیازمندی نہ سمجھئے۔محض تقاضائے فطرت اور عین منشا حسن ہے جو کچھ عرض کر رہا ہوں۔

معصومیت کے جو معنی آپ کے نزدیک ہیں وہ میں جانتا ہوں۔اور گو افراط تنجید گی میرے لئے بیجوڑ سی شے ہے۔تاہم خیام کی طرح وعدہ فرداسے اسقدر بدگمان بھی نہیں ہوں، کہ آپ کو شکایت کا موقع مل سکے بات صرف اتنی ہے۔آپ کا ہم خیال ہونے کے باوجود بھی جنس لطیف یعنی عورت میرے نزدیک نہایت نازک تخیلات کی صرف تصویر مرئی ہے۔جس کے پرُ شباب سینے میں وجدان روحانی۔ایک وصف اضافی سے زاید حیثیت نہیں رکھتا۔اس میں شک نہیں کہ تناسب اعضا یہاں یک لخت بے تعلق یا نا انداز نہیں کہا جا سکتا جسپر بوالہوسوں کے دندانِ آز ہمیشہ تیز ہی رہے۔لیکن میں اپنے خیالات کی نشو و نما اس دنیا میں چاہتا ہوں جہاں شرعی دُرّے بے ضرورت۔اور سنبل کے تازیانے نرم و نازک ہاتھوں میں حفظ اخلاق کے ضامن ہیں۔

عورت کی غایتِ زندگی ایک چاہنے والے کے دلمیں تھوڑی سی جگہ۔یعنی محبت ہے۔جس دنیا میں آپ اور ہم ہزار دل جاو بیجا خواہشوں کے ساتھ زندہ رہنا چاہتے ہیں "وہ" صرف اسی کی طالب رہتی ہے۔سلطنت کو ٹھکرا دیگی۔اگر ایک سچے چاہنے والے پر اپنے آپ کو حکمراں نہ پائے۔ایک نور کی ہیکل کو قدموں کے نیچے رکھکر غیورانہ مسل دے گی۔اگر شائبہ خلوص سے معرا دیکھ لے۔دل سے دل ملا ہو تو پس پردہ خوش سن لیجئے۔ورنہ لاکھ آنکھوں پر بٹھائیے۔وہ خاک جھونک کے چلدے تو سہی!

ایوانِ ناز میں برقی فانوس کی ضیاباری۔اس کے لئے خاص مذاق کی چیز ہے۔لیکن اظہار دلچسپی اُسیوقت جائز سمجھتی ہے۔جب تیز و شفاف روشنی کسی کی نگاہ اشتیاق کو حد فاصل پر روکے ہوئے تڑپا رہی

ہو - یہ نہیں تو دُنیا بھر کی تاریکی وہ اپنی خلوت اُنس میں سمیٹ لینے کے لئے تیار ہے !

عورت چاہے جس حالت میں ہو - خلوص اُس کی فطرت کا عنصر لازمی ہے - جس کے بے ساختہ گرموزوں اظہار سے کسی وقت وہ عاری نہیں !

اس حقیقت سے آپ کا منافیانہ انکار کس حد تک لایق تحسین ہے - اس کا فیصلہ میں اُن طبائع پر چھوڑتا ہوں جو عورت کو اس کی تمام حسیاتِ لطیف کے ساتھ حدود نسائیت کے اندر ہی دیکھنے کی عادی ہیں - میں صرف اسقدر گذارش کرونگا کہ مالوفانہ اعتراف کے مقابلہ میں جو ذوق صحیح اور احساس کامل کا نتیجہ ہے - کسی بھونڈے مذاق کے پھوہڑپن کو کوئی نسبت ہی نہیں دیجا سکتی -

چراغ مردہ کجا شمع آفتاب کجا

چہ جائیکہ دونوں کو ایک زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کی بے محل کوشش تک کیجائے -

دیکھئے - یہ ایک شانِ معصومیت ہے - جس کی ہوا بھی آپ کو چھو نہیں گئی - یعنی عورت اپنے نشاط زندگی پر دوسرے کو قابو پاتے ہوئے دیکھکر دل ہی دل میں خوش ہوتی ہے اور کسی رقیبانہ جذبہ سے متاثر ہونا بالکل عار سمجھتی ہے -

نقصانات کے تصادم سے (چاہے وہ کسی نوع کے ہوں) اپنے ضمیر میں کوئی کمی محسوس نہیں کرتی ہاں ایسے میں ایک "مستقبل تصویر" ہمیشہ پیش نظر رکھنے پر مجبور ہے جو خلوت و جلوت میں اس کی تمام تر دلچسپیوں کو پورے توجہ کے ساتھ اپنے میں جذب کر سکے - !

جبین نازنین ایک بار یکساں تمام شکن اسی وقت نظر آسکتی ہے - جب چاہنے والے میں احساس کی کمی دیکھے - ورنہ زندگی کے ہر مرحلہ میں اُس کا تبسم زیر لب ہزار سامانِ حیات کے برابر ہے "وہ" اپنے چاہنے والے کی ہر آزمائش کے متعلق حوصلہ افزا خیالات رکھتی ہے اور اس امر کی صلاحیت کہ نازک سے نازک محمل پر بھی اپنی طرف سے آپ کو بدگمان نہ ہونے دے - شرط صرف اتنی ہے - اسے آپ آہستہ سے اپنے دل میں پیوست ہو جانے دیجئے - اور اس سے نہاں رکھئے - وہ پھول کی طرح نازک شے ہے اسلئے کانٹا بن کر آپ کو خلش نہ پہونچائے گی !

جو انانہ خوش فعلیوں میں کبھی وہ آپ اپنی تماشائی بن جاتی ہے - اور جو کیف سرور اپنے حریف

نزاکت سے مل کر حاصل ہو سکتا ہے۔ تنہا رہکر اپنے باطن میں پیدا کرلیتی ہے۔ وہ اپنے کو اپنا غیر سمجھکر خطاب و عتاب کرتی ہے۔ کبھی خود روٹھ جاتی ہے تو کوئی اُسے منانے لگتا ہے کبھی روٹھے ہوئے کے آگے مجرم نادم کی حیثیت سے ہاتھ جوڑتی ہے کبھی اپنے محسوس و مجسّم ہاتھوں سے کسی پیکر موہوم کا احاطہ کرنا چاہتی ہے۔ اور کبھی تھک کر اپنے کو اُسکے آغوش محبت میں سونپ دیتی ہے۔!

غرض بیخود ہونے کے بھی آپ سے باہر نہیں جانا چاہتی۔ اور اُسکے ارادے محض ارادے نہایت خوبصورتی سے افعال کا جامہ پہن لیتے ہیں۔

فطرتِ نسائیت کی یہ وہ مخصوص ادائیں ہیں جن سے دوسرے محروم رکھے گئے ہیں۔

آباد ہے یہ کوچہ دل ناتواں تلک

عصمت پر فلسفیانہ نکتہ سنجی ایک ایسے دماغ کے لئے جو علمی بحثوں سے لگاؤ رکھتا ہو خوش آئندہ مشغلہ ہے التجا تو بیموقع ہو گی۔ ہاں اتنی آرزو ضرور ہے۔ کاش کبھی وہ اسطرف متوجہ ہو اور میرے اس ادّعا کو کہ نسائیت و عصمت مرادف الفاظ ہیں قریحہ صالحہ سے جانچے اور اپنے ذوق علمی کا ثبوت دے۔

گو میرے قبل از وقت اظہار رائے کو آپ بے تکی شہنائی سے تشبیہہ دیں گے۔ تاہم اس خیال سے کہ پند احب ناقابل تحمل ہو جائے اسکا اظہار معیوب نہیں۔ میں اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ نامزد موضوع پر نقد و نظر کے بعد دفعتاً جو تصویر چشم تصور کے آگے آ کر کھڑی ہو جائے گی وہ ایک عورت ہو گی۔

ہماری زندگی کے اُس دایرہ میں "عورت" قدم تک رکھنا نہیں چاہتی۔ جسے قدرت کی فیاضی نے صرف ہمارے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ لیکن نگاہ اسقدر گہری رکھتی ہے کہ دایرہ کا کوئی ساشعبہ مس نا کردہ نہیں رہ جاتا اور جسکا اثر یہ ہوتا ہے کہ ہماری اخلاقی قوتیں کبھی کبھی حرکت میں آ جاتی ہیں ورنہ معاف رکھا جاؤں جمود ہماری فطرت کا عنصر لازمی ہے جسے کم از کم اس دنیا میں ہم دست بردار نہیں ہو سکتے۔

حیاتِ نسوانی کا یہ پہلو اسکے اچھوتے پن کا آئینہ ہے۔ ذرا طرز تصرف کی بلاغت کو دیکھئے گا کتنی مانوس بیگانہ وشی ہے۔ اس سے تو اچھا۔ کہ نعل ہیں مگر افتراق ذوق کیسا تھہ۔

اب بھی آپ اسے غیر معصوم ثابت کرنا چاہیں تو۔ ع

چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

درسِ شہادت

(جناب مولوی محمود الرب صاحب خالد بنگالی)

ناامیدی اب نہیں جینے کی مطلق آرزو — آج پھر زخموں سے دل کے بہ گیا سیروں لہو
تیرہ و تاریک ہے نظروں میں دُنیا چار سو — آرہا ہے یاد مجھ کو زیرِ خنجر اک گلو
آہ - ہفتم تک رہی لاش اس کی وقفِ التہاب
تشنگی پر جس کی ہے تسنیم و کوثر آب آب

مہر انور پردۂ ظلمات میں روپوش ہے — غرۂ ماہ محرم شعلہ در آغوش ہے
چشم عالم صورتِ سیارگاں خاموش ہے — کربلا کی خاک سے یوں آسماں ہمدوش ہے
کارواں اسدم ہے اک مہمان دشتِ بیکسی
جس کے قدموں نے بڑھائی شان دشتِ بیکسی

داغ عصیاں ثبت لوحِ خاوراں ہونیکو ہے — خضر کو رنج حیاتِ جاوداں ہونیکو ہے
حرمتِ دین آہ نذرِ ناکساں ہونیکو ہے — شور ماتم تا حریم لامکاں ہونیکو ہے
جاگ اُٹھے فتنے - الٰہی سو نجائے کائنات
خوف ہے مجھ کو کہیں کم ہو نجائے کائنات

آہ کیونکر اس غمِ جانکاہ کا اظہار ہو — نیلگوں چوٹوں سے جسکی گنبدِ دوّار ہو
نیم کش ہو تیر تو کچھ طاقتِ گفتار ہو — کیا محل گفتگو سینہ سے جبدم پار ہو
طعنے دیتے ہیں مگر رشتہ کے تولائی مجھے
چھوڑ جا اسدم نہ تو اے تاب گویائی مجھے

تھا یہی منظور کیا تجھ کو قلم کار ازل — تھا اسی کے واسطے فطرت کا یہ طرزِ عمل
گر پڑا ہے ٹوٹ کر بزمِ امامت کا کنول — اے زمیں ہشیار ہو اے آسماں دیکھ اب سنبھل
شامتِ اعمال پھرتی ہے بگولے کی طرح

مرکز عالم کو جنبش ہے ہنڈولے کی طرح

چشم عبرت سے ذرا اے آسمان پیر دیکھ   کون سقا کان شامی کا ہے یہ نخچیر دیکھ
دشت غم میں بیکسی عترت شبیرؓ دیکھ   اُف! گلوئے اصغرؓ ناداں میں زخم تیر دیکھ
خون سبط مصطفےٰ کو کر چکی دنیا ہدر
"الحذر از دفتر عصیان امت الحذر"

خاک و خوں میں ہیں لب دریا جوانان حسینؑ   دست عابد میں ہے خون آلودہ دامان حسینؑ
کچھ نہیں جز رنج و درد و کرب سامان حسینؑ   سینکڑوں تیر جفا ہیں بہر یک جان حسینؑ
اہلبیت مصطفےٰ میں کفر کی غارت گری
اے مسلمانان فغاں از دور چرخ چنبری

آہ جب پیاسے گلے پر شمر نے پھیری چھری   آسماں تھرا گیا غم سے زمیں ہلنے لگی،
نعش اکبرؓ دیکھ کر جب آخری انگڑائی لی   شدت غم سے نجف میں روح حیدرؓ کانپ اٹھی
کچھ خبر اس کی تجھے او گردش ایام ہے
گنبد خضرائے یثرب دست بر اندام ہے

فطرت معصوم اس غم سے گریباں چاک ہے   اُف زمانے کی روش بھی کسقدر بیباک ہے
مضطرب صدمہ سے روح سید لولاک ہے   فاطمی خوں سے زمین کربلا نمناک ہے
قدسیوں کا حال ماتم میں نہ کیونکر غیر ہو
خاک اڑتی ہے مدینہ میں الٰہی خیر ہو

زیر تربت آہ اب راحت نہ پائیں گی بتولؓ   سید عالم کو رو رو کر جگائیں گی بتولؓ
جب کھلے سر عرصۂ محشر میں جائیں گی بتولؓ   اک قیامت پیش داور اور ڈھائیں گی بتولؓ
آہ جس دم بخشش امت کی ساعت آئیگی،
خون فرزندان بیکس فاطمہؓ دکھلائیگی،

الفقر فخری

کیا کریں فریاد جب رکھتے نہیں فریاد رس   دم بخود ہیں اپنے عالم میں اسیرانِ قفس
ساز و برگ کارواں ہے اور نہ آوازِ جرس   اپنا مسلک ہے فقط اللہ بس باقی ہوس
رات دن کرتے رہے ہیں نفس کی قربانیاں
فخر الفقر فخری ہیں ہمسے بے سامانیاں

جامۂ استبرق و قاقم سے ہم کو کام کیا؟   ساغرِ جمشید کیا؟ اور بادۂ گلفام کیا؟
داستانِ شکوہائے گردشِ ایام کیا؟   رات دن یکساں ہیں ہم کو صبح کیا اور شام کیا
چشمِ عبرت میں ہمیشہ سے یہ دونوں رنگ ہیں
دل کے پردے اس نوا سے سازِ ہم آہنگ ہیں

بے بقا ہے جب تو یہ انشا غلط دفتر غلط،   نظمِ سیار و ثوابت صورتِ محور غلط،
جلوۂ مہر مبین و تابشِ اختر غلط،   نقطہ نقطہ فردِ ہستی کا ہی سر تا سر غلط،
اس نمودِ بے بقا سے کسبِ عبرت کیجئے
عالمِ کثرت میں رہکر درسِ وحدت کیجئے

وہمِ باطل کارِ عقلِ تفرقہ پرداز ہے   دل پہ قبضہ ہو جسے وہ مایۂ صد ناز ہے
سازِ نیرنگِ جہاں بھی دیکھئے کیا ساز ہے   مختلف پردے ہیں لیکن ایک ہی آواز ہے
نور پیدا ہو رہے ہیں ایک ہی تنویر سے
اتنی تصویریں کھنچی ہیں ایک ہی تصویر سے

عیشِ فانی کا تصور لغو ہے بیہودہ ہے   حبِ دنیا سے دلِ غم آشنا آسودہ ہے
ایک حصرِ "فقر" ہے وہ بھی غبار آلودہ ہے   صبرِ ایوبی ہمارا شیوۂ فرسودہ ہے
دردِ دل را می کنم با ضبطِ پیوندے دگر
بر طبیبِ خود تغافل میزنم چندے دگر
(نظیری)

ہم کو اس سے کیا غرض ہو قصر گردوں کا جواب نقش جبرئیل و الموت و ابنو للخراب
ہم جہاں ہیں وہ زمین ہے روکش صد آفتاب ذرہ ذرہ ہے ہماری خاک کا حکمت مآب
بارگاہِ حق میں حاضر ہیں ہمیشہ دل بکف
خاک کے پتلے ہیں ہم اور نوریوں پر ہی شرف

عزیز (لکھنوی)

مسلک تسلیم

مطربہ خوش گلو کمسن و رنگین ادا عربدہ جو، خوبرو، عشوہ گر و فتنہ زا
دست حنائی میں اک جام نگاری لئے محفل رنداں میں کل یوں ہوئی نغمہ سرا
شورِ فغاں تا بہ کے رنج و الم تا کجا

واقف رازِ جہاں کون ہوا آج تک ساحلِ بحرِ بقا کس کو ملا آج تک
عارضِ مقصود کا بوسہ میسّر کسے محملِ اندیشہ تک اُٹھ نہ سکا آج تک
عقدۂ ہستی کو حل کس نے کیا آج تک

عالم افلاک کی دید ہوئی یا نہیں پاسِ خبر پائے نظر سے کہیں ان کی تھی رفتار تیز
فرش سے ہی عرش تک گلکدۂ کائنات اپنا کرہ اس میں ہے صورت گل مشک بیز
جیسے ہو اک قطرہ میں عکس چمن جلوہ ریز

ذرۂ ناچیز کی ہوتی تو ہے کچھ نمود اس سے کہیں کم ہے آہ، دہر میں اپنا وجود
بندۂ تسلیم بن اور ہو وقفِ سجود

محمود (اسرائیلی)

مٹنے کی نہیں ہی کبھی گجرات میں اُردو

ہے گرچہ پھنسی ورطہ آفات میں اُردو
مٹنے کی نہیں ہے کبھی گجرات میں اُردو

یہ میرؔ کی ہے "آہ" یہ غالبؔ کا ہی "نغمہ"
زندہ ہے ولیؔ تیری مناجات میں اُردو

زنّار میں تسبیح کے دانے ہیں پروئے
ہے برزخ الفت صفت و ذات میں اُردو

گو مرمٹے گجرات میں توحید کے شیدا
باقی رہی پیروں کی کرامات میں اُردو

پاتے ہیں اسے مہد سے بے شبہ لحد تک
محدود ہے کب شعر و حکایات میں اُردو

آنکھوں پہ پڑے "جہل و تعصب" کے ہیں پردے
مٹتی ہے "انگلش" کی خرافات میں اُردو

کہدو یہ حریفوں سے یہ ہی نشۂ عرفاں
لائی ہے عجب رنگ خرابات میں اُردو

ملت کا اگر درد ہے نوابؔ دلوں میں
آئے گی سدا یاد ہر اک بات میں اُردو

نواب علی
(از بڑودہ)

سیّد القوم خادمہم

شاہ ہاروں الرشید باصفا کے عہد میں
تھا بنی عباس میں جو سرورِ عالی مقام

قاضی یحییٰ ابن اکثم عالمِ مشہور نے
ایک دن ایوانِ شاہی میں کیا آکر قیام

رات کو سوئے تو اُٹھے خواب سے پچھلے پہر
کیونکہ [illegible] سے پیاس کے وہ ہو رہے تھے تشنہ کام

چاہتے تھے اُٹھیں بستر سے وہ پانی کے لئے
اور بجھائیں تشنگی اپنی وہ جاکر بالمرام

پاؤں کی آہٹ جو اُٹھنے میں خلیفہ نے سُنی
سو رہا تھا جو قریب اُن کے وہیں آسودہ کام

جھٹ اُٹھا بستر سے اور ہو کر کھڑا کہنے لگا
"اس گھڑی کیا آپ پانی پیجئے گا اے امام"؟

روک کر اُن کو وہیں خود جاکے پانی لا دیا
جس سے اپنے دل میں شرمندہ ہوا وہ نیک نام

معذرت کی اور بولے "یا امیر المومنین!"
کیا نہ تھا حاضر یہاں پر آپکا کوئی غلام؟

تب خلیفہ نے کہا کیا میں سُناؤں آپ کو
ہے جو ارشادِ جنابِ خاتم الرسل الکرام؟

جو مسلمانوں میں اپنی قوم کا سردار ہے
ہے وہ بیشک ان کا اک ادنیٰ سا خادم اور غلام

اختر (جوناگڈھی)

رباعی محمود

(در صنعت مقلوب)

الفاظ میں اک لطف نمایاں دیکھا
نالاں کو ہر اک طور سے نالاں دیکھا
اقبال سے لاابقا ہی نکلا محمود،
نادان کو اُلٹا بھی تو نادان دیکھا

محمود اسرائیلی

عقد پروین

(حضرت حاتم اصمؒ کے حکیمانہ اقوال و نصائح)

اگر تو یار کوئی چاہتا ہے — تو ہے وہ ایک رب العالمین بس
اگر ہمراہیوں کی ہے ضرورت — تو ساتھی ہیں کراماً کاتبین بس
جو ہے عبرت کے نظارہ کی خواہش — تو اس دُنیا کو دیکھ اے ہمنشیں بس
کوئی مونس اگر تو چاہتا ہے — تو ہے واللہ قرآنِ مُبیں بس
اگر کچھ کام تجھ کو چاہیے تو — جُھکا حق کی عبادت میں جبیں بس
اگر ہے وعظ کی تجھ کو ضرورت — تو کوئی مرگ سے بڑھکر نہیں بس
سُنا تو نے کہا جو کچھ کہ میں نے — نصیحت یہ اگر تجھ کو نہیں بس

تو پھر یہ آخری بھی بات سُن لے
کہ ہے تو دوزخی کر لے یقیں بس

کامل (جوناگڑھی)

سلام

(از جناب حکیم سید فضل علی صاحب مرحوم شفا بڑودوی)

ہی طبع زوروں پہ پیری میں عنفواں کیطرح — زمین شعر دکھاتی ہے آسماں کیطرح
پتا لحد کا نہیں خاکِ جسمِ جاں کیطرح — کہیں کا نام و نشاں مٹ گیا مکاں کیطرح
جگہ نہ اُلفتِ دُنیا کی تھی دلِ حُر میں — دلائے شاہ نے گھر کر لیا تھا جاں کیطرح
انہیں بھی کر دیا اُمت پہ شاہِ دیں نے نثار — کہ جنکو گود میں پالا تھا اپنی جاں کیطرح
بچایا کشتیِ اُمت کو غرق ہونے سے — ردائے فاطمہ زہرارضؓ نے بادباں کیطرح

نہ بہکا جادۂ حق سے جو حر یہ باعث تھا
کہ ساتھ ساتھ تھی رحمت نگاہباں کیطرح

یہ داغِ ماتمِ شبیرؑ دیکھنا اک دن
لحد میں دیگا ضیا مہر آسماں کی طرح،

برائی اور بھلائی سے متصف ہے یہی
محال کہنے ہے ممکن کیا زباں کیطرح

بہم تھی دولت اولاد و مال و زر لیکن
کسی نے نام نہ روشن کیا زباں کیطرح

ہیں ہو حدت مہر سیام کا کیا ڈر
سروں پہ رحمت حق ہوگی سائباں کیطرح

بلائیں روضہ پہ حضرت جو اکی سال شفا
پڑھوں سلام یہ ممبر پہ روضہ خواں کیطرح

تاریخ اجرائے رسالہ زبان

(از جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈہی)

تعال اللہ کہ شد دور فلک آخر بکام ما
بر آمد از پس مدت تمنائے دلِ اختر

چہ خوش وقتے و خرم روزگاری او نمود اکنوں
کمر بستہ با جرار رسالہ حضرتِ خوشتر

دعا دارم مر او را ایزد بقای جاوداں بخشد
شود از جملۂ اردو رسائل افضل و برتر

پئے تاریخ اجراے رسالہ فکر می کردم،
سروشم داد ایں مژدہ "زبانِ دلکش و خوشتر"

۱۹	۶	۲۶

غزلیات

(خاکسار عبدالرحمٰن خوشتر منگرولی ایڈیٹر)

ایک دونوں کی جب نظر ہو گی
دونوں جانب وہ کارگر ہو گی

کیا خبر تھی کہ اشک باری سے
آتش عشق تیز تر ہو گی

قہر ٹوٹے گا جان دشمن پر
لطف کی مجھ پہ جب نظر ہو گی

کیا یہ سمجھے ہو تم دعا کی طرح
آہ بھی میری بے اثر ہو گی؟

آپ سے اور غیر کو اُلفت!
ہو گی لیکن نہ اسقدر ہو گی

کیا ہمارے ہی باغ عالم میں
شاخ امید بے ثمر ہو گی؟

دست اُلفت جو آپ رکھدیں گے
کم ذرا سوزش جگر ہو گی

غیر سے کام! غیر سے مطلب!
جب نظر ہو گی یار پر ہو گی

جس سے تر ہو گی آستیں تیری
وہ ہماری ہی چشم تر ہو گی

مجھپہ اُس شوخ کی نگاہِ کرم
نہیں ہوتی کبھی مگر ہو گی

رنج و آفت میں یونہی اے خوشتر
عمر کب تک تری بسر ہو گی

(از جناب محمد یوسف صاحب ناظم لکھنوی)

داغ جو آپکا دیا ہو گا
محفل عشق کا دیا ہو گا

دلمیں کیا درد کے سوا ہو گا
درد بھی وہ کہ لادوا ہو گا

ہے یہ کافی کہ وہ کہے اپنا
حق خدمت تو کیا ادا ہو گا

ہم تمہارے نیازمند سہی
ناز بردار دوسرا ہو گا

وہ الست بربکم تو کہے
ہر زباں پر بلا بلا ہو گا

ما عرفناک حق معرفتک
وہ کہے گا جو آشنا ہو گا

بلبلیں کیوں خموش ہیں شاید
آج ناظم غزل سرا ہو گا

اخبار علمیہ

علمی اصطلاحات

(۱) دمشق کے مجمع علمی العربی نے آلۃ الکاتبہ (Type writer) کے لئے لفظ "النّاسخۃ" وضع کیا ہے۔

(۲) ابتک ہمارے ہاں (Botanist) کے لئے لفظ "نباتی" مستعمل ہے مگر پانچویں صدی ہجری میں ابن بیطار نامی اندلسی عالم نباتات نے اس کے لئے لفظ "شجّار" وضع کر لیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے مفردات میں لفظ قرصعنہ کے تحت میں لکھتے ہیں:-

"وکلّھا مشھورۃ عند الاطباء والشجّارین"

(۳) مصر کے ایک عالم عارف بک النکدی نے تحقیق کیا ہے کہ امام ابن تیمیہ نے لفظ ھیئۃ الاجتماعیہ انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔ جن معنوں میں آجکل مستعمل ہے۔

(۴) ہمارے ہاں تھیوری کے لئے لفظ "نظریہ" مستعمل ہے۔ علامہ ابن خلدون نے نظریات کے لئے "انظار" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

(۵) مصریوں نے موٹر کار کے لئے "سیّارۃ الکہربائیۃ" وضع کیا ہے۔ (الزہرار)

باغ حیوانات

عام خیال ہے کہ باغ حیوانات (زولاجیکل گارڈن) اہل یورپ کی ایجاد ہے، مگر تاریخی شہادت اس کو خلاف واقعہ قرار دیتی ہے۔ عربی تواریخ میں اس کے لئے لفظ "حیر الوحش" آیا ہے، اور سب سے پہلے عباسی خلیفہ المامون نے اس کو قایم کیا۔ اس نے یہ باغ حیوانات اپنی زوجہ بوران کے لئے بغداد میں نہر عیسیٰ کے کنارے قصر ثریا سے

متصل تعمیر کرایا تھا۔ اس کے بعد خلیفۃ المقتدر باللہ نے اسپر بہت کچھ اضافہ کیا۔

(ملاحظہ ہو تاریخ بغداد للخطیب (مقدمہ) صفحہ ۴۸ طبع پیرس)

(الزہرا)

عرب میں سونے کے دانتوں کا رواج

امام سیوطی بغیۃ الوعاۃ (صفحہ ۳۹۳) میں معاذ بن مسلم الہراء کے حالات میں لکھتے ہیں کہ اُنھوں نے اپنے دانتوں پر سونا چڑھایا تھا۔ یہ پہلے نحوی ہیں جنھوں نے علم التصریف وضع کیا۔ یہ عبد الملک بن مروان کے عہد میں پیدا ہوئے اور ۱۸۷ھ میں اُنھوں نے وفات پائی۔

شمال یورپ میں اسلامی سکہ جات

پروفیسر محمود بک سالم نے جمعیۃ الجغرافیہ الخدیویہ کے سامنے ایک لکچر دیا جسمیں اُنھوں نے بیان کیا:۔

"ڈاکٹر جارج یاکوب کہتے ہیں کہ سنہ ۱۸۳۶ء میں اُنھوں نے جزیرہ آئس لینڈ میں صوبہ بیرار کے ایک قصبہ میوڈال میں، اور گرین لینڈ میں قطب شمال کے قریب اسلامی سکہ جات دریافت کئے۔ مگر اب تک یہ نہیں معلوم ہوا کہ اس منطقہ میں یہ اسلامی نقود کیسے منتقل ہو گئے۔"

"علاوہ ازیں شمال یورپ کے اکثر حصوں خصوصًا روس، جرمنی، سویڈن وغیرہ میں کئی سکّے برآمد ہوئے ہیں۔ چنانچہ پروفیسر ٹورنبرگ نے سنہ ۱۸۵۷ء میں سویڈن کے اُن ۱۶۹ مقامات کے نام بتائے ہیں جہاں سے یہ نقود برآمد ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر ہالنس ہلڈ برانڈ نے سنہ ۱۸۷۳ء میں عربی نقرئی سکّے جزیرہ جوٹلینڈ۔ (عوتلاندہ) میں معلوم کئے جن کی تعداد ۱۳ ہزار سے زاید تھی۔

بلغاریہ، جرمن، نارمنڈی، انگلستان، اسکونیا وغیرہ میں ایسے نقود پائے گئے ہیں جن پر خوشخط کوفی حروف منقوش ہیں۔"

(الزہرا)

مستقبل کا اخبار

سر رابرٹ ڈونالڈ نے لندن کے سسل ہوٹل میں روٹری کلب کے لنچ کے موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ "مستقبل کا اخبار صرف واقعات کی چھوٹی چھوٹی تصاویر پر مشتمل ہوگا۔
یہ تصاویر انہی مقامات سے جہاں سے کہ وہ لیجائے گی، براہ راست خریداروں کو بھیجدی جایا کرینگی۔

اسلامی جذبۂ خودداری

استاذ جبرتی اپنی تاریخ اسلام میں ۲۰ ربیع الاوّل ۱۲۱۳ھ کے حوادث میں رقمطراز ہیں:-
"بوناپارٹ کے امیر الافواج نے مشائخ مصر کو طلب کیا۔ جب وہ آکر اس کے سامنے کھڑے ہوگئے تو بوناپارٹ مجلس سے اُٹھہ گیا اور جب واپس آیا تو اس کے ہاتھہ میں تین قسم کی رنگین چادریں تھیں۔ ہر چادر تین گز کی تھی۔ سفید، سُرخ اور سرمئی، ان میں سے ایک چادر اس نے شیخ شرقاوی کے کندھے پر رکھدی شیخ نے خفا ہو کر وہ چادر زمین پر گرادی انکا مزاج برہم اور چہرہ کا رنگ متغیر ہوگیا۔ تو ترجمان نے عرض کی کہ یا حضرت مشائخ آپ ہمارے سپہ سالار صاحب کے دوست بنائے گئے ہیں اس لئے وہ اس طرح آپ کی تعظیم و تکریم کرنا چاہتا ہے۔ اس علامت سے آپ وہ امتیاز حاصل کرلیں گے کہ عوام اور فوجی لوگ آپکی تعظیم کریں گے اور اُن کے دل میں آپ کی وقعت بڑہجائیگی۔ ان بزرگوں نے جواب دیا:-
"مگر ہماری قدر و منزلت خدا کے ہاں اور ہمارے برادران اسلام کے نزدیک یقیناً خاک میں مل جائے گی۔!"
کیا موجودہ زمانہ کے حضرات مشائخ بھی ایسے ہی جذبۂ اسلامی و جوش مذہبی سے متاثر پائے جاتے ہیں؟

(الزہراء)

زبان

جلد ۱ — فہرست مضامین ماہ اگست سنہ ۱۹۲۶ء — نمبر ۲

صفحۂ ادارت

رسالہ "زبان" صرف علمی خدمت کے خیال سے جاری کیا گیا ہے اسمیں کسی طرح کی طلب منفعت کا شائبہ تک نہیں ہے مگر اعلیٰ علمی مضامین کی بہم رسانی ایک ایسا دشوار گذار مرحلہ ہے جس سے ہر مدیر رسالہ کو دوچار ہونا پڑتا ہی ہمنے قلمی اعانت کے لئے بعض اہل قلم سے متعدد درخواستیں کی ہیں مگر اُنھوں نے ابتک "جنبش قلم" سے ہمکو ممنون نہیں فرمایا ہم ملک کے لائق اہل قلم اور انشاپردازوں سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ خالص علمی تاریخی وادبی مضامین ارسال فرمائیں جو حضرات معاوضہ پر مضامین دینا چاہیں گے ہم انکی خدمت میں معقول معاوضہ بھی پیش کرنے کو حاضر ہیں جو ذریعہ خط وکتابت طے ہوسکتا ہے۔

اقبال کرم می گزد ارباب ہمم را
ہمت نہ خورد نیشتر لا و نعم را

قارئین کرام کو یاد ہوگا کہ موقر ہمعصر معارف (اعظم گڈھ) نے مرہٹی انسائیکلوپیڈیا کا نوٹس لیا تھا اور اُن غلط الزامات اور گستاخانہ تحریرات کی طرف اس کے مدوّن کو توجہ دلائی تھی جو پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق کتاب مذکور میں (عمداً یا سہواً) درج کردی گئی ہیں۔ حال میں ہمارے مکرم جناب سید نواب علی صاحب پروفیسر بڑودہ کالج نے انگریزی روزنامہ بمبئی کرانیکل میں ایک مقالہ تحریر فرمایا ہے جسمیں اُنھوں نے ان غلط الزامات اور گستاخانہ الفاظ کی تردید کرتے ہوئے مدوّنِ انسائیکلوپیڈیا کے اس "عذر لنگ" کا کافی جواب دیا ہے جو اس نے امور متنازعہ فیہ کی نسبت پیش کیا تھا یعنی کہ ان معلومات کا ماخذ مشہور دشمن اسلام مارگولیتھ کی تصنیف ہے۔

کسقدر شرم وافسوس کی بات ہے کہ خالص علمی تحریرات میں بھی ہمارے ہندو بھائی اس قسم کی ناشائستہ حرکتوں سے باز نہیں آتے کیا یہی باتیں شیرازۂ قومیت واتحاد کو محکم کرنے والی ہیں؟

ہمیں یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی ہے کہ اعلیحضرت حضور نظام دکن (خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ) نے قلمروئے آصفیہ میں اس انسائیکلوپیڈیا کے داخلہ کی ممانعت کردی ہے ہمیں اُمید ہے کہ اور مُسلمان والیان ریاست حضور نظام کی تقلید میں اس قسم کی منافرت انگیز کتابوں کو اپنی حدود میں آنے سے باز رکھیں گے جو باشندگان ہند کے جذبات واحساسات کو بھڑکاکر نفرت و

عداوت کی خلیج کو وسیع تر کر دینے والی ہیں۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے اکثر حملے ہوس ملک گیری۔ بت شکنی اور لوٹ مار کی غرض سے معرض وجود میں آئے ہیں لیکن اس بات کی کبھی تحقیق نہیں کیجاتی کہ اصل اسباب کیا تھے اور کن وجوہ کی بنا پر مسلمان سلاطین کو ہندو راجاؤں پر فوج کشی کرنی پڑی۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ان کے ظلم و تشدد سے تنگ آئی ہوئی مسلمان رعایا کی فریاد پر ان مسلمان سلاطین کو انکی گوشمالی کرنی پڑی ہے۔

چنانچہ ہمیں اپنے دعوی کے ثبوت میں ایک مستند و معتبر تاریخی دستاویز پیش کرنی ہے جو فتح جوناگڈھ کے اصل سبب پر کافی روشنی ڈالتی ہے یہ ایک خط ہے جو منگرول کے ایک مشہور بزرگ حضرت سید رکن الدین المعروف بہ سید راجو صاحب نبیرہ حضرت سید سکندر بن مسعود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کیطرف سے انکے پیر و مرشد قطب الاقطاب حضرت شاہ عالم (ولادت ۸۱۷ھ وفات ۸۸۰ھ) قدس اللہ سرہ العزیز کے نام فارسی میں بخط عربی احمدآباد لکھا گیا ہے اسمیں انہوں نے راجہ را مانڈلیک حاکم سورٹھ (در کاٹھیاواڑ) کے مسلمانوں پر ظلم و تشدد کے حالات تحریر فرمائے ہیں اور عرض کی ہے کہ اس طرف سلطان محمود (بیگڑہ) کی توجہ مبذول کرائی جائے تاکہ وہ حملہ آور ہوکر اسکے شر و فساد کا قلع و قمع کردیں اسی خط کی پشت پر حضرت شاہ عالم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جواب درج ہے جسمیں آپ نے کاتب کو اطمینان دلایا ہے ۔ یہ مکتوب گرامی اس وقت یہاں (منگرول) کے سجادہ نشین سید محمد صاحب مدظلہ، کے پاس موجود ہے جو حضرت سید سکندر بن مسعود (جہانیاں جہانگشت) کی اولاد میں سے ہیں۔ اس خط کے دونوں طرف کے فوٹو لئے گئے ہیں جو ہم انشاءاللہ کسی آیندہ اشاعت میں شائع کریں گے۔

زبان کے رفقائے کار میں سب سے زیادہ ہمارے شکریہ کے مستحق حضرت شاہ دستگیر صاحب ہیں جنھوں نے نہ صرف ہمیں طباعت کے ناقابل بیان مخمصات ہی سے سبکدوش کردیا ہے بلکہ "زبان"، میں جو حسن ترتیب اور حسن اہتمام نظر آرہا ہے وہ سب آپ ہی کی بے لوث جگر کاوی و مخلصانہ سعی بلیغ کا نتیجہ ہے۔ جس کے لئے ہم شاہ صاحب کے نہایت ممنون و مشکور ہیں۔

اڈیٹر

زبان

ماہ اگست سنہ ۱۹۲۶ء

مقالات

علم اور اسلام

(مولینا مولوی محمد اسمعیل صاحب اصلاحی اعظم گڈھی)

یہاں تک تو موسیو رینان کے حالات زندگی تھے۔ اب ہم اس کے فلسفہ اور خیالات پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

پروفیسر رینان فرانسیسی مصنفین میں اپنی مخصوص فصاحت و بلاغت اور طلاقت کلام اور اہم مباحث و مضامین کے لحاظ سے جسے قوم نے ہاتھوں ہاتھ لیا ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے اسی سئے اس کی تصنیفات۔ تالیفات اور رسائل کا شمار فرانس کے کثیر الاشاعت اور ہر دلعزیز لٹریچر میں ہوا۔ اور پبلک میں انھیں یہانتک اعتبار حاصل ہوا کہ اس کی بعض کتابوں (مثلاً السیرۃ المسیحیہ) کے چودہ ایڈیشن تک کی نوبت آئی جس کا شمار فرانس کی اعلیٰ بلیغ کتابوں میں ہے۔ اسکی کتاب "تذکار الصبا و الصقولیہ" اور کتاب "شقیقی" (ہنرئیٹ) بھی اسی قسم کی کتابیں ہیں۔ جو چودہ چودہ مرتبہ چھپیں۔

پروفیسر رینان اپنے زمانے میں "مذہبیات" کا سب سے بڑا عالم تھا اور سامی السنہ، علوم، تاریخ، معتقدات اور اخلاق کی زبردست واقفیت کے ساتھ مذہبی مسائل پر نہایت آزادی کے ساتھ بحث کیا کرتا تھا۔ جیسا کہ آیندہ اوراق میں نظر آئے گا۔

جب وہ کسی مسئلہ کی مدافعت کرتا جسے وہ اپنے ضمیر اور اذعان کے فیصلہ سے (تقلید یا آبائی عقیدے سے نہیں) ضروری سمجھتا تو اس کو اس خوبی سے انجام دیتا کہ علمائے یورپ میں معدودے چند ہی لوگ ایسے ہیں جو اس درجہ کو پہنچ سکتے ہیں۔

رینان کی حالاتِ زندگی میں سب سے زیادہ عجیب و غریب بات یہ ہے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے اپنی تمام

زندگی گرجا کی چار دیواریوں اور حجروں میں بسر کی اور وہ پہلا شخص ہے جس نے اپنی مذہبی کتب اور اصول کا بہ نظر تعمق مطالعہ کیا اور وہ پہلا شخص ہے جس نے انجیل کی اصل زبانوں کو پڑھا اور اس میں دست گاہِ کامل پیدا کی باوجود ان تمام باتوں کے وہ پہلا شخص ہے جس نے دین مسیحی کو خیر باد کہا۔

میرے خیال میں رینان کے ارتداد کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مسیحی پادری فلسفہ کے مخالف تھے بلکہ بڑی اور اصل وجہ یہ ہے کہ اس نے غیر مذاہب کی تعلیمات اور اصول سے واقفیت پیدا کی۔ اور پھر ان کا آپس میں موازنہ کیا ع

"ویضدّھا تتمیز الاشیاء"

اور یہی اصول موازنہ ہے جسے حکمائے اسلام (فلاسفۂ اسلام) نے میزان قرار دی ہے اس لئے کہ انہوں نے مذہب اسلام کو تقلیداً یا وراثتاً قبول نہیں کیا تھا جیسا کہ بعض اُن لوگوں کا خیال ہے جنہوں نے فلاسفہ اسلام کی کتابیں نہیں دیکھی ہیں بلکہ انہوں نے اسلام کو اس صداقت کی وجہ سے قبول کیا تھا جو ان میں اسلام اور دیگر مذاہب میں موازنہ کرنے کے بعد نظر آئی تھی۔

خلاصہ یہ کہ پروفیسر رینان نے ایک مذہبی مصلح (رفارمر) کی طرح تجدید مسیحیت کے سلسلہ میں عظیم الشان خدمات انجام دیں اور قوم کو حقیقی مسیحیت کی دعوت دی جو اس کے خیال کے مطابق عقاید کے لحاظ سے توحید باریتعالے بلا شرکت غیرے اور اعمال کے لحاظ سے صفائی باطن اور پیروی حق و انصاف پر مشتمل ہے۔

موسیو رینان نے قدیم مسیحی کتابوں کے بحث و تحیص کر کے پرخچے اُڑا دیے اور عقل و رایتی کو حکم قرار دیا جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کے زبردست اور خالص اصولِ توحید کو تسلیم کرنا پڑا۔

اور یہی وہ نکتہ ہے جہاں سب کو سرنگوں ہو جانا پڑا ہے چاہے وہ اسلام کے فلاسفہ و متکلمین ہوں یا یورپ کے روشن خیال مسیحی مصنفین اور دہرئیے۔ لیکن اس بات کی دلیل کہ کائناتِ عالم کا کوئی رب اور خالق ہے یہ ہے کہ خود عقل انسانی کسی طرح یہ تسلیم نہیں کرتی کہ کائنات کی علت صرف مادہ ہو جو محض ایک جسم بیجان ہے یا متکلمین کے الفاظ میں یوں کہئے کہ بغیر مؤثر کے کسی اثر کا پایا جانا ناممکن ہے اور یہی تقاضائے عقل بھی ہے۔ رینان کی یہ ایک فلسفیانہ رائے ہے کہ کائنات اور انسان کی ترقی جس پر تمام مباحثِ فلسفہ کا مدار ہے۔ صرف عقلی اور دماغی فلسفہ سے ناممکن ہے بلکہ یہ بات علومِ حسیّہ مثلاً ریاضیات۔ طبیعیات۔ کیمیا۔ تاریخ اور علم الالسنہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔

اسلام کے متعلق رینان کی خاص رائے اس کے اس قول سے صاف ظاہر ہوتی ہے وہ کہتا ہے

کہ :-

"اپنی زندگی میں جب کبھی میں مسلمانوں کی مسجدوں میں داخل ہوا ہوں تو میں نے اپنے اندر اسلام کی طرف ایک خاص کشش محسوس کی بلکہ مجھے اپنے مسلمان نہ ہونے پر افسوس ہوا"

رینان اپنی کتاب ابنِ رشد اور اس کا فلسفہ کے صفحہ ۱۶۳ پر لکھتا ہے کہ :-

"ہمارے پاس ابن رشد کو ایک مخلص مسلمان نہ تسلیم کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے خصوصاً ایسی حالت میں کہ اسلام کے متعلق جو کچھ تھوڑی بہت معلومات ہمیں حاصل ہیں ان کو اسلام کے خالص عقائد اور تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں اور خود اسلام ہی ان باتوں کو غیر معقول اور لغو قرار دیتا ہے ۔ اسلام کے عقائد تو نہایت صاف ستھرے اور صحیح خیالات کا مجموعہ ہیں"

جو شخص رینان اور امام غزالی رح کے حالات کا باہم مقابلہ کرے گا اسے نظر آئیگا کہ رینان یورپ کا غزالی تھا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اول الذکر نے مذہب کو چھوڑ کر تسکین قلب پائی اور موخر الذکر کو یونان کی پیچ در پیچ گتھیوں سے الگ ہوکر مذہب میں راہِ حق ہاتھ آئی۔

موسیو رینان کا لکچر

موسیو رینان نے پیرس کے سربون کالج میں علمائے فرانس کے سامنے "اسلام اور علم" کے عنوان پر ایک بسیط لکچر دیا جس کا ملخص حسب ذیل ہے :-

آج میں آپ لوگوں کے سامنے ایک اہم اور دقیق علمی مسئلہ پر بحث کرنا چاہتا ہوں جسکی تحقیق نہایت ضروری ہے اس لئے کہ مورخین کی سہل انکاری نے اس میں بہت کچھ غلط فہمی پیدا کر دی ہے پروفیسر مذکور اپنی تقریر کی ابتدا کرتے ہوئے کہتا ہے کہ :-

مورخین نے بلا سوچے سمجھے محض سہل انکاری سے کام لیکر بعض خاص خاص چیزوں کو خاص خاص اقوام سے منسوب کر دیا ہے جس سے اصل حقیقت پر بہت کچھ پردہ پڑ گیا ہے مثلاً انھوں نے یونانی رومی اور عرب سے ان اقوام کو تعبیر کیا ہے گویا وہ اپنے اصل حالات اور خصائص پر قایم ہیں۔ انھوں نے اس کی بالکل پرواہ نہیں کی کہ امتداد

زمانہ نے ان کے حالات میں بہت کچھ تبدیلی پیدا کر دی ہے بلکہ بسا اوقات وہ اپنے قدیم اور گذشتہ حالات سے یکسر متباین ومتغائر ہو گئی ہیں اور ملکی فتوحات مذہبی انقلابات اور دوسرے اہم واقعات و تصرفات جو نوع انسان کی تاریخ میں آئے دِن پیش آیا کرتے ہیں اس عظیم الشان اور زبردست انقلاب کا باعث ہوتے ہیں۔

حالات کا اقتضا ہے کہ ہم اس مسئلہ میں نہایت امعان نظر اور عمیق غور و فکر سے کام لیں مثال کے طور پر ہم، اہل فرانس زبان کے اعتبار سے رومی، تہذیب اور تمدن کے اعتبار سے یونانی، اور مذہب کے اعتبار سے یہودی ہیں یہ اور قوموں کا خاندانی اور نسلی امتیاز باوجود اپنی زبردست اہمیت اور اپنی اصل کی واقفیت کے مرور حوادث، امتداد زمانہ، اور انقلاب اقوام سے اثر پذیر ہوتا رہتا ہے، مثلاً یونانیوں کا تمدن، رومیوں اور جرمنوں کی فتوحات، عیسائیت اور اسلام کا ظہور زمانہ انتعاش علوم عہد فلسفۂ جدیدہ اور انقلاب فرانس اس قسم کے حوادث اور واقعات جب دُنیا میں رونما ہوتے ہیں تو قوموں کے امتیازی خصوصیات اور ان کے ممتاز عادات و اطوار میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو جاتا ہے بلکہ ان کی خصوصیتیں بڑی حد تک مٹ جاتی ہیں اور وہ آپس کی کثرتِ اختلاط اور میل جول سے تقریباً ایک ہی قوم بن جاتی ہیں اب ہم اسی قسم کی ایک تاریخی سہل انکاری پر کسی قدر تفصیل سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔

آجکل عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ عربوں کے علوم، عربوں کے فنون، عربوں کا تمدن، عربوں کا فلسفہ، مسلمانوں کے علوم، مسلمانوں کا تمدن وغیرہ وغیرہ اس سے ایک عالمگیر غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے اور بکثرت غلط خیالات کی اشاعت ہو گئی ہے جو شخص ہم اہل یورپ کے حالات سے تھوڑا بہت بھی واقف ہے اسے معلوم ہوگا کہ آجکل اسلامی ممالک اسلامی سلطنتیں کسقدر انحطاط اور تنزل کی حالت میں ہیں اور مختلف قومیں جنھوں نے اس دین کو قبول کیا کیسی جہالت اور تاریکی میں مبتلا ہیں۔

جس نے مشرقی افریقہ کا سفر کیا ہے اسے معلوم ہے کہ وہاں کے (مسلمان) لوگ کسقدر احمق اور بیوقوف ہوتے ہیں، مذہب ان کے دل و دماغ پر پردہ ڈال دیتا ہے اس لئے وہ جدید علوم و فنون سے بے بہرہ رہتے ہیں اول تو ان کے بچے ذہین اور سمجھدار ہوتے ہی بہت کم ہیں لیکن جب وہ دس بارہ برس کی عمر کو پہونچتے ہیں اور مذہبی عقائد سیکھ لیتے ہیں تو پھر سخت متعصب ہو جاتے ہیں اور اُن کو اس میں اسقدر غلو ہو جاتا ہے کہ اپنے علاوہ سب کو وہ احمق سمجھتے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہوتا ہے بس صرف وہی حق پر ہوتے ہیں اور اسلئے وہ اپنے آپ کو بہت خوش قسمت اور مبارک سمجھتے ہیں در اصل یہی ان کے انحطاط اور تنزل کا باعث ہے

یہی تفاخر اور خود ستائی مُسلمانوں کی بدترین عادت ہے اور اسی لئے اُن کو اپنی عبادتوں میں بھی ایسی باتیں نظر آتی ہیں جس سے وہ غیر مذاہب کو ذلیل اور حقیر سمجھنے لگتے ہیں اور چونکہ "توکل علی اللہ" اُن کا عقیدہ ہے کہ خداوند تعالےٰ جس کو چاہے بغیر کوشش وسعی کے فضل وکمال عطا کرتا ہے جس کو چاہتا ہے بغیر محنت ومشقت کے ملک و سلطنت بخشتا ہے اس لئے وہ تعلیم اور صنعت وحرفت کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہوتے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ علوم وفنون اور یورپ کی موجودہ ترقیات سے کوسوں دور ہیں اور مُسلمانوں کے انہیں خصائل وعقاید نے جو مذہب نے ان میں پیدا کردی ہیں، باوجود اُن کے مختلف الاقوام ہونے کے انہیں بالکل اندھا اور گمراہ کررکھا ہے اس لئے کہ جب ایک بربری یا سوڈانی یا مراکشی یا افغانی مُسلمان ہوجاتا ہے تو اس کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ اپنے ملک یا قوم کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرے بلکہ اس کا انتساب اب صرف اُس کے مذہب کی طرف ہوگا۔

لیکن ایرانی اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ اُنہوں نے اپنی قبل از اسلام کی قومی خصوصیات کو برقرار رکھا ہے اسی لئے ان کو مسلمان نہیں بلکہ شیعہ کہتے ہیں۔

اسلام کی موجودہ نازک حالت نے بعض لوگوں کو آمادہ کردیا ہے کہ وہ مُسلمانوں کے گذشتہ حالات کو پیش نظر رکھ کر ان کے اس انحطاط کا سبب مذہب کو نہیں بلکہ کسی خارجی شے کو قرار دیں (اسلام کی موجودہ نازک حالت کو دیکھ کر بعض لوگوں نے مُسلمانوں کے اس انحطاط کا سبب ان کے مذہب کو نہیں بلکہ کسی خارجی شے کو قرار دیا ہے اور اس کی دلیل میں وہ مُسلمانوں کے گذشتہ حالات کو پیش کرتے ہیں) اس لئے کہ اسلامی تمدن جو اس وقت رو بہ تنزل ہے زمانہ قدیم میں ترقی کے اعلیٰ اور بلند مدارج پر پہونچا ہوا تھا اس میں علمار تھے فلاسفہ تھے اور ایک زمانے تک اُنہیں مسیحی یورپ پر حاکمانہ اُستادانہ اور معلمانہ شرف حاصل رہا ہے لیکن میں کہتا ہوں کہ اگر پہلے تھا تو اب کیوں نہیں ہے یہی وہ سوال ہے جسے میں اپنا موضوع بحث بنانا چاہتا ہوں۔

کیا حقیقتاً علوم اسلامیہ کا کوئی وجود ہے یا کم سے کم یہ کہ اسلام نے انہیں قبول کیا اور اُن کی اشاعت کی اجازت دی؟ بیشک بعض وجوہ سے اس کا جواب اثبات میں صحیح ہے اسلئے کہ ۷۷۵ء سے لیکر تیرہویں صدی کے وسط تک پانسو برس کے زمانے میں اسلامی ممالک میں بڑے بڑے علمار فضلار اور ارباب فکر موجود تھے جو اہم علمی مسائل میں دوسروں کی رہنمائی کرتے تھے اور اسلامی ممالک کو مسیحی ممالک پر بہت کچھ بلندی وبرتری حاصل تھی اس موقع پر غلط فہمی سے بچنے کے لئے ہمیں ذرا تشریح اور تفصیل سے کام لینا چاہئے اس کے لئے ہم کو مشرق کی عہد بہ عہد کی تاریخ کی نہایت احتیاط سے ورق گردانی کرنی ہوگی تاکہ ہم اس ترقی (وار تفاع) کے صحیح اسباب کا پتہ لگاسکیں

جو اسقدر مبدل بہ تنزل ہوگئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کا قرونِ اول علوم اور فلسفہ سے بہت دور رہا (تھا) اس لئے کہ اسلام ان مذہب کے تنازعات دینی کا نتیجہ ہے جو قرون ماسبق میں پائے جاتے تھے اور لازمی طور پر عربوں نے اسلام قبول کرتے ہی ان تمام مختلف اعلیٰ اور بلند عقائد وخیالات (کو خیرباد کہدینے) سے الگ ہوئے جن میں سے بعض توحید الٰہی کے بھی قائل تھے اور یہی وجہ ہے کہ وہ تمام علوم عقلیہ سے بہ مراحل دور ہوگئے بیشک بہادران عرب جو اسلام کی رہنمائی میں ملک پر ملک فتح کرتے جاتے تھے اس وقت شجاعت اور بہادری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے لیکن ساتھ ہی یہ بھی قطعی طور پر ثابت ہے کہ وہ فلسفہ سے بہت ہی کم واقف تھے بعض مشرقی مصنفین مثلاً ابوالفرج[1] نے عربوں کی طباعی اور ذہانت پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جن علوم پر عربوں کو فخر تھا وہ لغت۔ عروض۔ قیافہ اور انشا کے علوم تھے اور فلسفہ کی تو خدا نے ان میں اہلیت ہی نہیں پیدا کی۔

اور درحقیقت بھی یہی ہے کہ عرب کے بدو جہاں زباندانی اور فصاحت میں تمام دنیا پر فوقیت رکھتے تھے وہاں اشیاء کی حقایق و ماہیت پر غور وفکر کرنے میں سب سے پیچھے تھے، ایک متدین عرب حوادث عالم کے اسباب وعلل پر بحث کرتے ہوئے صرف یہ کہہ کر اکتفا کرتا تھا کہ:۔

"اللہ تعالےٰ عالم کا پیدا کرنے والا ہے اور تمام معاملات اسی کے ہاتھ میں ہیں، وہ ہماری ہدایت کے لئے انبیاء کو بھیجتا ہے جو ہمیں سیدہا رستہ بتاتے ہیں"

یہی وجہ ہے کہ جب تک اسلام صرف عربوں کے اندر رہا یعنی خلفاء راشدین، اور بنی امیّہ کے زمانے میں مذہب کے باہر (خارج از مذہب) ایک بات بھی نہیں کہی جاتی تھی، اگرچہ (حضرت) عمرؓ نے کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی کا حکم نہیں دیا جیسا کہ عام طور پر مشہور ہے، لیکن اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ دنیا میں اسلام کے غالب ہوتے ہی اُنھوں نے اُن تمام ممکن علمی وسائل و ذرائع کو تلف کردیا جن سے مباحث علمیہ کا امکان تھا۔

۷۵۰ء میں جبکہ ایران نے اپنی پوری طاقت کے ساتھ بنی امیہ کے خلاف بنی عباس کی امداد کی اور اس طرح حکومت عباسیوں کے ہاتھ آئی تو تمام حالات میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہوگیا،

اور مرکز اسلام منتقل ہوکر دجلہ اور فرات کے مرغزاروں میں آیا جہاں مشرق کے قدیم ایرانی۔ ساسانی تمدن

[1] ابوالفرج الملیطی ایک مسیحی مورخ ہے جو سنہ ۱۲۲۶ء میں ملاطیہ میں پیدا ہوا اس نے یونانی فارسی اور عربی کتابوں سے مدد لیکر سریانی زبان میں ایک تاریخ لکھی ہے عربی میں مختصر الدول کے نام سے اس کی تلخیص موجود ہے (مترجم)

کے باقیات الصالحات بہت کچھ محفوظ تھے، جو کسریٰ انوشیرواں کے زمانہ میں ترقی اور ارتفاع کے اعلیٰ مدارج پر پہونچے ہوئے تھے صنعت و حرفت سالہا سال سے ترقی کر رہی تھی، اور انوشیرواں نے تو سنسکرت کی علمی کتابوں کا ترجمہ اور یونانی فلسفہ کی تعلیم عام کر کے اس بڑہتی ہوئی ترقی کو چار چاند لگا دیئے، اس زمانہ میں قسطنطنیہ کے بعد ایران، فلسفہ، یونان کا مرکز ہو رہا تھا،

(یہ ایران) اور اس کے گرد و نواح کے اکثر باشندے نسٹورین عیسائی تھے، جن کو علم طب اور فلسفہ یونان میں یدطولیٰ حاصل تھا، اور ان کے پادری اور پیشوا علم ہندسہ اور منطق کے ماہر تھے، فارسی کے اُن قصائد میں جنہیں رستم کے واقعات کو شہرت دی گئی ہے، تم دیکھوگے کہ جب انہیں کوئی پل بنانے کی ضرورت ہوتی تھی وہ "چاتلیک" سے دعا مانگتے تھے، اور لفظ "چاتلیک" ([illegible]) نسٹورین عیسائیوں کے مذہبی پیشواؤں اور پادریوں کے لئے بولا جاتا تھا، لیکن جب یہاں اسلام آیا تو اس نے ایران کی ان روز افزوں ترقیوں کو ایک صدی تک بالکل روک دیا، مگر جب عباسیوں کا غلبہ اور ظہور ہوا تو لوگوں کو خیال ہوا کہ اب تمدن اکابرہ پھر بحال ہو جائیگا، اسلئے کہ ارباب حل و عقد جنہوں نے عباسیوں کو تخت و فوج کا مالک بنایا تھا یہی ایرانی تھے، یہی وجہ ہے کہ ابو العباس اور خصوصاً منصور کی مجلسیں ان سے کبھی خالی نہیں ہوئی تھیں، سلطنت کے وزرا اور مشیر اور خلفا کے بچوں کے معلم و اتالیق خاندان برامکہ کے لوگ ہوتے تھے، یہ خاندان ایران کا قدیم خاندان ہے جس کی بنیاد صاحب کمال اور اہل علم آبا و اجداد کے ہاتھوں پڑی تھی، یہ لوگ اپنے آبائی دین پر قائم رہے اور بہت سے اسلام لے آئے، وہ بھی بغیر کسی گہرے اعتقاد کے،

ان میں نسٹورین عیسائی کو ضعیف المذہب خلفاء عباسیہ کے درباروں میں تقرب خاص حاصل تھا اور وہ ان کے اول درجہ کے شاہی اطبا میں داخل تھے، شہر حرّان سے جہاں قدیم یونانی علوم و فنون کے بہت کچھ آثار باقی تھے، علما و فضلا خصوصاً ماہرین فلکیات کی ایک کثیر جماعت نکلی جو کسی مذہبی عقائد کے پابند نہ تھے اور انہیں لوگوں نے شہر بغداد کی بنا ڈالی جو دولت عباسیہ کا دار الخلافہ تھا، اور جو درحقیقت ایک ایرانی سلطنت تھی، لیکن جس طرح مذہب اسلام سے کلیتہً الگ رہنا ان کے لئے ناممکن تھا، اسی طرح فاتحین کی عربی زبان کو فارسی کر دینا بھی آسان نہ تھا، لیکن اس میں شک نہیں کہ تمدن مخلوط ہو گیا اور نصاریٰ و مجوس سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز تھے، اور عیسائیوں کو خصوصیت کے ساتھ نظم و نسق کے ذمہ دارانہ عہدے سپرد کئے جاتے تھے، یہاں تک کہ مشہور خلفاء منصور، ہارون الرشید اور مامون الرشید کے اسلام میں لوگ

شک کرنے لگے، یہ لوگ حقیقتہً نہیں صرف ظاہر میں اپنے مذہب کے پابند تھے، اور ہر شے خصوصاً اجنبی اشیا کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے بڑے شایق تھے، چاہے وہ بت پرستوں اور ہندیوں کی ہوں یا ایرانیوں اور یونانیوں کی،

کبھی کبھی ان کے مذہبی علما اس معاملہ میں تعرض کرتے تو خلیفہ کو مجبوراً اپنے کافر اور ملحد احباب سے الگ رہنا پڑتا، لیکن جونہی اس مذہبی تعرض کا اثر زائل ہوا اور علما غافل ہو گئے، بس پھر فوراً ہی وہ ان لوگوں سے اختلاط اور میل جول شروع کر دیتے،

یہ بغداد کے عجیب و غریب زمانہ شباب کے تمدن کا ذکر ہے جس کا تصور عام لوگ قصہ الف لیلہ سے کر سکتے ہیں، وہ زمانہ ایسا تھا کہ ظاہر میں تو بیشک مذہبی معاملات پر تشدد تھا لیکن باطن میں کچھ نہیں تھا، اور بڑی آسانیاں حاصل تھیں اسی لئے اس وقت مختلف صنعتیں اور متعدد علوم لطیفہ عالم وجود میں آئے ارباب حکومت کی عام مذہبی سہل انکاریاں اس حد تک پہنچ گئی تھیں کہ فاسق اور فاجر تک کو عزت و رتبہ دیتے اور اپنا مقرب بناتے، حالانکہ ان کے مذہبی احکام کا اقتضا تھا کہ ایسے لوگوں کی تنبیہ اور سزا کی جائے،

انہیں خلفاء کے زمانے میں مذہبی معاملات میں عام طور پر تسامح اور چشم پوشی سے کام لیتے تھے، اور کبھی اپنی اس پالیسی پر افسوس بھی کرتے تھے، غرض کہ الحاد پھیلا اور متکلمین مذاہب، اور ادیان پر عقلاً بحث و مناظرہ کے لئے جلسے منعقد کرنے لگے،

یہاں میں اس قسم کے ایک جلسہ کے متعلق اندلس کے ایک متقی عالم کے بیان کا ملخص دیتا ہوں جس کا ترجمہ موسیو ڈوزی نے کیا ہے:-

"حکیم قیروانی نے ایک اندلسی عالم سے جو بغداد سے واپس آئے تھے، پوچھا کہ کیا تم متکلمین کے جلسوں میں شریک ہوئے تھے؟ اندلسی عالم نے جواب دیا کہ ہاں میں صرف دو مرتبہ شریک ہوا تھا، لیکن پھر نہیں گیا، حکیم قیروانی نے کہا یہ کیوں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ "پہلے پہل میں جس جلسہ میں شریک ہوا اس میں میں نے دیکھا کہ سنی اور معزول مسلمانوں کے علاوہ ملاحدہ، مجوس، دہریئے، یہود، اور نصاریٰ سبھی بیٹھے ہوئے ہیں خلاصہ یہ کہ ہر قسم کے کفار کا وہاں ایک جم غفیر موجود تھا، اور جلسہ میں ہر فرقہ کا ایک پیشوا یا رئیس تھا جو اپنے مذہب کی نمایندگی کرتا تھا، اور جب کوئی رئیس جلسہ میں آتا تو تمام حاضرین اس کے احترام کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے اور جب تک اپنی جگہ پر وہ بیٹھ نہ جاتا سب کے سب کھڑے رہتے تھے جب حاضرین کی تعداد پوری ہو گئی تو ان میں سے ایک کافر اٹھا اور اس نے

یوں تقریر شروع کی:۔

"حضرات! ہم لوگ یہاں پر صرف عقلی مناظرہ کے لئے، جمع ہوئے ہیں اور آپ تمام حضرات کو اس کے شرائط بخوبی معلوم ہیں، پس میں مسلمان بھائیوں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ کوئی ایسی دلیل نہ پیش کریں جو ان کی مذہبی کتاب یا اقوال نبی سے ماخوذ ہو، اس لئے کہ ہم ان کی مذہبی کتاب اور ان کے نبی کو نہیں مانتے پس ہمارا فرض ہے کہ ہم صرف عقلی دلائل پر اکتفا کریں۔"

"تمام حاضرین نے اس کی تائید کی اور اس کے ثبوت میں سب نے تالیاں بجائیں، یہ دیکھ کر دوبارہ شرکت کا میں نے ارادہ نہیں کیا، لیکن مجھ سے ایک مرتبہ اور شریک ہونے کے لئے، کہا گیا، میں گیا تو اس کو گذشتہ جلسہ سے بھی بدتر پایا"

مذہبی احکام کے بموجب اس موقت تعویق کے بعد شام کے مسیحی اطبار کے ذریعہ سے علوم و فلسفہ کی اشاعت ہونے لگی، اور یونانی فلسفہ کے وہ لوگ وارث ہوئے جو فلسفہ ارسطو، ریاضیات، طب اور ہیئت میں دستگاہ کامل رکھتے تھے، اور انھیں لوگوں کو عباسی خلفار نے ارسطو، جالینوس، بطلیموس، اور اقلیدس وغیرہ کی تصنیفات و تالیفات کے ترجمہ پر لگایا، خلاصہ یہ کہ تمام یونانی علوم و فلسفہ کے ترجمہ کی خدمت انہیں لوگوں کے سپرد کی گئی۔

بعض با مذاق اور پرجوش اشخاص مثلاً کندی نے اہم اور دقیق مسائل (جہاں انسانی ذہن و عقل کی رسائی بڑی مشکل سے ہوئی) پر بحث و مناظرہ شروع کر دیا، انہیں لوگوں کو فلاسفہ کہا گیا، اور اس زمانے سے یہ یونانی الاصل لفظ ہر اس شخص کے لئے استعمال کیا جانے لگا جو مذہب اور دین کی مخالفت کرتا ہو اور ہر وہ شخص جس پر اس لقب "فیلسوف" کا اطلاق ہوتا تھا ہدف مطاعن اور قابل گردن زدنی سمجھا جانے لگا، جیسے قدیم زمانہ میں لفظ زندیق تھا اور موجودہ زمانے میں لفظ "فری تھنکر" ہے۔

درحقیقت انہیں فلاسفہ کے ذریعہ سے مسلمانوں میں علوم عقلیہ کی اسقدر ترویج اور اشاعت ہوئی "اخوان الصفا" کے نام سے فلاسفہ اسلام کی ایک باقاعدہ جمعیتہ قایم ہوگئی ان لوگوں نے فلسفہ میں نہایت عمدہ اور اعلیٰ درجہ کی متعدد کتابیں لکھیں جو فلسفیانہ خیالات اور صحت مسائل کے لحاظ سے بہترین کتابیں تھیں، ان میں سے دو اشخاص فارابی اور ابن سینا کا فضل و کمال نہایت بلند مدارج پر پہونچا ہوا تھا اور ان کو علوم فلسفہ میں ید طولیٰ حاصل تھا چنانچہ

ان کا شمار چوٹی کے فلاسفہ میں ہے،

علم الفلک، اور علم النجر کو خصوصیت کے ساتھ ایران میں ترقی ہوئی، علم الکیمیا، سے اگرچہ عام طور پر علانیہ دلچسپی کا اظہار نہیں کیا جاتا تھا مگر اس کے نتائج بھی عمل تقطیر اور بارود کی صورت میں ظاہر ہوئے بغیر نہ رہے۔

مسلمانان اندلس نے اشاعت علوم اور ترقی تعلیم میں مشرقی مسلمانوں کی تمام تر تقلید کی تھی اُن کی اس علمی جدّ و جہد میں یہود بھی شریک تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بارھویں صدی عیسوی میں ابن ماجہ[1]، ابن طفیل اور ابن رشد، جیسے اولوالعزم اور بلند مرتبہ فلاسفہ پیدا ہوئے جبکہ علم و فضل کی مثال (نظیر) قرونِ ماضیہ میں نہیں ملتی۔

یہی وہ فلسفہ ہے جس کو صرف اس لئے "فلسفہ عربیہ" سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ وہ عربی زبان میں لکھا اور مدون کیا گیا، حالانکہ درحقیقت یہ فلسفہ تمام تر یونانی، ساسانی یا صرف یونانی فلسفہ کیوں کہ اس کے عناصر کلیتہً یونانیوں سے ماخوذ ہیں۔

اس زمانہ میں جو شخص یونانی علوم سے تھوڑی بہت بھی واقفیت رکھتا تھا وہ بڑا فاضل مانا جاتا تھا اس لئے کہ اس زمانہ میں یونان علوم و فلسفہ کا واحد مرکز تھا شام و عراق کی فضیلت یورپ پر صرف اس لئے مانی جا سکتی ہے کہ انھوں نے یونانی علوم و فنون کے تراجم میں پیش قدمی کی، اور اس کی یہی وجہ یہ تھی کہ اقلیدس، بطلیموس اور ارسطو کی کتابیں حران اور بغداد میں بآسانی مل سکتی تھیں اور پیرس میں وہ میسر نہ آتی تھیں۔

افسوس! صد افسوس!! کہ اہل قسطنطنیہ نے سخت بخل سے کام لیا۔ کاش وہ اُن علمی خزانوں کے معاملہ میں ہم سے بخل نہ کرتے جو ان کے پاس محفوظ چلے آتے ہیں، یا کم از کم یہ کہ آٹھویں یا نویں صدی کے ابتدا ہی میں ہمارے ہاں لسکاریس اور بیصاریوں جیسے لوگ پیدا ہو جاتے، تو ہمیں بارھویں صدی میں یونانی علوم و فلسفہ کے لئے بغداد، قرطبہ اور طلیطلہ کا دست نگر اور مرہون منت نہ ہونا پڑتا۔

لیکن فلسفۂ تاریخ کا یہ ایک راز ہے کہ جب کسی قوم کے علوم و معارف برباد اور انحطاط پذیر ہو جاتے ہیں، تو

---

[1] ابن ماجہ، یورپین مصنفین، اثمپیس (Avempace) کہتے ہیں اندلس کا نامور فلسفی جسنے سب سے پہلے علوم نظریات میں تمیز پیدا کی گیارھویں صدی عیسویں کے اختتام پر سارا قوسہ میں پیدا ہوا اور ۱۱۳۸ء میں عین عالم شباب میں چالیس برس سی بھی کم عمر میں بمقام فاس وفات پائی دیگر فلاسفۂ اسلام کی طرح اُسے بھی علم طب میں کمال حاصل تھا فلکیات کا بھی بلند مرتبہ عالم تھا ایک کثیر جماعت نے اس سے شرف تلمذ حاصل کیا جلیل القدر اسلام فلسفی ابوبکر ابن طفیل صاحب کتاب حی ابن یقظان اسُ کے تلامذہ میں ہے یہ حی ابن یقظان ابن سینا کی حی بن یقظان نہیں ہے اسلئے کہ دونوں کا موضوع بحث جداگانہ ہے اگرچہ نام میں اشتراک ہوگیا ہے (مترجم)

دوسری قوم ان میں ترقی اور جلا دیتی ہے، اور یہی ان بدقسمت اور مقہور و معتوب فلاسفہ (اسلام) کی شہرت اور مقبولیت کا واحد سبب ہے اور ضعیف الایمان وضعیف العقائد حرایبوں کے فضل و کمال کا بھی یہی سبب تھا۔

ان ہی عربی کتابوں کے تراجم نے جو یونانی سے لئے گئے تھے اہل یورپ کو یونانی علوم و فلسفہ سے روشناس کرایا اور وہ کہاں سے کہاں پہنچ گئے درحقیقت جس وقت عربوں کا آخری فلسفی ابن رشد مراکش میں بستر مرگ پر ہذیان و نسیان میں آخری سانس لے رہا تھا، یورپ اس وقت اکتساب علوم کی جدوجہد میں مصروف تھا اور ابیلارد علوم عقلیہ پر بحث و مناظرہ کر رہا تھا، اور اس طرح یورپ نے وہ کچھ حاصل کرلیا جو اس کی ذہانت کے موافق تھا، اور اس نے بتدریج اس ترقی اور انقلاب کی ابتدا کی جس کا نتیجہ تھا کہ انسانی عقلوں سے تمام پردے ہٹ جائیں۔

پیرس میں جبل جنیفیف پر ایک دار التعلیم کی بنیاد رکھی گئی، اور ہمیں صرف ان اصلی کتابوں کی ضرورت تھی جو علوم قدیمہ کے حقیقی ماخذ و مرکز میں لکھی گئی تھیں اور یہ بات بادنیٰ ظاہر ہو جاتی ہے کہ اگر یہ کتابیں بجائے عربی تراجم کے براہ راست کتب خانہ قسطنطنیہ سے حاصل کی گئی ہوتیں، تو بدرجہا بہتر تھا خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ عربی زبان یونانی تخیلات اور افکار کی ادائگی سے بالکل عاجز ہے لیکن ہمیں افسوس ہے کہ کنیسۂ روما اور کنیسۂ قسطنطنیہ کے باہمی مذہبی اختلافات اور تنازعات نے اس کا موقع نہ دیا اس سلسلہ میں اس منافرت اور جذبات بغض و عناد کو بھی شامل کرلینا چاہئے جو ۱۲۰۴ء کی جنگ کے بعد آپس میں پیدا ہو گئے تھے بایں ہمہ اگر ہم فرض کرلیں کہ ان اصل کتابوں کا ملنا ممکن تھا پھر بھی تو ہمیں تین سو برس تک انتظار کرنا پڑتا تا کہ لیففردی تابل اور یودیہ جیسے یونانی زبان کے ماہر پیدا ہو جائیں جو اصل یونانی کتابوں کا ترجمہ کرسکیں۔

انہیں اسباب کی بنا پر ہمیں اسپین سے یونانی علوم لینے پڑے جو در اصل فلسفہ یونان کے محرف اور بالکل غلط ملط تراجم تھے جیسا کہ کتبخانہ قسطنطنیہ کی اصل کتابوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔

(باقی)

اعلان

جن حضرات کی خدمت میں رسالہ زبان نموتاً حاضر ہوا ہے وہ اپنی آیندہ خریداری و عدم خریداری کی اطلاع دفتر زبان میں ستمبر کی ۱۰ تاریخ تک رد انہ فرمادیں ورنہ دوسرا نمبر قیمتاً وی۔ پی سے حاضر ہوگا جس کا وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہے۔

(مینیجر)

سیرت

(جناب محمود الحسن صاحب محمود اسرائیلی)

سیرت دنیا کی محرک طاقتوں میں سے ایک طاقت ہے۔ پاکیزہ سیرت کا مجموعہ بلند ترین نوعیت انسانی کا آئینہ دار ہے کیونکہ اس کے ذریعہ سے انسان اپنی اعلیٰ صفات سے متصف نظر آتا ہے۔ صنعت پیشہ، دیانت دار، نیک ارادہ، باوضع اور بااصول لوگ غرض ہر شعبۂ حیات میں جو عدیم النظیر اور ذکی الحس ہستیاں ہوتی ہیں انہی کی وجہ سے دنیا کو بالطبع عظمت انسانی کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے ایسی ہستیوں پر اعتماد اور ان کی تقلید کرنا ایک قدرتی امر ہے کیونکہ محاسن دنیوی کے یہی ہستیاں علمبردار ہوتی ہیں اور اگر روئے عالم پر انکا مایۂ ناز وجود نہ ہو تو یہ خاکدان عالم قابل رہایش ہی نہ رہے ذہانت ہمیشہ خراج تحسین حاصل کرتی ہے مگر سیرت دلوں پر تعظیم وتکریم کا سکہ بٹھاتی ہے اول الذکر دماغی قوت کی آوردہ ہے مگر آخر الذکر کا سرچشمہ دل ہے اور اگر ہم بنظر تعمق دیکھیں تو دل ہی حیات انسانی پر حکمراں نظر آئیگا، ذی علم ہستیوں کے مراتب قابلیت کے تناسب سے حلقہ احباب میں ہوا کرتے ہیں مگر بااصول اشخاص کی عزت ان کی خمیر کے لحاظ سے ہوتی ہے اول الذکر کی لوگ تعریف وتوصیف کرتے ہیں مگر آخر الذکر کی رہنمائی کو فخر سمجھا جاتا ہے بڑی ہستیاں ہمیشہ عدیم المثل ہستیاں ہوا کرتی ہیں کیونکہ بزرگی کا بھی فی نفسہٖ ایک معیار ہے فی الحقیقت دنیا میں اکثر لوگوں کی حیات مستعار اسقدر محدود ہوتی ہے کہ ان کی عظمت حاصل کرنے کے مواقع بہت کم دستیاب ہوتے ہیں مگر ہر شخص اپنے فرایض ایمانداری عزت شرافت اور حسب لیاقت انجام دے سکتا ہے وہ عطیات ربانی کا جائز استعمال کرسکتا ہے اور اُن کے برے مصرف سے گریز کرنے پر قادر ہے وہ اپنی زندگی کو بہترین بنانے کی سعی کرسکتا ہے وہ ادنےٰ سے ادنےٰ معاملات کو بھی صداقت انصاف، ایمانداری اور نیک نیتی کے ساتھ انجام دے سکتا ہے الغرض انسان اس دائرہ میں رہکر جو قدرت نے اسے ودیعت فرمایا ہے اپنے فرایض منصبی کو بوجہ احسن پورا کرسکتا ہے۔

گو بادی النظر میں ایک معمولی سی بات معلوم ہوتی ہے مگر فی الواقع فرایض کی انجام دہی تمام اُن صفات حسنہ کا مجموعہ ہے جن سے اعلیٰ ترین حیات انسانی اور سیرت مرکب ہے ممکن ہے کہ اسی میں دور از کار شجاعت کا فقدان ہو مگر انسان عموماً شجاع نہیں ہوا کرتے اور اگرچہ ادائیگی فرایض کا احساس انسان

کو اعلیٰ صفات سے ہمکنار کر دیتا ہے مگر بایں ہمہ اس کو معمولی اور خانگی امور سے بھی روزانہ نہایت صبر و استقلال کے ساتھ سامنا کرنا پڑتا ہے حیات انسانی عام فرائض کے مجموعہ کا نام ہے اہم ترین نیکیاں وہ ہیں جن کا ہم کو روزانہ ساتھ پڑتا ہے کیونکہ انسان کے ذریعہ ہی سے ہماری پوری آزمایش ہوتی ہے اور وہی سب سے زیادہ دیرپا بھی ثابت ہوتی ہے وہ "ظنی" فضائل جن کی تکمیل سے معمولی دل و دماغ کا انسان عاجز ہے محض تحریص و خطرات کا موجب ہوا کرتے ہیں برک کا مقولہ ہے کہ "جب تک انسانی ذہنیت کا مدار رستمانہ فضائل پر رہیگا یا تو اس میں خلاف فطرت اختلاط رونما ہونے لگے گا یا وہ فسق و فجور کا آماجگاہ بنجائے گی"۔

ڈاکٹر آباٹ اسقف کنٹربری نے جب اپنے متوفی دوست مہتمم خزانہ ملکہ الزبیتھ کی سیرت کی تعریف کی تھی تو اس کو بہ حیثیت ایک اعلیٰ مدبر یا نازک خیال شاعر کے دنیا کے روبرو پیش نہیں کیا تھا بلکہ معمولی فرائض حیات کو مدنظر رکھتے ہوئے عام انسانوں کی طرح ان الفاظ میں محاسن بیان فرمائے تھے "میرے مرحوم دوست میں کسقدر عدیم المثل نیکیاں تھیں! ان سے زیادہ کون اپنی بیوی سے محبت، اپنی اولاد سے شفقت، اپنے دوستوں سے وفاداری، اور موانست، اپنے دشمن سے رواداری اور اعتدال پسندی اور اپنے اقوال کا پاس کرسکتا ہے"۔ دراصل انسان کی اصلی سیرت اور اس کے محاسن اس طرز عمل کو دیکھکر کافی ذہن نشین ہو سکتے ہیں جو وہ اپنے قریبی عزیزوں اور دوستوں سے کرتا ہے کیونکہ بہ حیثیت مصنف مقرر یا مدبر کے اس کی سیرت کے خدوخال اچھی طرح نمایاں نہیں ہو سکتے، اگرچہ عموماً فرائض سے وہ معاملات مراد ہوتے ہیں جن سے معمولی درجہ کے لوگوں کو اپنی حیاتِ عمومی میں اکثر سابقہ پڑتا رہتا ہے تاہم اعلیٰ سے اعلیٰ سیرت کے نفوس کے لئے بھی خوئے ضبط و تحمل ان فرائض ہی کیوجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ ایسے نفوس علم و دولت یا اقتدار کے پایہ ارہوں انکے بھی بغیر انسان کے دلمیں استواری اور پاکیزہ جذبات کی افراط ہو سکتی ہے اور یہی نہیں بلکہ امین، ایمانداری، صداقت اور فرمانبرداری کے جوہر بھی ہو سکتے ہیں جو شخص اپنے فرائض کو کماحقہ انجام دینے کی کوشش کرتا ہے گویا وہ اپنی خلقت کے اصلی منشا کی تکمیل میں سرگرم ہوتا ہے اور اپنی ذات میں ان اصول کو مرتب کرتا ہے جو اعلیٰ سیرت کے حامل ہوتے ہیں دنیا میں سیکڑوں ایسے انسان ہیں جن میں بجز اعلیٰ سیرت کے کوئی اور خوبی نہیں پھر بھی وہ صرف اسی کی بدولت ایک خود مختار کی طرح اپنے ارادوں میں مستحکم و استوار نظر آتے ہیں۔

ذہانت سے پاک طینتی یا اعلیٰ سیرت کا کوئی تعلق ضروری نہیں ہے جارج ہربرٹ کا قول ہے کہ تھوڑی سی نیک زندگانی علمیت کے طومار سے کہیں افضل ہے اس سے یہ مراد نہیں کہ علم کی اہمیت کم کردی جائے

مگر مقصود یہ ہے کہ علم کو نیکی کی راہ پر لگایا جائے بعض اوقات علمیت کمینہ اطوار میں آلودہ نظر آتی ہے اعلیٰ طبقہ کے لوگ اس کے غلام بن جاتے ہیں اور ادنیٰ طبقوں میں اس سے مشیخت آجاتی ہے انسان صنعت وحرفت، علم ادب اور طبیعات وغیرہ میں کامل دسترس حاصل کرنے کے بعد بھی غریب اور جاہل کاشتکاروں کی طرح ایماندار نیک طبیعت حق گو اور فرض شناس بن سکتا ہے۔ پرتھیس نے اپنے دوست کو لکھا تھا کہ آپ مصر ہیں کہ میں ذی علم لوگوں کی عظمت کروں اس سے مجھے انکار نہیں مگر یاد رہے کہ خواہ آدمی کتنا ہی ذیعلم کیوں نہ ہو وسیع خیالی، کشادہ دلی، انصاف پسندی، تجربات عالم، اطوار کی سنجیدگی جراءت آزمائی۔ خوش اسلوبی سے کام کرنے کا طریقہ، صداقت، انس، ایمانداری اور فنافی المقصد ہوجانا ایسی صفات ہیں جن کا ان میں فقدان ہوتا ہے اور ان کی تکمیل کے لئے ان کو اور ذی علم ہونا چاہیئے۔

سروالٹر اسکاٹ جب تقریر کر رہے تھے تو سامعین میں سے ایک شخص نے اُن سے علمی تبحر کو دیگر صفات سے افضل ثابت کرنے کی کوشش کی جس کے جواب میں فاضل مقرر نے جواب دیا کہ اگر فضیلت کی دلیل تمہارا یہی اصول ہوتا تو دُنیا کیسی حقیر شے بن جاتی!! میں نے اپنی عمر میں اعلیٰ ترین تصانیف کی ورق گردانی کی ہے اور مجھے بہتیل علما و فضلا سے شرف محبت بھی حاصل ہو چکا ہے مگر یقین جانئے کہ مشکلات و مصائب کے موقعوں پر جن بہادرانہ جذبات کا اظہار اور اپنے احباب اور ہمسایوں کے معاملات میں جن سادہ مگر صداقت آمیز خیالات کو میں نے غریب بے علم لوگوں کے لبوں سے سُنا ہے وہ اہل علم لوگوں میں دیکھے نہ سُنے!! تعلیم قلب کے لئے جب تک ہم ایسا علم نہ حاصل کریں گے جس سے ہر شے چاندنی کی طرح درخشاں نظر آئے ہم کو ہر گز اپنی ضروریات اور ان کی قدر و قیمت کا احساس اور عظمت آشکار نہ ہو سکے گی سیرت کو اعلیٰ کرنے کے لئے دولت کی بہت ہی کم ضرورت ہے اس کے برعکس حقیقت یوں ہے کہ دولت سے اکثر سیرت میں پستی اور خرابی واقع ہو جاتی ہے دولت اور ابتری عیش پسندی و بدکاری میں ایک خاص رشتہ ہے ضعیف الارادہ افراد جن کو اپنی ذات یا اپنے جذبات پر قابو نہیں ہوتا دولت کے سبب حرص کے پھندے میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور فی الحقیقت یہ دولت ہی ان کی اور ان کی وجہ سے دوسروں کی ذات میں بُرائی پیدا کرنے کا سرچشمہ بنجاتی ہے اس کے برعکس کسی قدر مفلسی سے انسان کی سیرت پر مفید اثرات مرتب ہو جاتے ہیں اگر انسان محض اپنی دستکاری کفایت شعاری اور دیانتداری پر پورے طور پر کاربند ہو تو اس حالت میں بھی وہ حقیقی انسانیت کے اعلیٰ مدارج بہ آسانی طے کر سکتا ہے۔ مسٹر برن

اپنے باپ کے متعلق کہتا ہے کہ انھوں نے مجھے حکم دیا تھا کہ "اولوالعزمی دکھانا،" اگرچہ میرے پاس ایک حبہ بھی نہ تھا۔ سچ ہے نیک اور جرات آزما دل کے بغیر انسان کی قدر و قیمت ایک حبہ کے برابر بھی نہیں ہوتی۔

سیرت درحقیقت جائداد ہے مقبوضہ اشیاء میں وہ سب سے پاکیزہ چیز ہے۔ عوام کی منفعت اور انسانی عزت کے لحاظ سے وہ ایک ریاست سے کم فائدہ بخش نہیں جو لوگ اس پر قابض ہوتے ہیں گو وہ بظاہر دنیوی مال و متاع سے کافی مستفید نہ ہو سکیں مگر دنیا کی نگاہ میں ان کی کافی شہرت اور عزت ہوتی ہے اس میں کلام نہیں کہ زندگی کے خصائل حسنہ زبانِ حال سے کہتے ہیں کہ دستکاری نیکی اور سعادت کا رتبہ دنیا میں سب سے اعلیٰ اور صرف وہی افراد یہاں صف اولین میں شامل ہو سکتے ہیں جو فی الحقیقت ہر لحاظ سے نیک ہیں۔ (ترجمہ)

نوائے دلگیر

(مولینا سید نظام الدین شاہ صاحب دلگیر اکبرآبادی)

دل کو اپنے پہلے ہم اتنا شکیبا دیکھتے
شوق سے پھر اُن کا حُسن بے محابا دیکھتے

گر کے قدموں پر تمھارے جسنے آخر جان دی
تم ذرا اُس مرنے والے کا کلیجا دیکھتے

وصل کی شب نے میرا ارمانوں سے کہتا تھا کوئی
شرگیں آنکھوں کا اُن کی آج نشا دیکھتے

اک جھلک نے جسکی کر ڈالا دو عالم کو خراب
چاہتا ہے جی کہ اکدن بے پردہ جلوا دیکھتے

دوش پر وہ عنبریں زلفوں کا سایہ ڈال کر
اپنے عاشق کا ذرا دنیا سے اُٹھنا دیکھتے

اب کہاں ہے وہ دلِ مرحوم اے اہلِ نظر!
میری آنکھیں دیکھتے اور اُس کا مرنا دیکھتے

ہائے کیا دنیا کی محفل میں کوئی پرساں نہیں
عمر گذری ہے ہمیں اس دل کو تنہا دیکھتے

نشہ سے آنکھیں میں، کچھ نیند، کچھ انگڑائیاں
پھر کسی کو بزم میں یوں جلوہ آرا دیکھتے

حُسن کی تھی وہ فراوانی جہانِ حُسن میں،
صرف دو آنکھوں سے اے دلگیر کیا کیا دیکھتے

ترجمات

بعض مشہور تاریخی مغالطات کی اصلاح

فلسفۂ تاریخ کے اس اصول کے مطابق کہ "جو واقعات جسقدر زیادہ شہرت پکڑ جاتے ہیں اسی قدر ان کی صحت زیادہ مشتبہ ہو جاتی ہے" مندرجۂ ذیل واقعات شہرت کے منظرِ عام پر لائے گئے اور مسلّمات میں داخل سمجھے گئے ہیں حالانکہ ان کی اصلیت کچھ اور ہے۔

(۱) یہ غلط ہے کہ جس وقت شہر رومہ جلایا جا رہا تھا اسوقت رومہ کا بادشاہ نیرو Nero فڈل (ایک باجا) بجا رہا تھا، کیونکہ وہ تو اس وقت انطیوم میں اپنے محل کے اندر تھا جو رومہ سے پچاس میل دور ہے۔ پھر فڈل سولھویں صدی سے پہلے ایجاد نہیں ہوا تھا۔

(۲) یہ بھی غلط طور پر مشہور ہے کہ سراج الدولہ نے ۱۴۰ انگریزوں کو کلکتہ کی ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں بند کر کے مار ڈالا۔ ہندوستانیوں کے خلاف انگلستان میں اس کا کچھ ہی اثر ہوا ہو مگر یہ محض "مقدس اختراع" ہے!

(۳) یہ بھی غلط مشہور ہے کہ سر والٹر ریلے آلو اور تمباکو امریکہ سے انگلستان لایا تھا۔ اس لئے کہ سر جان ہاکنس تمباکو، اور سر فرانسس ڈریک آلو لانے والے ہیں۔

(۴) اسی طرح یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ جیمس واٹ نے اسٹیم انجن ایجاد کیا تھا۔ البتہ اس نے اسمیں کچھ اضافہ کیا مگر اصل میں ایڈورڈ سومرسیٹ (مارکوئس آف ورسسٹر) نے ۱۶۵۵ء میں اس کو ایجاد کیا تھا۔

(۵) اسی طرح مارکونی کا "تلغراف بے سیم" ([illegible]) ایجاد کرنا بھی صحیح نہیں ہے۔ یہ کہنا چاہیئے کہ مارکونی نے اس کو ترقی دی اور اس مطلب کے لئے اسکا استعمال بتایا لیکن اسکے اصل واضعین اور موجد ہرٹز ([illegible]) اور کلرک میکسویل تھے۔

اسلام اور ڈینٹی

مجریط (اندلس) کے ایک زبردست مستشرق اور عربی کے جید عالم پروفیسر آسین نے اٹلی کے نامور شاعر ڈینٹی کی مشہور کتاب (نظم) ڈِوائن کامیڈی (Divine Comedy) کا مقابلہ اسلامی تصانیف سے کرکے بتایا ہے کہ ڈینٹی نے اپنی کتاب میں اسلامی خیالات سے بہت کچھ استفادہ کیا ہے، اسی پر اکتفا نہ کرکے پروفیسر موصوف نے امام ابن العربی رح کی تصانیف سے مثالیں پیش کی ہیں اور انکا مقابلہ ڈینٹی کی عبارت سے کرکے ثابت کردیا ہے کہ یہ مشابہت و مماثلت کوئی اتفاقی حیثیت نہیں رکھتی۔ حال میں پروفیسر سرٹی۔ ڈبلیو آرنلڈ نے رسالہ "منارۃ" میں اس پر ایک مقالہ سپردِ قلم فرمایا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:-

"انگریزی کی اُن تمام عظیم الشان اور معرکۃ الآرا کتابوں میں جو حال میں شائع ہوئی ہیں، ایک کتاب "اسلام اور ڈوائن کامیڈی" ہے جس کو اندلس کے ایک مشہور عربی داں عالم پروفیسر آسین نے (جو مجریط کی یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہیں) اسپینی زبان میں تصنیف کیا تھا جب پہلے پہل یہ کتاب ۱۹۱۹ء میں شائع ہوئی تو یورپ اور امریکہ کے علمی حلقوں خصوصًا کلام ڈینٹی (Dante) کے شیدائیوں میں ایک ہل چل مچگئی۔ مؤخر الذکر گروہ کے لئے تو یہ معلوم کرنا یقینًا ایک سخت اور ناقابل برداشت صدمہ تھا کہ کتاب "ڈوائن کامیڈی" جو قرون وسطیٰ کے کلیسائے کاتھولیکیہ کے دینیات، فلسفہ اور علم الکائنات کی "دائرۃ المعارف" ہے، اپنی نمایاں خصوصیتوں میں اسلامی ماخذ کی رہین منت ہے! پروفیسر آسین نے اپنے اس جرات آمیز نظریہ کی تقویت و اثبات کے لئے زبردست شواہد پیش کئے ہیں اور عربی لٹریچر پر اپنے کامل عبور، خصوصًا صوفیائے اسلام میں سے ابن العربیؒ کی تصانیف سے . . . .

اپنی گہری واقفیت کا ثبوت دیا ہے۔ پروفیسر موصوف نے ان مشہور اندلسی عالم و فلسفی کی تصانیف کا خاص طور پر مطالعہ کیا ہے، جنھوں نے ڈینٹی کی ولادت سے صرف ۲۵ برس پہلے وفات پائی۔ پروفیسر آسین نے ہر دو مصنفین کے کلام میں مشابہت کی کئی مثالیں پیش کرکے دونوں کے طرزِ بیان اور صوفیانہ استعارات و تشابیہ

کو بتلایا ہے جو اِن دونوں فلسفیوں کی تحریروں میں پائے جاتے ہیں۔"

اس کے بعد دونوں کا مقابلہ کرتے ہوئے مسٹر آرنلڈ لکھتے ہیں :-

"ڈینٹی کی مشہور نظم کا موضوع، جیسا کہ عام طور پر معلوم ہے، دوزخ، اعراف اور بہشت میں نشارۂ ثانیہ کا بیان ہے۔ پروفیسر آسین ڈینٹی کے بیان کا مقابلہ پیغمبر اسلام کے واقعۂ معراج کے بیان سے کرتے ہیں جو عربی لٹریچر میں بہت اہم درجہ رکھتا ہے، بعض مسلمان مصنفین نے واقعات معراج کو بطور تاریخی واقعات کے لکھا ہے اور بعض مصنفین نے صوفیانہ رنگ میں اُن کا ذکر کرکے اعمال نیک کے ثواب اور گناہوں کے عذاب کے متعلق اُن کو اخلاقی تعلیم کا ذریعہ بنایا ہے۔ ہم اس وقت اُن جزئیات کو پیش نہیں کرنا چاہتے جن کو پروفیسر آسین نے فاضلانہ طور پر پیش کیا ہے کیونکہ یہ کتاب اب انگریزی میں ترجمہ ہو چکی ہے اور انگریزی داں اصحاب کے لئے سہل الحصول ہے۔ پروفیسر موصوف کی پیش کردہ متعدد مثالیں ایسی واضح اور مشابہ ہیں کہ ان کو اتفاقات میں نہیں شمار کیا جا سکتا۔ ضمناً یہ کتاب مذہب اسلام کے مطالعہ اور قرون وسطی کے یورپ پر اسلامی اثرات پر بہت روشنی ڈالتی ہے۔"

کتاب سعد السعود

ایران کے ایک نامور عالم شیخ ابوعبداللہ زنجانی نے مصر کے نامور ادیب احمد تیمور پاشا کو ایک خط لکھا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں :-

"مجھے کتاب "سعد السعود" دستیاب ہوئی ہے جس کو ۶۵۱ھ میں علی بن موسیٰ بن محمد الطاؤس نامی امامیہ کے ایک عالم نے تالیف کیا تھا اس کا موضوع یہ ہے کہ مؤلف نے صحف سماوی مثل قرآن، توراۃ، انجیل، صحف ادریس، اور قدما کی چند تفاسیر فی سبیل اللہ وقف کردیں جو اگرچہ آج ہمارے پاس موجود نہیں ہیں تاہم ابن الندیم نے الفہرست میں انکا ذکر کیا ہے، مؤلف نے انہی کتابوں سے عمدہ اور مفید انتخابات اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں۔ ان منقولات میں سب سے زیادہ اہم ایک نسخۂ انجیل کی آیات ہیں جن کے شروع میں لکھا ہے

"شرح انجیل جس کو مارلما مطران ...... نے امیر المومنین المامون کے لئے اس سنہ
میں تصنیف کیا جبکہ نسطوریہ نے یعاقبہ پر خروج کیا تھا اور خلیفہ نے اس کی اعانت کی تھی۔
سُریانی سے عربی میں دونوں زبانوں کے علماء کی موجودگی میں منقل کیا گیا انجیل کا وہ نسخہ
(سریانی) اصل نسخہ سے نقل کیا گیا تھا اور یہ نسخہ اس (سریانی) نسخہ سے نقل کیا گیا ہے"

اس انجیل کی آیات اور موجودہ انجیل کی آیات میں بھی فرق پایا جاتا ہے صحف ادریس کو مؤلف نے کوفہ کے "مشہد الطاہر" کے وقف کی ایک کتاب سے نقل کیا ہے جس پر "سنن ادریس" لکھا ہوا تھا اس میں لکھا ہے کہ:-

"بخط علیی محرر، سریانی سے عربی میں ابراہیم بن ہلال بن ابراہیم بن ہرون الصابی الکاتب
نے نقل کیا"

ہرون غالباً زہرون کا محرف ہے اور یہ صابی وہی مشہور و معروف مترجم اور انشا پرداز ہے بہر حال اس کتاب سے بہت سے علمی ادبی اور تاریخی معلومات حاصل ہوتے ہیں۔

(الزہراء)

ایک فرانیسی کی تعریف اسلام

موسیو سرویر ([illegible]) ایک فرنچ مشنری مُصنف ہے جو اسلام اور اہل اسلام کے خلاف ہر وقت زہر اُگلنے پر مستعد رہتا ہے۔ حال میں اس نے ایک کتاب "سائیکالوجی آف دی مسلمان" کے نام سے لکھی ہے مسٹر اے۔ کن روس ([illegible]) انگریزی کے رسالہ "انگلش ریویو" میں اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"انگریز لوگ اسلامی ترقی کو ممکن خیال کرتے ہیں جبکہ موسیو سرویر اس کو نہیں تسلیم کرتے۔ ان کے نزدیک
"مذہب اسلام۔ ایک وقتی مذہب ہے جو منجمد مُردہ اور ناقابل تغیر و ترمیم ہے"
اس کے خیال میں نصف تعلیمیافتہ مصریوں ہی نے اپنی قومیت کا زہر تمام عالم اسلامی میں افریقہ کے فرنچ مقبوضات تک پھیلا رکھا ہے"

مسٹر کن روس موسیو مذکور کے ان نتائج پر چیلنج دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"کیا ایک مسلمان مصنف موسیو سرویر کے تتبع میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ عیسائی مذہب ایک خاص وقت کے لئے

تھا اور کہ وہ منجمد مُردہ اور ناقابل ترمیم ہے اور کیا وہ اسی کی دلیل چھین کر اہل پروشیا کو مثال میں نہیں پیش کر سکتا جنھوں نے نائرۂ جنگ و جدال مشتعل کیا اور صلح کو اپنی فریب بازیوں سے اُڑا دیا؟ کیا وہ روم اور کلیسائے روم کو پیرو ([illegible]) میں اہل اسپین کی کارروائیوں، سنبٹ بارتھولمیو کی خونریزیوں اور ملٹن کے "اولیائے مقتول" (Slaughtered Saints) اور اسی قسم کے چھوٹے بڑے مظالم سے تعبیر نہیں کر سکتا؟ کیا وہ فی زمانناً فرانس اور اطلی کو نہیں پیش کر سکتا جنھوں نے یونانیوں اور آرمینیوں کو ترکوں کے رحم پر چھوڑ رکھا ہے۔ یا اناطولیہ کے کاشتکاروں کو یونانیوں یا آرمینیوں کے رحم پر۔

"موسیو مذکور کے حق میں یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ وہ ان مسلمانوں سے خائف معلوم ہوتے ہیں جبکہ ہمیں ان سے کوئی خوف نہیں ہے۔"

(انڈین ریویو)

ہنری فورڈ کی کامیابی کا راز

کوئی دس سال پیشتر، ہنری فورڈ نے اپنا یہ اصول قائم کیا تھا کہ اس نے اعلیٰ قسم کی مزدوری کی اُجرت بازار کے نرخ سے زیادہ دینا شروع کیا۔ اور اپنی مصنوعات کو مقابلہ کی قیمتوں کی محدود سطح سے بھی زیادہ سستا بیچنا شروع کیا۔ تجارتی دنیا پہلے تو اُس کے اس فعل پر مضحکہ اُڑانے لگی، بعد میں اس نے کچھ توجہ کی اور آخرکار انہی اصولوں پر مقابلہ پر آمادہ ہوگئی مگر اس عرصہ میں فورڈ نے اچھی طرح ترقی کر لی تھی اور اس وقت سے وہ غالباً دنیا کا متمول ترین آدمی شمار کیا جانے لگا۔ اس کے یہی اصول آج بھی قائم ہیں، چنانچہ وہ کام کرنے والے مزدوروں کو سب سے زیادہ اُجرت یعنی ۶ ڈالر روزانہ دیتا ہے اور اپنی موٹر کے کارخانہ میں کام کرنے والے اشخاص کو بازاری شرح اُجرت سے ڈیڑھ ڈالر زیادہ ادا کرتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صرف سالانہ ۳ فیصدی کام کرنے والے اس کے ہاں بدلتے ہیں جس سے روپیہ، اسباب اور وقت جو نئے کاریگروں کے تیار کرنے میں صرف ہوتا ہے بہت کچھ بچ جاتا ہے۔

(انڈین ریویو)

تفتیش جرائم

یہ بتانا غیر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہر وقت امداد جو سائنس پیش کر سکتا ہے، اسرار جرائم کے انکشاف میں استعمال کی گئی ہے علم الانسان، طب، کیمیا، طبیعیات، نفسیات، اور علم الانسان وغیرہ نے اس کام میں نمایاں حصہ لیا ہے سگار پینے کی پائپ پر دانتوں کے نشانات اور سگار کا وہ سرا جو منہ میں رکھا جاتا ہے انکا امتحان خون کے دھبوں کا کیمیاوی تجزیہ اور بالوں کا بڑے غور و خوض کے ساتھ معائنہ کیا جاتا ہے۔ لندن میں کسی مکان کی کھڑکی کے شیشہ پر انگلیوں کے نشانات کافی خیال کئے گئے تھے جنہوں نے مجرم سے اقبال جرم کرا لیا اس کی وجہ یہ تھی کہ "ماہر نشانات انگشت" نے یہ بتایا تھا کہ انگلیوں کی لکیروں اور ان کی خصوصیات میں ولادت سے لیکر وفات تک کوئی فرق نہیں آنے پاتا۔ اور لاکھوں قسم کے نشانات میں دو نشانات کبھی یکساں اور مشابہ نہیں پائے گئے۔ ایک سراغ رساں کسی مقدمہ کی تفتیش کر رہا تھا جو ایک گم شدہ بنک نوٹ سے متعلق تھا۔ جس کمرہ سے یہ نوٹ گم ہو گیا تھا وہاں اس کو ایک نیم کشیدہ چرٹ ہاتھ لگا۔ چونکہ اس کا سرا کٹا ہوا نہ تھا اس لئے وہ اس نتیجہ پر پہونچا کہ یہ کسی آدمی کا پیا ہوا نہیں ہے۔ اکثر اوقات جیب میں پڑی ہوئی گرد کے کیمیاوی اور دوربینی امتحانات عجیب و غریب انکشافات کا سبب ہوا کرتے ہیں۔

کیسی چھوٹی اور معمولی چیز نے پروفیسر وبسٹر کو پھانسی کی لکڑی پر لٹکوا دیا۔ پروفیسر مذکور موجودہ زمانہ کا ایک نامور سائنس داں تھا جو بہت بڑی قابلیت اور بلند رتبہ خصائل کا آدمی خیال کیا جاتا تھا۔ مگر اس میں عیب یہ تھا کہ وہ بہت جلد باز اور عصبیت والا انسان تھا۔ ایک روز اتفاقیہ طور پر روپئے کے معاملہ میں اسکے پرانے رفیق ڈاکٹر پارکمین سے اس کی لڑائی ہو گئی۔ اس لڑائی میں ڈاکٹر پارکمین کی موت واقع ہو گئی۔ اگر پروفیسر وبسٹر اقبال جرم کر لیتا تو غالباً وہ معمولی سزا پا کر چھوٹ جاتا مگر وہ بالکل خاموش رہا اور اس نے اپنے دوست کے اعضا کو نابید کرنے کے لئے سائنس کے تمام بدترین ذرائع استعمال کر ڈالے۔ اس نے اپنے معمل (لیبارٹری) میں مقتول کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے تمام اعضا، حتیٰ کہ ہڈیوں تک کو نیست و نابود کر ڈالا۔ اب وہ مطمئن ہو گیا کہ مقتول کا ایک بال بھی نہیں بچا ہے جو اس کے جرم کا راز فاش کر سکے۔ مگر وہ ایک چھوٹی سی چیز کو بالکل نظر انداز کر گیا۔ اس کی بھٹی (آتشدان) کی راکھ اور کوئلوں میں مصنوعی دانتوں کی ایک قطار کا کچھ حصہ پایا گیا جس کو دندان ساز نے پہچان کر بتا دیا کہ یہ فلاں آدمی کا ہے۔ یہ دانت ایک ایسی سخت دھات کے بنائے گئے تھے جس پر

مشکوک ملزمین کے جرم اور بیگناہی کا اکثر ماہرین طب ہی کی شہادت پر فیصلہ کیا جاتا ہے۔ اس قسم کے مقدمات میں انگلستان کے ایک بیرسٹر کا مقدمہ بہت عظیم الشان ہے اس جرم کی طرف غالباً کسی نے توجہ بھی نہ کی ہوتی اور واقع شدہ موت کو ناگہانی یا خودکشی خیال کر لیا جاتا۔ اگر ماہرین طب اس کا ثبوت بہم نہ پہونچاتے۔ اس مقدمہ میں سوال یہ درپیش تھا کہ آیا "متوفی قتل کیا گیا ہے یا اس نے خودکشی کر لی ہے؟" آرام کرسی پر پڑی ہوئی لاش کی ہیئت سے قتل کا انکار کیا گیا۔ ڈاکٹروں نے کہدیا کہ یہ لاش اس جگہ مرنے کے کوئی ۶۰ یا ۷۰ گھنٹوں کے بعد رکھی گئی ہے۔ لاش اپنی موجودہ حالت میں سرد نہیں ہو جانی چاہئے کیونکہ موت واقع ہونے کے ۲۴ گھنٹوں بعد وہ لاش سخت ہو گئی اور اس سختی کو دور کئے بغیر لاش کو حرکت نہیں دیجا سکتی۔ حالانکہ عضلات کو توڑے بغیر یہ ناممکن ہے۔ مگر عضلات نہیں ٹوٹے تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لاش کو سخت ہو جانے کے بعد حرکت دی گئی ہے جو موت واقع ہونیکے بعد ۶۰ یا ۷۰ گھنٹے تک وقوع میں نہیں آتی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص نے لاش کو آرام کرسی میں رکھکر خودکشی کا خیال پیدا کرنا چاہا ہے۔ اس کی تائید اس نقش قدم سے بھی ہوئی جو وہاں خون آلودہ زمین پر اٹھا ہوا تھا۔ اس قدم کا نقش قدم مقتول کا نہیں ہوسکتا تھا اور کہ یہ نقش قدم خون بہنے سے دو گھنٹے بعد یا غالباً اس سے بھی زیادہ مدت کے بغیر نہیں اٹھ سکتا تھا پھر وہ اس تاریخ سے بہت پہلے کا معلوم ہوتا تھا جبکہ پولیس نے پہلی اطلاع ملنے پر اس مکان کا جائزہ لیا تھا۔ یہاں قاتلوں نے بڑی ہوشیاری اور احتیاط سے تجاویز سوچی تھیں جو بالکل بیکار گئیں اور آخر کار قاتلوں کا پتہ چلایا گیا وہ گرفتار ہوئے اور اپنی سزا کو پہونچ گئے۔

یہ مقولہ کہ "قتل ہمیشہ ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتا" ہمیشہ صحیح نہیں ہوا کرتا۔ ابھی ایسے تاریک اور پرخطر اسرار باقی ہیں جن کا انکشاف نہیں ہوا، اور وہ غالباً کبھی ظاہر نہ ہوں گے مگر یہ "اعمال مخفی" عموماً چالاک اور تعلیمیافتہ آدمیوں کے نہیں ہوا کرتے عموماً غیظ و غضب سے مغلوب آدمی غیر ارادی قتل کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یا دیوانے اور مجنون آدمی ان افعال بلا مقصد پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ ایک بیوقوف آدمی اپنے جرائم بلا مقصد کو چھپانے میں غلطی کر سکتا ہے مگر ایک چالاک خونی اپنی ترکیبوں کو نہیں چھپا سکتا اور وہ ایک معمولی بات کو نظر انداز کر جاتا ہے جو آخر کار اس کو اپنے کرتوتوں کی سزا دلاتی ہے۔ وہ بھولی ہوئی معمولی چیز اس کے کرتوتوں کی شاہد اور اس کے جرم کا "اشتہار" بن جاتی ہے۔ بنی نوع انسان کی حفاظت کے لئے یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ اکثر یہ حالت رونما ہوتی ہے۔

ادبیات

سونیٹ

(جناب محمد عمر صاحب (کھتری) عباسی بی۔ اے (جوناگڈھی) مقیم حال لندن)

"درمع الدھر کیف دار" کے زرین اصول پر عمل پیرا ہونے والوں کی تعداد روز افزوں ترقی کر رہی ہے فیشن نہ صرف لباس وطرز معاشرت میں سرایت کر گیا ہے بلکہ علم وادب میں بھی داخل ہوتا جاتا ہے۔ اکثر شعرا اور مضمون نگار حضرات نے آجکل ایسی روش اختیار کرلی ہے جو بعینہ انگریزی طرز وروش کا خاکہ یا کسی مغربی زبان کا عمدہ ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ آجکل یہ طرز سخن اور پیرایہ بیان مقبول خاص وعام ہو رہا ہے اس سے ایک زبردست فائدہ یہ ہوا ہے کہ ہماری پُرانی شاعری جو گل وبلبل اور شمع وپروانہ اور وصل وہجر کے لغو اور مبالغہ آمیز خیالات سے بھری ہوئی تھی رفتہ رفتہ پاک ہوتی جاتی ہے اور بمصداق "کل جدید لذیذ" نیچرل شاعری جو مطبوع طبع ہر خاص وعام ہوگئی ہے ہماری پُرانی شاعری میں ایک نئی روح پھونک دینے کی باعث ہوئی ہے۔

اگر ہم خود کوئی اختراع وایجاد نہیں کر سکتے تو کم از کم غیروں کے عمدہ اختراعات کی نقل تو کر سکتے ہیں لیکن نقل کی جائے تو ایسی کی جائے کہ اصل کا دھوکا ہو ترجمہ وُہی بہترین سمجھا جاتا ہے خواہ وہ نظم میں ہو خواہ نثر میں اپنی زبان کے قالب میں اس طرح ڈھال لیا جائے کہ طبعزاد معلوم ہو اور ترجمہ کا شبہ تک نہ گذرے۔

آج ہم ارباب سخن کی خدمت میں ایک درخواست پیش کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ "سونیٹ" جو ایک مغربی صنف نظم ہے اور جو کسی حد تک ایک خاص قسم کے خیالات وجذبات کے اظہار کے لئے مخصوص قرار دیگئی ہے اگر اس کو اُردو کے قالب میں ڈھالا جائے تو یہ ہمارا اُردو شاعری میں ایک اضافہ ہوگا، ہم یہ درخواست کرتے ہوئے خصوصاً اُن اصحاب سے جو انگریزی لٹریچر سے ناواقف ہیں سونیٹ کا تعارف کراتے ہیں۔

سونیٹ کی تعریف | سونیٹ ایک چودہ مصرعی نظم ہے جو ایک خاص وزن میں لکھی جاتی ہے چودہ مصرعے قوافی کے لحاظ سے چار حصوں میں تقسیم کئے جاتے ہیں دو۔ چار چار مصرعوں اور دو

تین تین کے - اول - چہارم - پنجم - اور ہشتم مصراع ہم قافیہ - دوم - سوم - ششم - ہفتم - ہم قافیہ نہم و دوازدہم ہم قافیہ - دہم و سیزدہم ہم قافیہ اور یازدہم و چہاردہم ہم قافیہ - مزید وضاحت کے لئے نقشۂ ذیل ملاحظہ ہو -

(مصراع) اول - دوم - سوم - چہارم - پنجم - ششم - ہفتم - ہشتم - نہم
(قافیہ) ا - ب - ب - ا - ا - ب - ب - ا - ج
(مثال) آب - بر - تر - تاب - باب - پر - شر - خواب - راز

(مصراع) دہم - یازدہم - دوازدہم - سیزدہم - چہاردہم
(قافیہ) د - ہ - ج - د - ہ
(مثال) فصاحت - مثال - نیاز - بلاغت - مقال

کبھی کبھی اس میں فرق کیا جاتا ہے جو ہم آگے چل کر بتائیں گے - مگر ہمیں علاوہ وزن اور قوافی کے خیالات وجذبات کی بھی قید ہے یعنی ایک ہی موضوع کو اول سے آخر تک نباہتے ہیں اور اس میں روانی اور مناسبت ایسی ہوتی ہے کہ اول سے آخر تک چودہ مصرعے ایک ہی زنجیر کی کڑیاں معلوم ہوتی ہیں اگر اس کو ایک چودہ مصرعی جملہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا آخری مصرع میں سارے مضمون کا لب لباب کوئی جامع مقولہ یا ضرب المثل یا حاصل مطلب اس خوبی سے لایا جاتا ہے کہ اگر اس آخری مصرع کو یاد رکھیں تو ساری سونیٹ کا مطلب یاد ہو جاتا ہے عموماً سونیٹ کو عاشقانہ جذبات کا جامہ پہنایا جاتا ہے - اگر اس موضوع خاص کے علاوہ اور موضوعات بھی اختیار کئے جائیں تو اس میں بخوبی ادا ہو سکتے ہیں اس طرح کی نظم کو ہم اپنی زبان میں "مسبع" کہہ سکتے ہیں اور میرے خیال میں یہی موزوں بھی ہے -

سونیٹ کی تاریخ

پندرھویں صدی عیسوی میں اطالوی زبان میں اس کا رواج ہوا اور اس زبان کی روانی اور لطافت نے اس میں روح پھونک دی - سولھویں صدی عیسوی میں انگلستان کے شعراء نے اس میں کچھ تبدیلی کر کے جو انگریزی زبان کے لحاظ سے لازمی تھی اس طرح کی نظمیں لکھنا شروع کیں اور قوافی کی ترکیب میں بھی کچھ تبدیلی کی - اس کا خیر مقدم کرنے والوں میں سپینسر اور سر فلپ سڈنی تھے اس کے بعد شیکسپیر نے اس کو نشو و نما دی اس کی خامیاں دور کر کے نئی زینت بخشی اور قوافی کو بدل کر

اس طرح پر رکھا:-

اول - دوم - سوم - چہارم - پنجم - ششم - ہفتم - ہشتم - نہم - دہم - یازدہم -
ا - ب - ا - ب - ج - د - ج - د - ہ - و - ہ

دوازدہم - سیزدہم - چہاردہم -
و - ز - ز

اس نئے لباس نے اس کی زینت حسن کو دوبالا کردیا - اور اس دن سے شاعرانِ انگلستان، اسی طرح پر لکھتے رہے - مگر ملٹن کے زمانے میں پھر اس کو اپنی حالت پر رکھا گیا مگر اس نے ایک نئی بات یہ پیدا کی کہ اس سے پہلے جو چار حصص میں سے ہر حصّہ کے آخر میں وقف لایا جاتا تھا یعنی چار شعر کے بعد جملہ ختم ہوا - پھر چار کے بعد پھر تین کے بعد اور پھر تین کے بعد ملٹن نے اس رکاوٹ کو دور کردیا - گویا اول سے آخر تک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی پہاڑ میں سے ایک ندی نکلی اور سیلاب کی طرح بہتی چلی گئی اور آخری سرے پر آکر سمندر سے ہم آغوش ہوگئی - اسوجہ سے ملٹن کے سونیٹ پر شکوہ اور شاندار معلوم ہوتے ہیں جیسے اس کے دیگر اصناف سخن ہوا کرتے ہیں -

ملٹن کے بعد سونیٹ مدتوں جسم بیجان کی طرح پڑی رہی آخر ورڈزورتھ نے اس کو اصلی قالب میں ڈھال کر اس میں از سر نو جان ڈالی - پھر روسیٹی اور مسنر براؤننگ نے اسکو اور امتیاز بخشا فی الحال مسنر براؤننگ کے سونیٹ سب سے زیادہ مروج اور پسندیدہ ہیں -

قوافی کے لحاظ سے اس میں جو تبدیلیاں واقع ہوئیں اس کا نقشہ حسب ذیل ہے -

(اطالوی) اب ب ا - اب ب ا - ج د ھ - ج د ھ

(شیکسپیر) اب اب - ج د ج د - ہ و ہ و - ز ز

(ملٹن) اب ب ا - اب ب ا - ج د ج - د ج د

سونیٹ کو اردو کا جامہ پہنانے سے پہلے کوئی وزن مقرر ہونا چاہئے انگریزی وزن جو اس کے لئے مخصوص ہے اگر اسکا تتبع انگریزی داں شعرائے اردو کرسکیں تو ایک ادبی مسئلہ طے ہوسکتا ہے اور ہم "خذ ما صفا ودع ما کدر" پر عمل پیرا ہو کر انگریزی شاعری سے بخوبی مستفید ہوسکتے ہیں اور ہماری اردو شاعری اس سے بوجہ احسن استفادہ کرسکتی ہے بطور نمونہ ہم اپنے دوست جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر

(جوناگڑہی) کا ایک سونیٹ جو انہوں نے میرے اصرار سے لکھا ہے ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں امید کہ ناظرین زبان میں سے شعرا اس طرف توجہ فرمائیں گے اور سونیٹ لکھ کر ادب اردو کو ممنون فرمائیں گے۔ وَھُوَ ھٰذَا :-

شہر خموشاں

کیا ہی یہ شہر خموشاں دل شکن نظارہ ہے ا
کیسی عبرت خیز ہے یہ اس کی پُر غم خامشی ب
حسرت و بیچارگی ہے ہر طرف چھائی ہوئی ب
دیکھ کر جس کو دل مضطر بھی پارہ پارہ ہے ا
خاک کے تودے پڑے ہیں جا بجا کس شان سے ا
قبر ہے کوئی شکستہ اور کوئی اُجڑی ہوئی ب
سبزۂ خودرو کہیں ہے اور کہیں کائی جمی ب
ہیں پڑے سنگِ لحد بھی قالب بیجان سے ا

چھوٹ کر قیدِ مصیبت سے ہر اک آکر یہاں ج
سو رہا ہے فکر عیش و جاہ و دانی چھوڑ کر د
ان کی تربت پر فقط سبزہ ہے تنہا سوگوار ھ

صرف اک شبنم ہے ان کے حال پر گریہ کناں ج
بیکسی چھائی ہوئی ہے خفتگانِ خاک پر د
آہ یہ شہرِ خموشاں بھی ہے کیا اُجڑا دیار ھ

(اختر)

شوالہ

(محمد شفیع صاحب شفیع اکبر آبادی)

(بسلسلہ ماہ جولائی ۱۹۲۶ء)

(۴)

زارہ اور ثمرہ عالم خیال میں شوالہ کی دیویوں کی کیسی ہی معتقد کیوں نہ ہوں۔ مگر بظاہر وہ ان سے زیادہ مانوس نہ تھیں۔ ہلیون کی آخری تاریخوں میں جبکہ بڑی دیوی کا اشنان ہوتا تھا یہ دونوں بہنیں کچھ صندل لیکر شوالہ میں حاضر ہوتی تھیں۔ اور ان کی وجہ سے اس دن اس قدر ہجوم ہو جاتا تھا کہ مجبوراً انہیں بڑی دیوی کی پناہ لینی پڑتی تھی۔ اور پھر یہ اسوقت شوالہ سے باہر آتی تھیں جبکہ پجاریوں کے سوا کوئی شوالہ میں باقی نہ رہتا تھا۔ وہ عقیدت کی کمزور نہ تھیں مگر اُن کا جسم ضرور نازک تھا۔ وہ اگر گھر سے باہر آتیں تو وہیں لوگوں کی نگاہوں سے تصادم کا خوف رہتا تھا۔ اس لئے وہ بہت محفوظ محجوب اور بچکر نکلتی تھیں۔

آذر شوالہ سے لوٹا تو اُس کے مُنہ سے کف جاری تھا۔ اُس نے ثمرہ کو بُلایا اور کہا "دیکھو آیندہ ہرناق میرے محل کے دروازے پر نہ آنے پائے۔ ثمرہ نے نہایت متبسّم لہجہ میں کہا "اگر یہ حکم آپ دربان کو دیتے تو زیادہ مناسب تھا" یہ کہکر وہ اُچھلتی کودتی ہنستی ہوئی ایک طرف روانہ ہو گئی۔

آذر نے زارہ کو آواز دی۔ زارہ آئی تو آذر نے کہا "زارہ میں نہیں چاہتا کہ تم ہرناق کی نگاہوں کے سامنے پھول برساؤ۔ اور بے حجاب چلی آؤ" زارہ نے نہایت خندہ پیشانی اور شگفتہ جبینی سے کہا "اگر آپ ہرناق کو یہاں آنے جانے سے روک دیتے تو یہ زیادہ مناسب تھا" اور وہ بھی سیٹی بجاتی، اور نگاہوں سے بجلیاں گراتی ہوئی ایک طرف چلی گئی۔

آذر ایک عجیب کش مکش میں تھا۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ ہرناق نے بڑی دیوی کو منالیا ہے اور بڑی دیوی اسکی تمناؤں کو پورا کرنے میں ساعی ہے۔ اُسے قطعی شبہ تھا کہ ہرناق زارہ سے یا ثمرہ سے محبت کرتا ہے۔ اور ان دونوں میں سے ایک کے حاصل کرنے میں اس کا کامیاب ہو جانا یقینی ہے۔ اسکی فطرت، اسکی حسن پرستی، اور اس کا جذبہ تعشق

ایک ایسے جذبہ سے بدلا ہوا نظر آتا تھا جو اُس کی نگاہوں میں کھٹک رہا تھا۔ جیسے وہ نکالنا چاہتا تھا۔ مگر معذور تھا۔ اُس نے اپنی آنکھیں زور سے بند کرلیں۔ اس کے آنسو چمکدار گالوں پر بہنے لگے اور وہ عالم خیال میں بڑی دیوی کے قدموں پر جاپڑا اُسے محسوس ہوا کہ بڑی دیوی ناراض ہے۔ اُس نے اپنے پاؤں سمیٹ لئے ہیں اور وہ نہیں چاہتی کہ آذر کی پیشانی اور اور ہونٹوں کو اپنے پاؤں کا ذرا سا صندل بھی عنایت کرے۔ اُس نے جوشِ عقیدت میں اپنا سر اور آگے بڑھایا۔ دیوی اور سمٹی۔ اور جب آذر نے تیسری مرتبہ پابوسی کی جرأت پوری قوت کے ساتھ کی تو دیوی کے ہاتھ سے وہ تیر اُس کے سر پر گر پڑا جو جبروت و جلال کے مظاہرہ کے لئے اُس کے ہاتھ میں دیدیا گیا تھا۔ اُسے اپنے سر میں ایک درد محسوس ہوا۔ وہ کراہا اور عالم خیال سے واپس آگیا۔ اُس نے آنکھیں کھولدیں۔ اپنے صنم کدہ میں گیا جہاں اُس کے ہاتھ کے بنائے ہوئے کئی بُت رکھے تھے۔ ان میں سے ایک نسائی بُت کی طرف بڑھا۔ برش سے اُسے صاف کیا۔ مسالحوں سے دھویا اور گردن پر رکھکر سیدھا شوالہ کی طرف پہونچا۔ پہاڑ کی چڑھائی نے اُسے کمزور کردیا تھا۔ اُس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ شوالہ سے کچھ دور ایک درخت کے سایہ میں ٹھہر گیا اور دم لیکر پھر چڑھا۔ شوالہ کے دروازہ کو زور سے کھولا اور بڑی دیوی سے آنکھیں چُراتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ وہاں جاکر آذر نے اپنا بُت نصب کیا۔ اُس پر صندل لگایا۔ لوبان کی دھونی دی۔ اور اُس کے قدموں میں گر پڑا۔ وہ اپنے نئے بُت کا پرستار تھا۔ اب اُسے کوئی منع نہ کرسکتا تھا۔ اُسنے بُت کے پاؤں پوری قوت سے پکڑ لئے اور اس قوت کے ساتھ سجدہ کیا کہ اُس کی پیشانی سے خون بہنے لگا مگر اُس نے اس کی کچھ پروا نہ کی۔

(۵)

ہرناق بدستور کھڑا ہوا تھا۔ شام ہوئی پجاریوں نے شام کے مراسم ادا کئے۔ دیوی کے پہلو میں گھی کے چراغ جلائے گئے۔ ناقوس کی آوازوں نے انھیں لوریاں دیں۔ گھنٹے کی سُریلی صداؤں نے پیام خواب دیا۔ جب پجاری اپنے فرایض ادا کرچکے تو ہرناق، ایک دُور افتادہ پروانے کی طرح بڑی دیوی کے چراغوں پر جاپڑا۔ اُس نے سب چراغ بجھا دیئے اور دیوی کے سجدہ میں جھک گیا۔ یہ اُس کی آخری منزل تھی۔ اور عقیدتمندی اُسے اپنی آغوش میں لئے ہوئے دیوی کے سامنے کھڑی تھی۔

زارہ نے ثمرہ سے کہا "بہن ابا جان بہت خفا ہیں۔ شاید ہرناق کا کوئی بُت شوالہ میں مقبول ہوگیا ہے۔ چلو ذرا ہم بھی ہو آئیں۔ آج تو وہ بھی اپنا ایک بُت لے گئے ہیں۔"

دونوں ریشمی رداؤں میں ملفوف ہوئیں، اور پہاڑ پر چڑھ گئیں۔ بڑی دیر میں پہونچیں۔ بالائے کوہ

کی تازہ ہواؤں نے اُنہیں تازہ دم کر دیا۔ وہ چہلیں کرتی ہوئی شوالہ میں داخل ہوگئیں۔ بڑی دیوی کو سلام کرنے جھکتی تہیں کہ ہزناق کو سجدہ میں دیکھا۔ زارہ نے ثمرہ سے کہا "دیکھو ہزناق دیوی کو منا رہا ہے۔ مجھے تو اس پر ترس آتا ہے"۔ ثمرہ نے اِس کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ عقیدتمندانہ خم کے ساتھ ہر اُبھریں اور ثمرہ نے زارہ سے کہا "چلو ذرا اپنے باپ کے بت کو دیکھیں"۔ وہ تمام شوالہ میں پہریں۔ دیوتاؤں نے اُنہیں محبت کی نگاہوں سے دیکھا۔ اور دیویوں نے خاموش نگاہوں سے اونکی پذیرائی کی۔ دوسری طرف اونہیں آذر نظر آیا۔ جو اپنے بتُ کے قدموں پر مجروح و مجبور پڑا تہا۔ ثمرہ نے آواز دی۔ زارہ نے منع کیا اور بہاگ کر کسی طرف غائب ہوگئی۔

آذر نے آواز پہچانی غصہ اور نفرت سے منہ پہیر کر دیکہا۔ ثمرہ نے کہا "زارہ بہی یہیں ہے"۔ آذر ایک ہیبت ناک انگڑائی لیکر اٹہا۔ اپنے بت پر غایر نگاہ ڈالی اور پوچہا "ثمرہ۔ زارہ کہاں ہے؟" "وہ ابہی تو یہیں تہی ابہی بہاگ گئی ہے"۔ ثمرہ نے نہایت سادگی سے جواب دیا۔ آذر بڑہا سب سے پہلے بڑی دیوی کے بُت کے پاس آیا۔ دیکہا ہزناق دیوی کے سجدوں میں بالکل ڈوبا ہوا ہے۔ اُس نے زارہ کو ہر طرف تلاش کیا۔ مگر اس کا کہیں پتہ نہ چلا ثمرہ نے کہا "شاید وہ آپ کے ڈر سے نیچے اُتر گئی ہوگی"۔

آذر غصہ کی تیز آنکہیں چمکاتا ہوا شوالہ سے باہر نکلا۔ پہاڑ سے اُترا۔ گہر پہونچا تو معلوم ہوا کہ زارہ یہاں بہی نہیں ہے۔

آذر سخت پریشان تہا۔ دریا کے ساحل اور پہاڑ کی وادیاں آدہی رات تک چہانیں پہر شوالہ میں ڈہونڈا مگر زارہ کہیں نہ تہی۔

(۶)

شوالہ کے دروازے بند کر دیے گئے۔ نصف شب گذر چکی تہی۔ چاند پوری روشنی کے ساتھ پہاڑی سبزہ میں تارے بنا رہا تہا جہینگر خواب آور نغموں سے شوالہ کی بیداریوں کو آسودہ خواب کر رہے تہے چشموں میں پانی بہنے کی آوازیں سریع ہوگئی تہیں۔ دریا کی موجوں کا شور سماعت میں تموج پیدا کر رہا تہا۔ آذر اپنے محل میں کش مکش کے لمحے جلد جلد کاٹ رہا تہا۔ ثمرہ اپنے بستر پر کروٹیں بدل رہی تہی تمام گہر والے بار بار اُٹہتے تہے اور ہر آہٹ پر زارہ کے آنے کا اُنہیں یقین ہو جاتا تہا۔ آذر کا گمان ہزناق کی طرف ضرور تہا۔ مگر اُسنے دو تین بار شوالے کا چکر لگایا اور ہزناق کو ہر مرتبہ سجدہ ریز پایا۔ اس لئے آذر کا یہ گمان اس یقین سے بدلتا جاتا تہا کہ زارہ کو یا تو کوئی درندہ اٹہا کر لے گیا یا وہ ڈر کر پہاڑ کی دوسری جانب گر پڑی۔ جہاں عمیق غار و ں

میں ہمیشہ کے لئے اُس کی قبر بن گئی ہوگی۔ بہرحال وہ بہت پریشان تھا۔ اور خصوصیت کے ساتھ اُس کی پریشانی یوں اور بھی زیادہ تھی کہ اُس کی بیٹی دیوی کی بشارت اور اُس کے خواب کی ایک زندہ تعبیر تھی۔

(۷)

آدھی رات کے بعد شوالہ کے اندھیرے میں ہرناق کی نمادگی بڑھی۔ وہ رویا۔ بہت زیادہ رویا، اور اُس نے دیوی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"دیوی! اب تو رحم کر۔ میں صرف زارہ کو چاہتا ہوں۔ دنیا درکار نہیں، اس کے بدلہ میں اپنے تمام بت شوالہ کو دینے کے لئے تیار ہوں۔ دیوی تو نے مجھے گھر سے بلایا ہے، میں دو روز سے بھوکا پیاسا تیرے چرنوں میں پڑا ہوا تجھے سجدہ کررہا ہوں، تیری قوت سے پہاڑ کمربستہ ہے، اور تیری ہیبت سے دریا سر پیٹ رہا ہے۔ تو اپنے تیر سے آذر کا کام تمام کر، اور زارہ ——— آہ ——— زارہ کو مجھے دیدے۔ جلد دیدے۔ کہ میں تیری پرستش کے بعد اُس کی پرستش کرکے اپنی جبین و آغوش کو صندل سے بسالوں۔ دیوی۔ اگر اب بھی تجھے اس میں عذر ہوگا، تو میں اپنا سر پھوڑ کر یہیں مرجاؤں گا۔ اور دُنیا بھر کے شوالوں میں تو ہرناق کُش مشہور ہوجائے گی۔" ہرناق یہ کہہ کر رویا اور پھر سجدہ میں جھکا۔ وہ چاہتا تھا کہ دیوی کے پاؤں پکڑلے مگر اس کے ہاتھ میں ایک گدازاور نرم کلائی آگئی۔ اُس نے شمع جلادی اور سر اُٹھایا۔ دیکھا تو زارہ اپنی تمام خوبصورتیوں کے ساتھ اُس کے سامنے کھڑی ہے۔ دیوی کی مسرت اس کے ہونٹوں میں مسکرا رہی ہے۔ اور زارہ کی نگاہوں سے رضامندی اور دلدہی کے پھول برس رہے ہیں۔

ہرناق تڑپ کر اُٹھا۔ اُس نے زارہ کو ہمکنار کرلیا۔ اور گھبرا کر پوچھا "زارہ۔ زارہ۔ تم کیسے آئیں؟"

زارہ نے نہایت اطمینان کے ساتھ جواب دیا "جیسے تم آئے تھے"!

ہرناق پھر دیوی کے قدموں پھاٹ گیا۔ زارہ نے بھی سجدہ کیا اور عقیدت کے آنسو نذر کرنے کے بعد دونوں شوالہ سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگے۔

شمع کے ناکمل اُجالے میں، نہ معلوم اُن کا ہاتھ کس چیز پر جا پڑا۔ ایک زور کا دھماکا ہوا۔ اور یہ دونوں آذر کے محل میں ایسی جگہ جا کر گرے جہاں آذر کروٹیں لے لے کر اپنی پریشانیوں کے مجسمے پامال کررہا تھا۔ وہ اس شور کی آواز سے چونکا۔ آنکھیں کھولیں

تو ہرناق" زارہ کے قدموں میں سجدہ ریز تھا اور زارہ حسن کی ایک عدیم النظیر وباوقار دیوی کی طرح کھڑی مسکرا رہی تھی۔

تصحیح

زبان کے جولائی نمبر میں کتابت کی بعض افسوس ناک غلطیاں رہگئی ہیں ناظرین درست فرمالیں۔

صفحہ ۲ آخری سطر میں توقعات رکھنی چاہئیں بنا لیجئے۔ صفحہ ۳ سطر ۵ بجائے "کلہ کوہ" کے "قلہ کوہ" ہونا چاہئے۔ اور سطر ۹ "ساعد اندلسی" کی جگہ "ساعد اندلسی" درست کر لیجئے۔ افتتاحیہ کے شعر میں دردوے اور سجودے ، ہونا چاہئے۔ اضافت کسرہ غلط ہے۔

صفحہ سطر ۱۲ "زبان ایک ایسے گوشے سے" ہونا چاہئے۔ صفحہ ۸ سطر ۱۰ "قابل نہ ہوگے" کی بجائے، قابل نہ رکھوگے۔ اسی صفحہ کی سترہویں سطر میں بجائے "پرنور" کے "پرستور" ہونا چاہئے۔ صفحہ ۱۱ سطر دوسری "زبان کی خدمات کی بجائے "زبان" جن خدمات کی ہونا چاہئے۔ اسی صفحہ کی آٹھویں سطر میں بجائے "اہل نقاب" کے صرف "لغات و اہل علم" ہونا چاہئے۔

ادبیات کے سلسلہ میں صفحہ ۳۳ کی بیسویں سطر میں "کارنامہ" کی جگہ "کارزانہ" ہونا چاہئے۔ صفحہ ۳۴ کی سطور ۱۳ و ۱۴ میں "پایا انداز نہیں کہا جاسکتا" کی بجائے "پایا نظر انداز نہیں کیا جاسکتا" ہونا چاہئے۔ صفحہ ۳۵ کی سطر ۱۴ میں "مستقبل تصویر" کی جگہ "متقبل تصویر" ہونا چاہئے۔ صفحہ ۳۶ کی سطر ۹ میں "خوش آئندہ" کی بجائے "خوش آیند" سطر ۱۱ میں "الفاظ میں" کی جگہ "الفاظ ہیں" اور سطر ۲۰ میں "نغل رہیں" کی بجائے "مخل رہیں" بنا لیجئے۔ صفحہ ۳۷ کی سطر ۱۶ میں "کم ہو نہ جائے" کی جگہ "گم ہو نہ جائے" ہونا چاہئے۔ صفحہ ۳۸ کی سطر ۴ میں "دینا ہور" کی بجائے "دینا ہدر" ہونا چاہئے۔

نظم "مسلک تسلیم" کے آخری بند کا یہ شعر درج ہونے سے رہگیا ہے ؎

تیری حقیقت ہی کیا اور ہے کیا اختیار
بندۂ الم سی مخل اس سے نہیں کوئی سود

ایڈیٹر

لہو کی بوند

جلوۂ رخ کو میں رنگینیٔ بستاں نہ کہوں
پرتوِ حسن کو آئینہ حیراں نہ کہوں
گردشِ چشم کو پیمانۂ رقصاں نہ کہوں
وسعتِ وحشتِ خاطر کو بیاباں نہ کہوں

لیلیٔ عشق بنوں آہوئے صحرائی ہوں
بزمِ قدرت کے کرشموں کا نہ شیدائی ہوں

بھر رہا ہے گلِ مقصود کو داماں میں کوئی
ایک گلگوں لئے بیٹھا ہے گریباں میں کوئی
لذتِ اندہ و طربِ محفلِ خوباں میں کوئی
محوِ اندوہ و الم فرقتِ جاناں میں کوئی

کوئی سرگرم فغاں ہے تو کوئی ہے دل شاد
لب پہ نغمہ ہے کسی کے تو کسی کے فریاد

تھا اسی فکر میں غلطاں کہ سرِ راہ گذر
مجھکو اک شاخ پہ آیا گلِ صد چاک نظر
جابجا داغ تھے سرخی کے نمایاں جس پر
اور شبنم کے چمکتے تھے درخشاں گوہر

موجِ نکہت میں تھے گیسو کی طرح پیچ و تاب
اس کا ہر داغ تھا رعنائی میں گلشن کا جواب

منظر اک عالمِ عبرت کا دکھایا اس نے
دیدۂ شوق کو مبہوت بنایا اس نے
اپنا افسانۂ غم گو نہ سنایا اس نے
جنبشِ لب سے مگر اتنا تو بتایا اس نے

ساغرِ عیش نہ تصویرِ سبو کی ہوں میں"
صفحۂ دہر میں اک بوند لہو کی ہوں میں"

زیر اب تک نہ ہوئی ہمتِ مردانہ مری
غیرتِ دل سے سبق لیتا ہے پروانہ مری
خاک کے ذروں سے لپٹا تھا کبھی دانہ مری
اس کے ہر پھول میں ہے نکہتِ مستانہ مری

رہا محفوظ یہ گلچیں کی جفا سے اب تک"
اس کی شاخیں نہ جھکیں دستِ صبا سے ابتک

کشتۂ تیغ جفا سے مری توقیر کو پوچھ
رہرو ملک عدم مری تنویر کو پوچھ
گردش چرخ سے جاکر مری تاثیر کو پوچھ
بسمل خستہ جگر سے مری تفسیر کو پوچھ
شمع ملت کی مرے داغ میں تابانی دیکھ
میرے ذرات میں آئین جہانبانی دیکھ

محمود (اسرائیلی)

مناظرۂ نظم و نثر

ذیل کا دلچسپ مناظرہ پروفیسر نواب علی صاحب کا غیر مطبوعہ ہے جو ۱۹۰۲ء میں لکھا گیا تھا ہم کو جناب نظام الحق صاحب عباسی جبرت (احمد آبادی) کی معرفت موصول ہوا ہے جس کو ہم شکریہ کے ساتھ درج رسالہ کرتے ہیں۔

پروفیسر صاحب موصوف کا نام دنیائے صحافت میں کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے آپ متعدد کتب کے مصنف ہیں اور عرصے سے بڑودہ کالج میں فارسی کے پروفیسر ہیں۔

(ایڈیٹر)

لطف شام اودہ اک روز اُٹھانے نکلا
لب جو ایک عجب میں نے تماشا دیکھا
دو جواں نور کے سانچے میں ڈھلے آئے نظر
آسماں سے اُتر آئے تھے فرشتے گویا
قدِ موزوں میں عجب ایک کے تھی رعنائی
دوسرا نام خدا لو لوئے منثور اتھا
حضرتِ نظم تھے اک دوسرے مولانا نثر
نام ہر ایک کا تھا ٹوپیوں میں اُنکے کڑھا
بحث کرتے تھے کہ کسکو ہے فضیلت ہم میں
کون ہے گرمیٔ ہنگامۂ بزم اعلےٰ
حضرتِ نظم لگے کہنے کہ ہم "موزوں" ہیں
اسی باعث سے تو بھاری ہے ہمارا پلّا
میری موزونی پہ آتی ہے طبیعت سب کی
اور یہ مضموں ہے تمہارا کہ "میں آیا تھا"
بحث لفظی سے نہیں بحث ہے صاحب ہم کو
ہم معانی و مطالب کے ہیں سچے شیدا

مثنوی دو جہاں معنوی صورت اپنی، ‏ اللہ اللہ یہ ظرف اور دماغ اعلیٰ
میرے دریا سے ہوا کوئی جو سیراب اگر ‏ تا ابد زندۂ جاوید بلا شبہ ہوا
جتنے ہیں ذاکرہ مذکور مری محفل میں ‏ ان کا رہتا ہے صدا بزم جہاں میں چرچا
سعدی و حافظ و جامی و نظامی ہیں کہاں ‏ چار سو نام کا پر ان کے ہے بجتا ڈنکا
میں نے رستم کا کیا نام جہاں میں روشن ‏ پہلواں تھا کوئی ورنہ کسی گوشہ میں پڑا
گردش چرخ سے ملتا نہ پتہ بھی لیکن ‏ کوکب بخت زلیخا مرے دم سے چمکا
بزم میں میری غزل مطرب عیش و عشرت ‏ رزم میں میرا رجز جنگ و جدل کا قرنا
میں نے جب ہومر و ملٹن کے لگایا سرمہ ‏ دور کی سوجھی اندھیرے میں ہوئی ایسی جلا
ڈینٹی میرا ہی شاگرد تھا جس نے بے مثل ‏ جنت و دوزخ و اعراف کا نقشہ کھینچا
جلوۂ حسن معانی نظر آیا کیا خوب ‏ میں نے اسٹیج پہ جب شیکسپیر کو بھیجا
اور تو کیا کہوں تھا اپنا زمانہ بھی کبھی، ‏ ہندو یوناں میں سمجھتے تھے مجھے جب دیوتا
جمگھٹے رہتے تھے ہر وقت پری رویوں کے ‏ اور میں ان میں کنہیا کی طرح پھرتا تھا
لوٹ میں نے ہی لیا صبر و قرار عشاق، ‏ میں نے عالم میں محبت کی ہے دی آگ لگا
آن واحد میں مجازی کو حقیقی کردوں ‏ بندۂ بت کو بنا دوں میں خدا کا بندا
آپ فرمائیے کس بات پہ ہے ناز جناب ‏ کچھ فضائل تو بیاں کیجے سنیں ہم بھی ذرا
جوش میں آکے لگے کہنے یہ مولانا نثر ‏ چڑھ گئی آج زیادہ ہے جناب والا
گر سناؤں تمہیں تھوڑے سے فضائل اپنے ‏ آپ کی ساری تعلی کو دکھا دوں نیچا
آپ کو ناز بہت اپنی ہے موزونی پر، ‏ میرے مضموں کو بتاتے ہو کہ ہے وہ اکھڑا
رول دوں موتیوں کو میں ہوں وہ بحر زخار ‏ آپ ڈنڈی کی ترازو کی خبر لیجئے جا
میں تصنع سے معرا ہوں برنگ خورشید ‏ آپ پہنے ہوئے ہیں قوس قزح کا جوڑا
میرے جملے سے مسیحا نے جلائے مردے ‏ آپ زندوں کو کریں زندۂ جاوید تو کیا
میں ہوں مشتقی ارسطو و قلم افلاطون، ‏ فاریابی کا بیاں نسخۂ ابن سینا،
برک کی یاد ہیں وہ برق صفت تقریریں ‏ یاد خسرو کی ذرا سحر بیانی کرنا

علم دیں میں نے جلایا وہ غزالی ہوں میں — نام قرآن میں ہے نکلا مرا قاضی بیضا
روم و ایراں مرے خطبوں سے لگے تھرانے — تخت قیصر ہے نہ اب باقی ہے تاج کسریٰ
دی اذاں مصر کے اہرام پہ چڑھ کر میں نے — گونج اٹھا سارا جہاں صل علیٰ صل علیٰ
طفل ہوں، یا ہوں جواں، پیر ہوں تلنبہ ہیں غرض — کلمہ پڑھتا ہے ہر ایک بزم جہاں میں میرا
اور میں کچھ نہیں کہتا ہوں بس اک بات مری — اور سن لیجئے پھر آپ ہی سمجھیں جیسا
للہ الحمد شرف مجھ کو ہوا یہ حاصل — مری آغوش میں قرآن ہے خدا نے رکھا

حضرت نظم یہ سن کر ہوئے کچھ سرخ مگر
میں نے جب رنگ یہ دیکھا تو وہیں بیچ میں جا

یوں کہا میں نے کہ تیوری پہ نہ بل آئے ذرا — ورنہ پھر بحث کا بیچ پوچھئے کیا لطف رہا
خلط مبحث ہی تناقض کا سبب ہوتا ہے — افضلیت ہے الگ ذکر فضائل ہے جدا
سچ اگر پوچھئے دونوں کے دلائل ہیں قوی — ہے ہر اک تم میں سے آنکھوں کا ہماری تارا

نظم "دل" آپ ہیں نثر آپ ہیں بے شبہ "دماغ"
دل۔ دماغ آدمی کے ہیں یہ تو اعضائے اعلیٰ

سید نواب علی (از بڑودہ)

گوہر اشک

سرد چلتی تھی ہوائیں اور اندھیری رات تھی — سو گئی تھیں برف کے بستر پہ کرنیں چاند کی
ہو کا عالم، چاند ارا آتا نہ تھا کوئی نظر — ایک سناٹا سا تھا چھایا ہوا سب دہر پہ
ایسی خاموشی میں ایک نا طورۂ ناز آفریں — گھر سے اپنے باہر آئی با دل اندوہ گیں
شہر سے باہر چلی شہر خموشاں کیطرف — مدفن عاشق کو یعنی کوئے جاناں کیطرف
نازنین گلبدن آرام جاں کی قبر پر، — بیٹھ کر آنسو بہانے لگ گئی با چشم تر
برف کے مانند قطرہ اشک کا اک جم گیا — صبح کو سورج کی کرنوں نے اسے چمکا دیا
اتفاقاً اک فرشتے کا ہوا اس پر گذر — دیکھ پایا اس نے وہ اشک درخشاں قبر پر
جھٹ اٹھا کر لے لیا اس نے وہ دُر بے بہا — اور وہ اس کے تاج سر کے واسطے زینت بنا

اے گلزمین ڈھاکہ

(مولوی محمود الرب صاحب خالد بنگالی)

انوار زندگان ہین زیب جبین ڈھاکہ　　انجم نشان نہ کیون ہو مینو نشین ڈھاکہ
آنکھون مین کھُب گیا ہے نقش حسین ڈھاکہ　　اُف دلنواز طرز ناز آفرین ڈھاکہ
پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

ہر شان دل نشین ہے ہر آن دلربا ہے　　مغلیہ دور کا تو وہ نقش جانفزا ہے
ظاہر یہین یہین سے انداز اک جدا ہے　　پنہان ادا ادا مین تہذیب ایشیا ہے
پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

دشمن فلک سے اب بھی گرم ستیز ہے تو　　اس دور مین بھی کان اہل تمیز ہے تو
مشرق کے دایرے مین وہ ایک چیز ہی تو　　بنگالہ جسم ہے اور جان عزیز ہے تو
پورب کی جان تو ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

قسمت کے ہین فروزان تجھ مین چراغ کتنے　　گہوارہ گیر تیرے روشن دماغ کتنے
سرگشتگان ساقی ہین باغ باغ کتنے　　معمور کتنے شیشے لبریز ایاغ کتنے
پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

خاک وطن کا شیدا تجھکو نعیم جانے　　لطف و دوام سمجھے فیض عمیم جانے
نکہت کو جیسے گل کی باد نسیم جانے　　روحانیت کو تیری طبع سلیم جانے
پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

کس کس کو کھینچ لائی جا کر ہوا چمن کی　　شمعون کی روشنی سے زینت بڑھی لگن کی
گو قصے مین چھیڑدین تو رونق ہو انجمن کی　　وہ طرفہ داستانین ہین تیرے بانکپن کی
پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈھاکہ

جو تیری غیر فانی توقیر جانتے ہین　　اک مشت خاک کو بھی اکسیر جانتے ہین

رنگین مزاج دلکش تصویر جانتے ہیں — یا خواب عنبریں کی تعبیر جانتے ہیں

پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈہاکہ

کرتے ہیں ذکر جنکا اب ہم بڑی ہبلی میں — ذرے ہیں جن کے روشن اس خاک صندلی میں
خوشبو بسی ہے جن کی ہر پہول ہر کلی میں — پہرتی ہیں انکی روحیں تیری گلی گلی میں

پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈہاکہ

دوش صبا کی چادر یا رب سرک نہ جائے — پہولوں میں سونیوالی ساحل پہ تہک نہ جائے
رندونکی سرخوشی سے واعظ بہک نہ جائے — لہرا رہی ہے گنگا ساغر چہلک نہ جائے

پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈہاکہ

سیلاب باغ و صحرا پاک جگر کو سیلے — آکر کنارہ گنگا پہر ایک جام پی لے
آنکہیں ہیں کچہ رسیلی منظر ہیں کچہ رنگیلے — عنابی انگلیوں میں دامن ہیں کتنے نیلے

پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈہاکہ

ہیں لال لال سڑکیں یا کہل رہی ہے ہولی — ڈوبی ہوئی شفق میں یا ہے دلہنک کی چولی
یہ گھر ہیں کہ جگمگاتی شکلیں یہ بہولی بہولی — ڈہاکہ تو شہر ہے یا مالن کی کوئی جہولی

پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈہاکہ

ہیں شام میں یہاں کی شام اودہ کے جلوے — فطرت کے موقلم سے اترے ہیں خوب چہرے
کہنچتے ہیں دور سے دل سنتے ہیں جب فسانے — تیری لطافتوں کے تیری نزاکتوں کے

پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈہاکہ

رعنا کی دلکشائی شیشے پہ آب صیقل — "یا نخلہ کہن سے ہوتی ہے دُہری کونپل
ناقابل تحمل کیوں ہو نہ تازہ جدول — نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول"

پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈہاکہ

محفل میں دوستونکی کیا میں کبہی نہ ہونگا — ڈہاکہ کی شہرت کا انکار کب سہوں گا
سچی جو بات ہوگی کیوں بے کہے رہونگا — سو میں کہونگا خالدیں لاکہہ میں کہونگا

پورب کی جان ہے تو اے گلزمین ڈہاکہ

غزلیات

(از جناب محمد یوسف صاحب ناظم لکھنوی)

تجھے کس نے جانا کہ مانا نہیں ہے — تجھے کس نے مانا کہ جانا نہیں ہے
یہ دید اور وا دید کی داستانیں — بجز ذکر دیروز و فردا نہیں ہے
سُنی ہمنے "دیدار" تعبیر جس کی — یہ وہ خواب ہے، جو کہ دیکھا نہیں ہے
محیط و محاط ایک کیوں کر بھلا ہو — کہ قطرہ حقیقت میں دریا نہیں ہے
سمجھتا ہے جو نحن اقرب کا مطلب — اسے ڈھونڈھنے دور جانا نہیں ہے
میری سادہ لوحی تجسس ہے اس کا — جسے ڈھونڈھنا ہی ہے پانا نہیں ہے

نہ کہہ کر انا الحق تماشا ہو ناظم
تجھے دیکھنا ہے دکھانا نہیں ہے

(خاکسار عبد الرحمن خوشتر منگرولی مدیر رسالہ ہذا)

حسینوں کے مرقع میں تری تصویر اچھی ہے — میں عاشق ہوں ترا کتنی مری تقدیر اچھی ہے
ادھر مضطر ہوا میں اور اُدھر وہ گھر سے چل نکلے — مری آہِ رسا میں آجکل تاثیر اچھی ہے
نزاکت سے نہ جب شمشیر اُٹھی دستِ نازک سے — تو جھنجھلا کر کہا کم بخت کی تقدیر اچھی ہے
مزے لیتا ہوں دید و گفتگو کے وقتِ تنہائی — مری ہمدم فراقِ یار میں تصویر اچھی ہے
بُرا میں ہوں مگر تم سے حسینوں پر جان دیتا ہوں — تم اچھے ہو مگر تم سے مری تقدیر اچھی ہے

ہمیشہ خوش جمالوں میں بسر ہوتی ہے اے خوشتر
مقدر کا دھنی تو ہے تری تقدیر اچھی ہے

منتخبات

مکتوب مہدی

تحصیل بارہ - ضلع الہ آباد
۸ مارچ ۱۹۱۶ء

پیارے دلگیر

خط ملا، تھوڑی دیر کے لئے آپ کی پیدا کردہ حرارت میری رگوں میں بجلی کی رو دوڑا دیتی ہے لیکن اس قدر بے کیف ہو رہا ہوں کہ آپ باوصف خلوص وہاں بیٹھ کر، اندازہ نہیں کر سکتے۔
آشنائے سخن کو سابقہ بھی پڑا تو کس سے؟ ڈیڑھ سو برس کی بڑھیا یعنی قانون سے، جس کے چہرے کی جھریاں میرے دماغ میں گرہیں ڈالتی ہیں۔
بھئی، ۲ اپریل تک ضبط کیجئے، آخری موقع (چانس) ہے۔ یا تخت یا تختہ! تحصیلداری کی ہوس نہیں، لیکن غیرتِ نفس گوارا نہیں کرتی کہ کسی سے گھٹ کر رہوں، لاج آپڑی ہے، خدا بات رکھ لے، پھر میں آپ کا ہوں اور جہاں تک باتیں بنانے کا تعلق ہے، نقاد میرا۔
بعض سرخیاں جو میں آپ کے لطف طبع کے لئے لکھ دیتا ہوں، یہ صرف اس لایق ہیں کہ شوخیٔ تحریر کے لحاظ سے "مطائبات نثر" کے تحت میں کبھی کبھی ان کو جگہ دیجئے۔ لیکن یہ چیزیں ایسی نہیں جو کسی ادبی رسالہ کے لئے نفسِ ادب کے لحاظ سے مقصود بالذات ہوں، لیکن افسوس یہ ہے کہ تصنیفی عہد کا شبلی کے ساتھ خاتمہ ہو گیا!
موجودہ نسل قدیم لٹریچر بالکل نہیں جانتی اور کتنی ہی روشن خیالی ہو بے گھر کی پونجی (اریجنیلیٹی) کے کام نہیں چلتا، جس نوجوان گروہ کے ہاتھ میں قلم ہے، اسے زیادہ سے زیادہ "عیب پوش" سمجھئے، یعنی معلومات اور قابلیت کے لحاظ سے ایک انچ بھی نہیں لیکن چاہتا ہے کہ ایک فٹ نہیں ایک گز سمجھا جائے۔ ایک آدھ مستثنیات لایق غیرت کہیں ہوں تو اُن سے کام نہیں چلتا۔
ماجد بی۔ اے کی دوسری کتاب فلسفۂ اجتماع آپ نے دیکھی؟ یہ البتہ ہونہار ہے .. .. اور ایک دن حکمائے ادب میں پیش پیش ہوگا اس لئے کہ اس میں گہرائی موجود ہے، نری باتیں بنانا نہیں جانتا۔

نیازؔ سے کیا فرمایش کروں، وہ صحیح مذاق تصنیف کی طرف نہیں آتے۔ "عہد زرین یعنی عباسی دور کے ارتقائے دماغی" پر لکھوائیے۔ بہتیرے سنجیدہ عنوان ہیں۔ لیکن لکھنے والے کہاں سے آئیں گے؟
میں یورپ کی مدد سے کام چلا سکتا ہوں لیکن پہلے بارہ چھوڑ آئیے اور اکبر آباد کے کٹڑے میں میوے کی دکان کھلوا دیجئے۔
لطیف صاحب سے (جن کا پتہ سمجھ میں نہ آیا، ڈھولی کھار۔ کیا چیز ہے؟ بار کا دروازہ اور پاسے نگس کی تیلیاں!)
کہدیجئے گا جس قسم کا ٹھوس لٹریچر وہ چاہتے ہیں، مواد کی کمی نہیں، لیکن پہلے پائیر کا سا خوش سواد اور نشاط افزا دفتر اور پائین باغ پیدا کر دیجئے اور اسی کے قدر دان نہیں صرف پڑھنے والے دیجئے جو سر بکف نہیں زر بکف ہوں، پھر جو آپ چاہتے ہیں، نہ ہو تو میرا ذمہ!!
رہی چھم چھم (یا اُن کی کھٹ کھٹ) یہ جاتے ہوئے نشۂ جوانی کا اترا ہوا خمار ہے جو کبھی کبھی "صحافی" کی اوٹ میں بے نقاب ہو جاتا ہے۔
میرے سب سے پہلے مضمون کا عنوان ان شاء اللہ "ادب الاساتذہ" ہوگا۔ نیازؔ اگر عہد زرین کو نہ سنبھال سکیں تو یہ عنوان دیجئے:۔

"کل جو گذر گئی۔ بے کار۔ جو آنے والی ہے غیر اختیاری ہے زندگی تو آج صرف آج کا نام ہے!"

میں تم سبھوں کی بے غایت شاعری سے اسی لئے تو جلتا ہوں کہ کام کی بات آتی نہیں یا کرنی نہیں چاہتے اچھا خاصا انسان، ہیولیٰ ہو کر رہ جاتا ہے۔
ہاں یہ آج کل آئے دن آپ کی "آنکھیں کیوں دکھتی ہیں" کیا کسی نے "نمک کی چاٹ پر لگا یا ہے"
لطیف صاحب کو یہ چند سطریں دکھا دیجئے گا، ان کے خط کے ایک ضروری حصے کا جواب رہ گیا تھا۔ گورکھپور۔ نقاد کے لئے لکھتا ہوں، جواب باصواب پر آپ کو اطلاع دونگا۔

بہترین خواہشات کے ساتھ
ہمیشہ آپ کا
مہدی

(علیگڈھ میگزین)

اخبار علمیہ

دنیا کا سب سے بڑا مطبع

واشنگٹن (امریکہ) میں دنیا کا سب سے بڑا مطبع قائم ہے جس کی رفیع الشان ہفت منزلہ عمارت میں کام کرنے والوں کی تعداد چار ہزار ہے۔ ایک سو چوالیس ٹائپ جانے کی مشین اور ۲۲۵ مصحح ہیں۔ ایک خاص شعبہ ۱۵ ہزار محکمہ جات مال کے لئے آفیشل کاغذات کی چھپائی کے واسطے مقرر ہے جو علاوہ ازیں تمام ریاست ہائے متحدہ کے آفیشل کاغذات چھاپتا ہے۔ اس مطبع میں کارڈ چھاپنے کے لئے ایک علیحدہ شعبہ مقرر ہے جو ایک دن میں چالیس لاکھ کارڈ چھاپتا ہے ایک شعبہ صرف ٹکٹین چھاپنے اور ان کو رنگنے اور گوند چپکانے کے لئے مخصوص ہے مطبع کا ایک شفاخانہ بھی ہے جو وہاں کے کام کرنے والوں کے علاج معالجہ کی غرض سے قائم کیا گیا ہے۔

(الزہرا)

کرۂ زمین کی عمر

ڈاکٹر ایف۔ آر۔ مولٹن نے جو شکاگو یونیورسٹی کے فلکیات کے پروفیسر ہیں حال ہی میں اپنی ایک تقریر میں بیان کیا کہ زمین آج سے تقریباً دس لاکھ ارب برس تک قائم رہے گی ان کی رائے ہے کہ زمین ایک چھوٹا سا بچہ ہے جس کی عمر طبیعی کا ابھی صرف بیس لاکھواں حصہ ختم ہوا ہے زمین سے جو معدنیات نکلتے ہیں خصوصاً ریڈیم ان سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ اس وقت زمین کی عمر صرف دو ارب سال کی ہوتی ہے۔ ستاروں کی تعداد، ان کا بُعد اور وہ جس تیزی سے ایک دوسرے کے گرد گردش کرتے ہیں اس سے اندازہ کیا جاتا ہے کہ دس لاکھ ارب سال کے بعد ایک وقت آئے گا جبکہ ستارے آپس میں اسقدر نزدیک ہو جائیں گے کہ ان میں باہم تصادم ہو جائے گا اور وہ ایک .... دوسرے کو فنا کر دیں گے۔ اسوقت کرہ زمین بھی ان کی زد سے محفوظ نہ رہ سکیگا۔ چنانچہ دس لاکھ ارب سال کے بعد زمین کا وجود بھی باقی نہ رہے گا۔

(موڈرن ریویو)

زبان خلق

ہم اس عنوان کے تحت قدر دانان علم وادب اور نقادان فن کی ان بیش بہا آراء کو مستقل طور پر درج کیا کریں گے جو زبان کے محاسن و معائب پر اپنے آزادانہ خیالات کا اظہار فرما کر ہمیں شکریہ کا موقع دیں گے۔

ذیل میں ہم اپنے کرمفرما جناب سروش صاحب لکھنوی کا مضمون "زبان کاٹھیاواڑ" شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہوئے ہم ان کے لفظ لفظ سے اتفاق کرتے ہیں لیکن یہ سب اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ ابنائے ملک (اہل کاٹھیاواڑ) بھی اس ضرورت کو محسوس کریں۔ جیسا کہ ہمنے اپنے پہلے نمبر کے افتتاحیہ میں گذارش کردی ہے۔ بہرکیف اگر اہل کاٹھیاواڑ نے ہماری حوصلہ افزائی کی اور ہماری اس محنت کی داد دی تو ہم اپنی تمام خدمات اہل کاٹھیاواڑ کیلئے وقف کردیں گے۔

ایڈیٹر

زبان کاٹھیاواڑ

(چند مشورے اگر مانے جائیں)

خوشتر صاحب کو یہ یقین دلانا جب میری طاقت سے باہر ہو گیا کہ آج کل میں ایسی حالت میں ہوں، کہ دماغی محنت کر ہی نہیں سکتا تو ناچار، چند سطریں ان کے لئے لکھنا ہی پڑیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ، اب تک سمجھ میں نہیں آتا، کہ لکھوں کیا۔ ایک ایسے خطے میں جہاں کی زبان گجراتی ہے، ایک اردو رسالے کے اجرا پر مبارکباد دوں، یہ نہایت ہی معمولی بات ہے۔ چلئے وہ بھی دی جاچکی۔ رسالے کی کامیابی کی دعا کروں، وہ تو ایک رسمی بات ہے۔ وہ بھی ہوچکی۔ بہتر یہ ہے کہ کوئی ایسی بات لکھی جائے، جو چاہے نئی نہ ہو، مگر مفید ضرور ہو۔

یہ رسالہ ایسے مقام سے جاری ہوا ہے، جہاں کے رہنے والے اگرچہ اُردو نہیں جانتے، مگر یہ بات تو ثابت نہیں ہوئی ہے، کہ انہیں اردو سیکھنے کا شوق بھی نہیں ہے۔ منگرول کی اسلامی ریاست نے مانا کہ، اُردو کی ایسی خدمت نہیں کی، جو ذکر کے قابل ہو، لیکن اردو کے خادموں کی قدر تو ضرور ہی کی ہے۔ وہ اس طرح کہ فردوس مکان سابق نواب صاحب کے زمانے میں لکھنؤ کے دو نامی شاعر **جلال** اور **شمشاد** اس ریاست کے ملازم تھے۔ میں نے

سنا ہے، نواب صاحب مرحوم خود بھی شعر کہتے تھے اور یہ بھی سنا ہے کہ وہ مرثیہ بھی خوب پڑھتے تھے ۔ ع

ع مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

جانتا بھی ہوں، سنا بھی ہے، اور کہیں پڑھا بھی ہے کہ لکھنؤ کے یہ دونوں باکمال شاعر جن کا ذکر ابھی ابھی ہوا ہے، منگرول میں اپنی زندہ یادگاریں بھی چھوڑ گئے ہیں۔ دو صاحبوں کا ذکر تو میرے ایک دوست نے کیا تھا۔ اگر میری یادداشت میرے ساتھ بے وفائی نہیں کرتی، تو یاد پڑتا ہے کہ ایک صاحب کا تخلص **جنون** ہے اور دوسرے کوئی **سید** صاحب ہیں۔ میں ان صاحبوں سے واقف نہیں، مگر **جلال** مرحوم کا ہم وطن ہونے کی بنا پر اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ان دونوں صاحبوں کو اس پرچے کو پوری مدد دینا چاہیئے۔

میں یہ مشورہ دوں گا کہ اس پرچے کو خوشتر صاحب کاٹھیاواڑ کے اردو جاننے والوں کے لئے اور خاص ...... منگرول والوں کے لئے وقف کر دیں جہاں تک ہو سکے انہیں سے مضمون لیں، وہ چاہے نظم ہو، یا نثر، اور انہیں کے مضمون چھاپیں۔ کوئی ضرورت نہیں باہر والوں کے ایسے مضامین کی جن کا مقصد لکھنے والوں کے لئے تو لیاقت کی نمائش ہو اور بچارے کاٹھیاواڑ والوں کو ان سے کوئی فائدہ نہ پہنچے۔ کوئی مانے یا نہ مانے میں تو "اپنے پھٹے پرانے لباس کو دوسروں کے مانگے تانگے کے خلعت سے بہتر سمجھتا ہوں" اور یہی شیراز کے ایک بڑے تجربہ کار کا کہنا ہے کہ ؎

کہن خرقۂ خویش پیراستن بہ از جامۂ عاریت خواستن

یعنی "مانگے تانگے کے لباس سے اپنا پرانا دھرانا زیادہ اچھا ہے۔

خوشتر صاحب کو میں یہ بھی مشورہ دوں گا کہ اس رسالے کا بڑا حصہ نثر کے مضمونوں سے بھرنا چاہیئے اور لکھنے والے صرف منگرولی یا کاٹھیاواڑی ہونا چاہیئے۔ وہ پھر چاہے جیسی زبان میں لکھے جائیں ایڈیٹر صاحب کا فرض ہے کہ ان کی زبان سدھار کر انہیں چھاپیں۔ آپ پوچھیں گے آخر وہ لکھیں کیا؟ میں جواب دوں گا، لکھنے کو مضمون بہت، اور کچھ نہیں تو منگرول کا جغرافیہ ہی سہی۔ آپ پوچھیں گے اس میں کیا دھرا ہے؟ میں کہوں گا سب کچھ ہے۔ اب سمجھ لیجئے آپ یہ. صاحب کے دفتر سے نکلتے ہیں اور سارے شہر کی سیر کرتے ہیں بس جو آپ دیکھیں وہی لکھ دیں۔ یہاں کی چھوٹی گلیاں یہاں کے بڑے رستے۔ یہاں کی عالی شان عمارتیں، یہاں کے پرانے کھنڈر۔ یہاں کے امیروں کے محل، یہاں کے غریبوں کے جھونپڑے، یہاں کے آباد مقام، یہاں کے ویران ٹھکانے یہاں کے ہرے بھرے باغ یہاں کے اجاڑ جنگل، اس کے سوا آپ جو دیکھیں وہ لکھیں، میں نے تو منگرول دیکھا بھی نہیں میں کیا جانوں یہ ایک ایسی کام کی چیز ہو جائے گی، جو منگرول کی ایک اچھی یادگار رہو گی۔

اس رسالے کی زبان اول سے آخر تک کم سے کم ایسی ہو، جیسی اس مضمون میں میں نے لکھی ہے۔ یعنی بالکل آسان

جیسے بچے بوڑھے جوان سب سمجھیں، تھوڑی بہت اُردو پڑھے ہوئے پڑھ لیں، اور اُردو نہ جاننے والے بھی پڑھوا کے سُن لیں۔ یاد رہے کہ اس کی زبان ہرگز ہرگز ایسی نہ ہو جسے کاٹھیاواڑی مسلمان نہ سمجھ سکیں! کیا اچھا ہو، اگر اس پرچے میں یہ خصوصیت (خاص بات) پیدا ہو جائے کہ اس کے سب مضمون چاہے وہ نظم میں ہوں، یا نثر میں فارسی عطف اور اضافت سے پاک ہوں۔ ایسا کرنا بے شک آسان تو نہیں ہے، مگر مہربانی کرکے میرے اس مضمون کو آپ پھر ایک مرتبہ پڑھ جایئے، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تھوڑی سی کوشش میں ایسے مضموں لکھے جاسکتے ہیں۔

ہر کاٹھیاواڑی مسلمان کو چاہیئے کہ اگر وہ اُردو کی کچھ بھی خدمت کرنا چاہتا ہے تو اس رسالے کو ضرور خریدے اور ایڈیٹر کا ہاتھ بٹائے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر مانگرول میں اس کو ۵-۶ سو خریدار مل جائیں تو یہ رسالہ بہت کچھ کام کر سکتا ہے۔ مانگرول اور کاٹھیاواڑ کے اردو جاننے والوں کو چاہیئے کہ اس میں برابر مضمون لکھا کریں۔ وہ دن بے شک بڑی خوشی کا ہوگا، کہ میں اسے اول سے آخر تک منگرولیوں ہی کے مضامین سے بھرا ہوا دیکھوں گا۔

مجھ جیسے اور لکھنے والے، جن سے ایڈیٹر صاحب نے قلمی مدد مانگی ہو، میں ان سے بھی یہی درخواست کروں گا کہ وہ جہاں تک ہوسکے، آسان زبان میں لکھنے کی کوشش کریں۔ مجھے حقیقت میں بالکل فرصت نہیں ہے ورنہ میں کوئی خاص مضمون لکھ بھیجتا، مگر پریشانیاں دور ہونے پر، وعدہ کرتا ہوں، کہ میں زبان کو بھولنے والا نہیں۔

سروش (لکھنوی)

مخدومی ایڈیٹر صاحب زبان! تسلیم

زبان کا پہلا نمبر میری نظر سے گذرا، میری خوشی کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ کاٹھیاواڑ سے اُردو کا ایک ایسا دلفریب دیدہ زیب پرچہ آپ نے نکال کر ہماری زبان پر احسان کیا ہے۔ رسالہ کے حسن ترتیب سے آپ کے ذوق سلیم اور شوق ادب کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ مختلف مستقل عنوانات قایم کرکے آپنے رسالہ میں جو تنوع پیدا کر دیا ہے وہ بہت دلکش ہے۔ مقالات میں "علم اور اسلام" والا مضمون پُر مغز اور کار آمد ہے، ادبیات میں "شوالہ" نہایت دلپذیر فسانہ ہے اور حضرت خالد کی "ہستی معصوم" تو اپنے غیر فانی لٹریچر کے لحاظ سے قطعی اس عالم کی چیز نہیں معلوم ہوتی!

اُن کی کس کس نازک خیالی کی داد دوں؟ حیران ہوں۔

میں آخر میں آپ کو اس پاکیزہ رسالہ کی اشاعت پر دلی مبارکباد دیتا ہوں۔

خادم ادب

سید احتشام الدین شاہ اکبر آبادی (مسلم یونیورسٹی علیگڈھ)

زبان

جلد ۱ | فہرست مضامین ماہ ستمبر ۱۹۲۶ء | نمبر ۳

زبان خلق

اکثر حضرات ملّا صاحب کو صرف "ملّا موزی" اور گلابی اُردو کے موجد کی حیثیت سے پہچانتے ہیں لیکن ہم جس حیثیت سے پہچانتے ہیں اس بنا پر اس بات کے کبھی قائل نہیں ہو سکتے کہ ملّا صاحب سوائے اپنے مخصوص رنگ کے سنجیدہ اور متین عبارت نہیں لکھ سکتے ہم اگر چاہیں تو آج ہی اُن سے اعلیٰ سے اعلیٰ مضمون لکھوا سکتے ہیں اور انشاءاللہ آئندہ کسی اشاعت میں اُن کا علمی مضمون قارئین "زبان" کی خدمت میں پیش بھی کرینگے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ دنیا ان کو اُسی رنگ میں دیکھنا چاہتی ہے جس رنگ میں کہ وہ دنیائے صحافت میں مشہور ہوئے ہیں۔ اس لئے "زبان" میں بھی اُن کا اصلی ہیت میں آنا مناسب نہیں معلوم ہوتا اگرچہ زبان ایسے علمی رسالہ میں ملّا صاحب کے مطالبات کچھ ناموزوں سے معلوم ہونگے لیکن بفحوائے الملح فی الکلام الملیح فی الطعام ناظرین کی ضیافت طبع کی خاطر ہر ماہ "نکات" کے زیر عنوان پیش کیا کرینگے۔

آپ کے نکات میں صرف دلبستگی تفنن طبع اور غم غلط کرنے ہی کا سامان نہ ہو گا بلکہ اس میں بعض ایسے نکتوں کا حل بھی ہو گا جسکو ارباب بست وکشاد بھی حل نہیں کر سکتے۔

ملّا صاحب "زبان" میں مستقل طور پر مضمون بھیجنے کا وعدہ کرتے ہوئے اپنے کرم نامہ میں ارقام فرماتے ہیں:۔

> آئندہ سے زبان میں "نکات" کے عنوان سے مستقل مضمون لکھا کروں گا اور اس کا مقصد یہ ہو گا کہ اس کے تحت ہر مہینے علم وادب اور تمدن ومعاشرت کے ایسے اچھوتے اور بصیرت فروز نکتے بتلائے جائیں گے جو شاذ کی حیثیت رکھتے ہیں البتہ فرق یہ ہو گا کہ اس کی عبارت میں اس امر کی خاص پابندی کی جائیگی کہ دن بھر کی تھکن یا قدرتی خشکی اور بلغم کی کمی سے آپ کے چہرہ پر قحط اور فاقہ کشی کے جو تین آثار پیدا ہو جاتے ہیں اُن میں "نکات" کے ظرافت انگیز فقروں سے ایک تازگی اور تنفنگی پیدا ہو جائے گی۔ .... فن انشا کا یہ اصول رہا ہے کہ ہر تحریر وتقریر میں اتنی ظرافت ضرور ہو جس سے باوقار یا خشک سے خشک مولوی صاحب

تک کے دانت باہر نکل آئیں کیونکہ جن لوگوں کو دن رات کے چار اوپر بیس گھنٹوں
میں ایک مرتبہ بھی ہنسی یا تبسم تک نہیں اور جو ہر دم غصے اور خموشی کے تام بوٹ بنے
رہتے ہیں سنا ہے کہ ان کے جنازے میں فرشتے بھی خوشی سے شریک نہیں ہوتے۔
یقین ہے کہ ناظرین زبان بھی ہمیں ایسی "متین ظرافت" کے اندراج کی اجازت دینگے۔

ایڈیٹر

اگر بدظنی اور بدگمانی میاں مجنوں اور مساۃ لیلیٰ بی تک ہی محدود رہتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا کہ اس کے پیدا ہو جانے سے طالب و مطلوب میں ایک "غیر خونریز جنگ" یا ایک "لطیف جھجک" پیدا ہو جاتی ہے بلکہ شعرائے اردو نے تو محبوب کی اس بدگمانی کو طالب کے لئے معراج کا درجہ عطا فرمایا ہے جو اسے اپنے طالب سے اس طرح ہو جائے کہ وہ سمجھے کہ "اب میرا طالب کسی دوسرے کا طالب ہے"، لیکن خدا بچائے اور بصیغہ فوری بچائے اس بدگمانی سے جو ایک ایڈیٹر اور ایک مضمون نگار کے درمیان پیدا ہو جائے کیونکہ اس کا نتیجہ اکثر یہی دیکھا ہے کہ دونوں اپنی اپنی جگہ پر مارے غصہ کے ڈنلپ ٹائر کی طرح پھول جاتے ہیں اور خط و کتابت تک بند!

ٹھیک ایسی ہی بدگمانی میرے اور ایڈیٹر صاحب رسالہ "زبان" کے درمیان واقع ہو گئی اور ممدوح گرامی کی دعوت پر جو میں نے مضمون نہ بھیجا اس کی وجہ کچھ تو میری ذاتی مصروفیت تھی اور کچھ میرا مرض "لکھواس"۔ یہ "لکھواس" بر وزن بکواس صحیح ہے اور جن لوگوں میں یہ مرض پیدا ہو جاتا ہے اُن کے لئے شاید یہ تصور کر لیا گیا ہے کہ وہ۔ کھاتے پیتے۔ چلتے پھرتے۔ اُٹھتے بیٹھتے۔ سوتے جاگتے بلکہ اونگھتے ہوئے بھی "فی الفور ایک عدد مضمون" لکھ سکتے ہیں گویا وہ مضمون نگار کیا اچھے خاصے "نولکشور پریس لکھنو" ہوتے ہیں کہ ڈھیر اڈھیر مضامین کے انبار تیار کر سکتے ہیں۔

جون ۱۹۲۶ء کی پندرھویں کو حضرت محترم مولینا خوشتر کا گرامی نامہ ملا کہ مضمون بھیجو رسالہ "زبان" جاری ہوتا ہے میں نے ارادہ کیا کہ جب رسالہ کا پہلا نمبر دیکھوں گا تو اُس کی عام حالت اور پالیسی کے اندازہ پر اُس میں مستقل سلسلہ مضمون شروع کر دونگا اگر اسوقت یہ کہدیتا کہ پہلا نمبر دیکھکر۔ تو شاید خوشتر صاحب اسکو میری ٹال سمجھتے اور ایک ایڈیٹر کے لئے مضمون نگار کی ٹال کسی "وبال آرزو" کے "وعدہ فردا" سے کسی طرح کم تکلیف

وہ نہیں ہوتی اگرچہ مجھ میں یہ دونوں نزاکتیں نہیں۔

البتہ میں نے یہ کیا اور اب سمجھا کہ بہت برا کیا کہ بس ع "خموشی معنی دارد" کا ڈپازٹ پارسل پیکٹ بن گیا خوشتر سمجھے اور کس قدر معقول سمجھے کہ ملا رموزی "باغی" ہو گیا اور دنیائے صحافت میں مضمون نگار باغیوں کی سزا یہی ہے کہ انھیں نظربند نہیں تو "رسالہ بند" ضرور کر دیا جائے کیا معنی کہ ان کے نام رسالہ بند کر دیا جائے لہذا عین اُسوقت جبکہ "رسالہ زبان" کا پہلا نمبر اپنے ناظرین کو بھیجا جا رہا تھا میں منہ کھولے اُس کا انتظار کر رہا تھا مگر وہ نہ آیا اور آہ کہ نہ آیا۔

۱۶ اگست ریاست کوروائی کے علم دوست اور معارف گستر تاجدار اعلیٰ حضرت ہز ہائنس نواب محمد سرور علیخاں بہادر بالقابہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو "رسالہ زبان کا پہلا نمبر باصرہ نواز ہوا بس ہم نے یہ پرچہ موصوف کے پرائیوٹ سیکرٹری صاحب کے بکس سے اس شرافت کے ساتھ چرایا کہ انھیں آج تک خبر نہیں۔ اور پھر پوری گھبراہٹ کے ساتھ اس کو از الف تا ی پڑھ لیا۔ پڑھ کیا لیا اچھا خاصہ چاٹ لیا ! ! !

رسالہ "زبان" کا پہلا نمبر دیکھکر جو چیز میرے لئے سب سے زیادہ حیرت انگیز تھی وہ حضرت خوشتر کا عزم راسخ، استقلال اور حوصلہ عمل کہ انھوں نے ایک ایسی سرزمین سے جو انھیں کے الفاظ میں "زمین شور" ہے زبان اردو کی خدمت کے لئے رسالہ "زبان" کو قوت سے فعل میں لانے کی کامیاب کوشش کی اور یہ خوشتر صاحب اور محض خوشتر صاحب کے ذوق کی پختگی تھی کہ وہ رسالہ "زبان کے اجرا میں اسی "زمین شور" سے کامیاب ہوئے جس پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

دوسری چیز رسالہ زبان کا رفیع تر معیار یا اُس کے مضامین کی بلند پائیگی ہے خوشتر صاحب نے رسالہ زبان کی ترتیب میں علو خیال اور متانت و سنجیدگی کو ملحوظ رکھا ہے وہ اُن کے اعلیٰ علمی ذوق کا ثبوت ہے۔
تیسری قابل احترام چیز اس کے وہ اردو دان اہل قلم اور سرپرست اصحاب ہیں خصوصًا ہمایوں جاہ نواب شیخ محمد جہانگیر میاں صاحب بہادر والی ریاست منگرول اور نواب زادہ شیخ عبدالخالق صاحب بہادر ولیعہد

منگرول کی رسالہ زبان کے ساتھ خسروانہ توجہات ہیں یہ تو صحیح نہیں کہ ہمارے موجودہ دیسی والیان ملک میں علم نوازی اور علم پروری کا قطعی نقدان ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ ایسے علم نواز والیان ملک خاص ہیں جنکی دولت اور فرصت علم و زبان کی دلچسپیوں اور ترقی کے لئے وقف ہے۔

فاضل مدیر رسالہ "زبان" نے اپنے مقابلہ افتتاحی میں علاقہ کاٹھیاواڑ میں تعلیم کی عموماً اور اُردو زبان کی خصوصاً جس کمی اور پستی کے اعداد و شمار پیش کئے ہیں ان کے دیکھنے سے اس امر کا تو افسوس نہیں ہوتا کہ اس علاقہ میں اردو زبان پست ہے، البتہ افسوس تو کاٹھیاواڑ کے اُن ذمہ دار افراد پر ہے۔ جن کی ذہنی حالت اب اس درجہ پست ہو چکی ہے کہ باوصف ذمہ داری کے اُن میں احساس نہیں اور اگر احساس ہے تو قوت عمل ماؤف ہو چکی ہے مسلمانان کاٹھیاواڑ کے علمی جمود و بے خبری اور ان کی غفلت و بے فکری کی اس سے زیادہ روشن مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ اُن کے علاقہ کا ایک ایسا شخص ایک رسالہ جاری کرتا ہے جو باعتبار اُس کی عظیم الشان مالی ذمہ داریوں کے اس کا ہرگز مستحق نہ تھا۔

لیکن جن کاٹھیاواڑی بھائیوں کو آج دولت، فراغت اور احساس کے خزانے حاصل ہیں کیا انہیں اپنے فرائض یاد ہیں؟ اگر یاد نہیں تو وہ اُٹھیں اور اپنے صوبہ کے ہر حصہ میں رسالہ "زبان" کی اشاعت کے لئے بورڈ اور ایجنسیاں قائم کریں قصبوں اور قریوں اور شہروں میں "اردو کلب" اور انجمن قائم کریں کیا کاٹھیاواڑی مسلمانوں کو معلوم ہے کہ آج سے صرف ایک سال ہی پہلے صوبہ بہار[1] میں اردو زبان کی یہی حالت تھی لیکن اسی ایک سال کے قلیل وقفہ میں پٹنہ سے ایک اردو اخبار جاری ہوا بلکہ وہاں ایک عظیم الشان "اُردو کانفرنس" بھی منعقد ہو چکی وہاں اُردو کی متعدد انجمنیں قائم ہو چکیں اور محض پٹنہ و بہار کے چند ذی حوصلہ افراد کی مساعی کا نتیجہ ہے کہ آج انگریزی حکومت کی انتظامی کونسل تک یہ سوال پہونچ گیا ہے اور مطالبہ کیا گیا ہے کہ صوبہ بہار کی تمام دفتری کارروائی اُردو زبان میں ہو۔

---

[1] زبان:۔ صوبہ بہار کی عام حالت بہ لحاظ زبان چاہے جو کچھ ہو لیکن مبصرین سے مخفی نہیں کہ پٹنہ میں عرصہ دراز سے اردو کا چرچا ہو رہا ہے بلکہ اس نے اُردو کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں خدا بخش کا مشہور و معروف کتبخانہ جس سے ہزاروں اہل علم سیراب ہو رہے ہیں اسکا ...

کیا اچھا ہو اگر صوبہ کاٹھیاواڑ میں زبان اُردو کی ترقی کے لئے رسالے، اخبار، کلب۔ انجمن کانفرنس اور مذاکرات علمیہ کا انعقاد عمل میں آئے اور تحریر و تقریر کے ذریعہ ترقی تعلیم اور ترقی اُردو پر زور دیا جائے کیا آپ حضرت خوشتر کے ہاتھوں کو مضبوط بنائیں گے کہ وہ ان امور میں آپ کی رہنمائی کریں پس اگر آپ کے چند ذی حوصلہ افراد آج کھڑے ہو جائیں تو منگرول ہی میں صوبہ کاٹھیاواڑ کی ایک مرکزی انجمن اور مرکزی اردو کانفرنس کا انعقاد و اجلاس ہو سکتا ہے جو بے انتہا مفید اور ضروری ہے۔

ملا رموزی

"ظل السلطان"

شاہجہاں آباد بھوپال

۱۸ اگست سنہ ۲۶ء

جناب مکرم۔ السلام علیکم

والانامہ موصول ہوا۔ آپ کا رسالہ بھی دیکھا مضامین کی حیثیت سے نہایت بہتر رسالہ ہے اور میں خوش ہوں کہ آپ ایک ایسی جگہ رہکر زبان اردو کی خدمت کر رہے ہیں جہاں قدم قدم پر آپ کے لئے مشکلات ہیں۔ خدائے کریم آپ کو کامیاب کرے۔

اس رسالے کے ذریعہ سے سب سے نمایاں کام جو آپ نے کیا وہ وہاں کے قابل انشا پردازوں اور فاضل لوگوں کو ادب و انشا کے میدان میں لے آنے کا کیا اور ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا۔

مجھے بہت خوشی ہوئی کہ مولانا اختر جونا گڈھی کے افادات سے اب بہرہ اندوز ہونے کا موقع ملتا رہے گا آپ نے ان کو حجرہ سے باہر نکال ہی لیا۔ خوب کیا۔ یہ کاٹھیاواڑ کے شبلی ہیں اور ادب و انشا کی روح رواں۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ ان سے کام لیں گے اور ملک کو ان کے ترشحات خامہ سے مستفیض فرمائیں گے۔

.........میں کوشش کرونگا کہ آپ کے رسالہ کے لئے کچھ نہ کچھ لکھتا رہوں گو اب فرصت بھی نہیں ملتی اور لکھنے سے جی ہی اُکتا گیا ہے۔ کہیں لکھتا بھی نہیں۔ مگر آپ نے رسالہ ایک ایسے مقام سے شائع کیا ہے جہاں ضرورت ہے کہ اس کی امداد کیجائے اور جو امکان میں ہو کیا جائے، میرے امکان میں بس یہی ہے کہ آپ کو لکھہ کر کچھ نہ کچھ بھیجتا رہوں اور انشا اللہ یہی کرتا رہونگا۔

خادم

سید محمد یوسف قیصر

صفحۂ ادارت

یقیناً یہ خبر خواص و عوام میں مسرت سے سنی جائیگی کہ ہمارے سر دین پناہ معدلت گستر و رعایا پرور نواب شیخ محمد جہانگیر میاں صاحب بہادر دام اقبالہٗ والی ریاست منگرول جو نہایت متشرع اور نیچے فدائی دین متین ہیں کچھ عرصہ ہوا اپنے ذاتی اخراجات میں سے پس انداز کرکے ساڑھے چار لاکھہ روپیہ کی ایسی گراں قدر رقم غربا کے تعلیمی اخراجات کے لئے وقف کردی ہے۔ جس میں سے ایک لاکھہ روپیہ تو محض تعلیم نسواں میں صرف کیا جائیگا باقی رقم اُن غربا کی دینی و دنیوی تعلیم میں صرف کی جائیگی جو تعلیمی مصارف برداشت کرنے کے اہل نہیں ہوئے چنانچہ منگرول میں دارالاقامت کی عمارت بھی طیار کرائی گئی ہے جسمیں فی الحال کم و بیش پچاس طلبہ تعلیم پاتے ہیں ان کی رہائش اور خورد و نوش کا انتظام بھی وہیں ہوتا ہے۔

کاٹھیاوار بلکہ عالم اسلام میں نواب صاحب موصوف کی ذات ستودہ صفات مغتنمات میں سے ہے جس پر ہمیں فخر ہے اور بجا فخر ہے آپ دیگر کارہائے خیر (مذہبی و قومی) میں بھی نمایاں حصہ لیتے ہیں۔

کیا یہ ایثار و قربانی ان رؤسا کے لئے قابل تقلید و سبق آموز نہیں جو محض اپنے ذاتی مشاغل کی بنا پر اور رعایت شوق کی خاطر لاکھوں روپیہ برباد کردیتے ہیں؟ کیا ان سے احکم الحاکمین روز حشر ان کی ان فضول خرچیوں بے اعتنائیوں اور حق تلفیوں کی بازپرس نہ کریگا؟ کریگا اور ضرور کریگا۔

اس رقم اوقاف کے لئے ہم اتنی عرض ضرور کرینگے کہ اس میں سے نصف رقم لگا کر ایک عربی درسگاہ کی بنیاد ڈالی جائے اور جس میں عام مسلمانوں کو مستفیض ہونے کا موقع دیا جائے۔

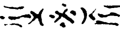
اس درسگاہ کا تعلیمی معیار ایسے جدید اصول پر رکھا جائے کہ جب اس مدرسہ کا تعلیم یافتہ فارغ التحصیل ہوکر نکلے تو وہ ایک روشن خیال جید عالم و فاضل بھی ہو اور علوم دینیہ کے ساتھہ ساتھہ علوم جدیدہ کا ماہر انگریزی دان و سائنس داں بھی ہو۔

اگر اس عرضداشت پر توجہ مبذول فرمائی جائے تو یہ اہم کام نہایت آسانی کے ساتھہ طے ہوسکتا ہے۔

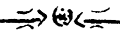
اس ماہ میں "علم اور اسلام" والا طویل مضمون ختم ہوتا ہے ہم خود اس قسم کے طول طویل مضامین بالاقساط درج کرنے سے پریشان ہوتے ہیں اور ناظرین بھی انتظار کی شدت سے تنگ آجاتے ہیں لیکن ایک ہی وقت میں اس ضروری اور گراں قدر مضمون کا شائع ہونا محال تھا اس لئے اسکو تین نمبروں میں شائع کرنا پڑا آئندہ کوشش کی جائے گی کہ ہر مضمون ایک ہی اشاعت میں ختم ہو جائے، اگرچہ اس نمبر میں بھی "ہندوستان اور اسکی زبانیں" والا مضمون بسبب طویل ہونیکے ادھورا درج کیا جاتا ہے لیکن دقت یہ تھی کہ اگر ہم اسکو اسی نمبر میں پورا شائع کر دیتے تو قارئین کرام کو علم اور اسلام والے مضمون کی تکمیل کے لئے ایک ماہ اور انتظار کرنا پڑتا۔



باوجود تصحیح اور پروف دیکھنے کے انتظام کے پچھلے نمبر میں بھی کتابت کی بعض اہم غلطیاں رہ گئی ہیں جس کے لئے ہم بیحد شرمندہ ہیں۔ اگر ہم آگرہ سے پروف منگائیں اور خود تصحیح کرکے بھیجیں تو دس بارہ روز کا عرصہ لگ جاتا ہے اول تو رسالہ وقت پر شائع نہیں ہوتا اس پر اگر ہم یہاں پروف منگائیں تو مزید تاخیر کا خوف ہے اس لئے آئندہ سے جدید انتظام کیا گیا ہے۔ انشاء اللہ اب رسالہ بھی وقت پر قدر دانوں کی خدمت میں حاضر ہوا کرے گا۔



ہمارے پاس بہت سے ایسے مضمون (نظم و نثر) بغرض اندراج رسالہ آئے ہیں جو زبان کے معیار سے گرے ہوئے ہیں اگر ہم خوشنودی یا حوصلہ افزائی کو مد نظر رکھکر درج کرتے ہیں تو ہمارا رسالہ بھی بعض دیگر رسائل کی طرح عامیانہ اور مبتذل مضامین کا تختہ مشق بن جاتا ہے اور ثقات و اہل علم کی نظروں سے گر جاتا ہے لہذا ایسے مضمون نگار حضرات کی خدمت میں بصد ادب التماس ہے کہ وہ اپنے خیالات کو وسیع اور اپنے مضامین کو اعلی معیار علم و ادب پر لانے کی سعی فرمائیں۔ ساتھ ہی رسالہ کے معیار کو نظر انداز نہ فرمائیں۔



آہ مرحوم نظام الحق (عباسی)

کیا خبر تھی کہ ہم اگست نمبر میں جن کی وساطت سے پروفیسر سید نواب علی صاحب کی غیر مطبوعہ نظم (مناظرۂ نظم و نثر) شایع کرینگے وہ اپنے عطیہ کو مطبوعہ کی صورت میں نہ دیکھہ سکینگے اور ہمیں دائمی مفارقت کا داغ دے جائیں گے مرحوم نے ۲۵ سال کی عمر میں ۱۵ ستمبر ۱۹۲۶ء کو

منگرول میں انتقال فرمایا۔

مرحوم کا وطن احمد آباد تھا لیکن سترہ اٹھارہ سال سے منگرول ہی میں ریاست کے اعلیٰ عہدوں پر ممتاز تھے اور اس عرصہ میں برابر ملک وقوم کی خدمات انجام دیتے رہتے تھے۔

منگرول اور اہل منگرول سے ایسی نسبت ہو گئی تھی جیسی وطن اور یاران وطن سے ہوتی ہے منگرول والوں کی بہبودی و بہتری کے دل سے خواہاں رہتے تھے۔

مرحوم علاوہ منکسر المزاج اور نیک طبع ہونے کے سچے بہی خواہ و ہمدرد ملک وقوم بھی تھے۔ انجمن خدام کعبہ خلافت۔ اور ارتداد کے سکریٹری بھی تھے اور ایسے قومی کاموں میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیتے اور ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ اہل منگرول میں قومی اسپرٹ آپ ہی کی پیدا کی ہوئی ہے جس کے لئے ہم ان کے ہمیشہ ممنون ہونگے

مرحوم کو علم و ادب سے گہری دلچسپی تھی اردو اور گجراتی کے اچھے مضمون نگار تھے سیکڑوں کی تعداد میں آپ کے مضامین اخبارات میں چھپ چکے ہیں طبیعت کا شعر گوئی کی طرف بھی میلان تھا عبرت تخلص کرتے تھے اور شعر خوب کہتے تھے ہم انشا اللہ کسی آئندہ اشاعت میں مرحوم کے کلام کا انتخاب ہدیہ ناظرین کریں گے

انجمن اسلام منگرول) مرحوم کی زندہ یادگار موجود ہے جس کی بنیاد مرحوم نے عرصہ ہوا غربا اور طلبہ کی خدمات انجام دینے کی غرض سے ڈالی تھی امید کہ کارپردازان انجمن اس یادگار کو قائم اور حوادث سے محفوظ رکھنے کی سعی کریں گے۔

لیکن افسوس کہ مرحوم کے بعد اب ہمیں منگرول میں کوئی ایسا لیڈر نظر نہیں آتا جو مرحوم کا نعم البدل ہو سکے اگرچہ ایسے حضرات بہت ہیں جنکے دلوں میں مذہبی جوش اور قومی اسپرٹ موجود ہے لیکن جب تک میدان عمل میں آکر لوگوں کو اپنا ہم خیال و ہمنوا نہ بنا سکیں اور ان کے دلوں میں قومی ہمدردی کا جذبہ نہ پیدا کر سکیں یہ اسپرٹ کس کام کی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زبان

ماہ ستمبر ۱۹۲۶ء

مقالات

علم اور اسلام

(بسلسلۂ ماسبق)

(از جناب مولوی محمد اسمٰعیل صاحب اصلاحی)

گیارہویں صدی عیسوی میں قسطنطین افریقی پیدا ہوا جس نے مسلمانوں میں رہ کر تعلیم حاصل کی، اور اپنے زمانہ کا زبردست فاضل ہوا جربرٹ (Gerbert) کے متعلق تو بحث کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ اس کی سیاحت بلاد اسلامیہ کے بارہ میں بہت کچھ شک وشبہہ کا اظہار کیا جاتا ہے ۱۱۳۰ء اور ۱۱۵۰ء کے درمیان قابل اور ماہر فن مترجمین کی ایک جماعت مطران ریمونڈ (Raymond Lull) کی سرکردگی میں طلیطلہ بھیجی گئی تاکہ وہ علوم عربیہ کا لاطینی میں ترجمہ کرلائیں اور تیرھویں صدی کے اوائل میں ارسطو کی تصنیفات عربی سے ترجمہ کرکے پیرس یونیورسٹی (l' université de Paris) میں داخل کردی گئیں اور اس طرح یورپ اس قعر جہالت سے نکلا جس میں وہ چار پانچ صدیوں پھنسا ہوا تھا چنانچہ اس تاریخ تک تو ہم مسلمانوں کے شاگرد تھے، پھر تیرھویں صدی کے وسط میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہم ان کے ہم پلہ ہوگئے حتیٰ کہ ۱۲۷۵ء میں قریب قریب مسلمانوں کا یہ افسوسناک انحطاط وتنزل شروع ہوگیا جبکہ یورپ اپنی پوری جد وجہد اور مستعدی کے ساتھ علوم وفنون کے اکتساب اور ان کی ترویج اور اکتساب میں مصروف تھا۔ اور علمی مباحث میں ناقابل قیاس عظیم الشان اور حیرت انگیز

ترقیاں کرنے لگا۔

افسوس! اور صد افسوس! ان علوم و فنون پر جن میں ترقی اور پیش قدمی کی قابلیت اور استعداد نہو، اور زمانۂ حال میں اس کا پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہی وہ علوم عربیہ ہیں جو لاطینی یورپ میں تھوڑی سی زندگی بسر کرنے کے بعد معدوم ہوگئے۔ اس کی انتہا یہ ہے کہ ابن رشد جو ہمارے ہاں (یورپ میں) ارسطو کی طرح مشہور ہے اپنے مسلمان بھائیوں کے ہاں وہ بالکل غیر معروف اور نسیاً منسیاً ہے

۱۲۰۰ء سے ایک لے کر آجتک کوئی عرب فلسفی پیدا نہیں ہوا اس لئے کہ فلسفہ، اگرچہ بالکل متروک و مطرود نہیں ہوا لیکن اس میں شک نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ مسلمانوں کے ہاں محض مذہب اسلام کی وجہ سے معتوب اور مقہور رہا، یہی وجہ ہے کہ اوائل ۱۲۰۰ء سے جبکہ علمائے اسلام کا پورا پورا غلبہ اور تسلط تھا ہم دیکھتے ہیں کہ بلاد اسلامیہ میں فلسفہ کا بالکل فقدان ہے یہاں تک کہ مورخین اور مصنفین اپنی کتابوں میں صرف بسبیل تذکرہ اس پر بحث کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ فلسفہ کی کتابیں نادر الوجود اور معدوم ہوتی جاتی ہیں اور مسلمانوں کے ہاں علم الفلک کی تعریف صرف اس قدر جائز ہے جو نماز کے وقت سمت قبلہ معلوم کرنے کے لئے ضروری اور لابدی ہو۔

پھر اس کے بعد ترک آئے جن کو مسلمانوں پر غلبہ اور تسلط حاصل ہوا۔ انہوں نے بھی علوم اور فلسفہ کو مٹانے میں پوری جد و جہد سے کام لیا۔ اور اسی زمانہ سے مسلمانوں میں علوم اور فلسفہ کا پورا پورا انحطاط اور فقدان ہوا۔ چنانچہ اس وقت سے ممالک اسلامیہ میں مشکل سے کوئی صاحب فکر و رائے اور سمجھدار عالم ملے گا الا ماشاء اللہ مثلاً ابن خلدون

خلاصہ یہ کہ اسلام نے علم اور فلسفہ کا پورا قلع قمع اور استیصال کر دیا۔

جو کچھ اب تک میں نے کہا حاشا و کلا اس سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ میں علوم عربیہ کی شان رفعت اور علو مرتبت کی توہین اور تحقیر کروں۔ یوں تو علوم عربیہ کو انسانی علوم و معارف کی تاریخ میں ایک خاص اور اہم درجہ حاصل ہے۔ میرا منشاء صرف اس قدر ہے کہ بعض علوم مثلاً علم الفلک کو عربوں کی طرف منسوب کرنے میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے یہ تو ایک کھلی ہوئی بے انصافی ہوگی اگر میں عربوں کی بالکل قدر نہ کروں اس لئے کہ چھٹی صدی بارہویں اور تیرھویں صدی کے مابین کے حالات و واقعات پر نظر کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ زمانہ "عربی زمانہ" تھا اور اس زمانہ میں اسلام جہاں کہیں گیا اس نے عقل انسانی کی ہمیشہ تربیت کی لیکن یہ علوم جن کو عام طور پر لوگ علوم عربیہ کہنے کے عادی ہوگئے ہیں، کیا درحقیقت یہ عربی علوم ہیں یا نہیں، ہرگز نہیں! صرف زبان کے علاوہ عربوں کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے بات یہ ہے کہ اسلامی فتوحات نے عربی زبان کو حجاز سے لے کر دور و دراز ممالک تک پھیلا دیا ہے۔ اس سے لوگوں کو

یہ دھوکا ہو گیا کہ عربی زبان میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ تمامتر عربوں کے ذوقِ علمی اور رفعتِ تخیل کا نتیجہ ہے۔ جیسا اس سے قبل لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو چکی ہے کہ لاطینی زبان میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سب لاطینیوں کی دماغ سوزیوں کا نتیجہ ہے۔

جس طرح البرٹس اعظم (albert = le-grand) ، راجر بیکن[۵۱] ، اور فرانسس بیکن[۵۲] لاطینی نہیں ہیں باوجودیکہ انہوں نے لاطینی زبان میں کتابیں لکھی ہیں۔ اسی طرح ابن رشد ابن سینا اور البتانی بھی عرب نہیں ہیں۔ پس عربی علوم اور فلسفہ کو جزیرۃ العرب کی طرف منسوب کرنا ایسا ہی غلط ہے جیسا کہ مسیحی ادبیات کو زمانۂ انتعاش علوم (Renaissance) اور مسیحی علم الکلام (Scholastique) کو سولھویں صدی کے تمام اور سترھویں صدی کے بعض علوم وفنون کو شہر روما کی طرف اس وجہ سے منسوب کرنا کہ وہ لاطینی زبان میں ہیں۔

اگر ہم تحقیق سے کام لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اُن تمام علماء اور فلاسفہ میں سے جن کے متعلق عرب ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے، کوئی بھی سوائے الکندی[۵۳] کے کوئی بھی عربی النسل نہیں ہے۔ نہ وہ نسب اور خاندان کے لحاظ سے عرب ہیں اور نہ خیالات وافکار کے اعتبار سے بلکہ یا تو وہ عجمی ہیں یا ماوراءالنہری، اندلسی ہیں۔ یا بخاری، سمرقندی ہیں یا اشبیلی اور قرطبی! ان لوگوں نے اپنی کتابوں میں عربی زبان کو استعمال کیا حالانکہ عربی زبان ان کے خیالات اور مافی الضمیر کو ادا کرنے سے عاجز اور قاصر ہے۔ جیسا کہ ہمارے ہاں کے علماء نے قرون متوسطہ میں لاطینی زبان کو اظہارِ خیالات کا ذریعہ بنایا۔ اور اس کی تنگی وکم مائگی کی وجہ سے اس میں ردوبدل کیا۔ عربی زبان شعر اور فصاحت کی صلاحیت تو رکھتی ہے لیکن اس میں فلسفانہ (مابعد الطبیعیات) خیالات ادا کرنے کی استعداد اور قابلیت نہیں ہے[۵۴]۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں عرب علماء اور فلاسفر کی فلسفیانہ تصانیف میں انشا پردازی کا رنگ کچھ اعلیٰ نظر نہیں آتا۔

---

۵۱ ارالیمن بیکن (۱۲۱۴ء ۔ ۱۲۹۴ء) یورپ کے مشاہیر علماء میں سے تھا۔ اس نے تمامتر عربوں سے تحصیل علوم کی تھی۔ فلسفہ، نجوم اور کیمیا میں اس کی تصانیف ہیں جو علماء اسلام کی خوشہ چینی کی رہین منت ہیں۔ (مترجم)

۵۲ مشہور انگریزی عالم لارڈ بیکن ۱۵۶۱ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۲۶ء میں مرگیا۔ اس کی تصانیف انگریزی درسیات میں داخل اور عام طور پر متداول ہیں۔

۵۳ ابو یوسف یعقوب بن اسحاق الکندیؒ مشہور عرب "فیلسوف" خلیفہ مامون کے زمانہ میں تھا۔ علوم طبیعہ اور فلسفہ میں اس کی چند تصنیفات ہیں۔

۵۴ یہ رینان اور اس کے ہم خیال مستشرقین کی کوتاہ بینی اور عربی زبان سے ناواقفیت پر دلالت کرتا ہے مستشرقین کا (بقیہ برصفحہ آئندہ)[۱۳]

گذشتہ تصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ جن علوم کو عربی کہا جاتا ہے وہ اصل میں عربی علوم ہی نہیں ہیں تو پھر اسلامی کیا ہونگے؟ اور کہ اسلام نے حقائق اشیا سے بحث کی اجازت بھی دی ہے یا نہیں؟ کیونکہ جن لوگوں نے علوم معارف کی اشاعت کی اور ان کو ترقی دی وہ مجوس، نصاریٰ، یہود، حرانی، اسمٰعیلی اور منافق مسلمان تھے لیکن خالص مسلمان اور مؤمن تو ان کو ہمیشہ بُرا بھلا کہتے رہے یہاں تک کہ علما نے مامون کی تکفیر کا صرف اسلئے فتویٰ دیا کہ اس نے فلسفۂ یونان کی تعلیم کی اجازت دی تھی۔ اور خود اس کے عہدِ حکومت میں جو مصیبتیں آئیں ان کو علما سے مامون کی غیر مذاہب کے ساتھ رواداری اور سہل انگاری سے منسوب کردیا۔

کئی خلفا نے اپنی رعایا کے خوف سے مجبور ہوکر، جن کے محرک یہی علما تھے فلسفہ اور فلکیات کی بکثرت کتابیں مجمع عام میں جلادیں۔ جو شخص اس زمانہ میں ان علوم کو حاصل کرتا تھا اسے زندیق اور کافر کہا جاتا تھا۔ اسکو سزا دی جاتی اسکا مکان جلا دیا جاتا اور لبسا اوقات حکومت عوام کے اشتعال جذبات کو فرو کرنے کے لئے اُسے قتل کردینے پر مجبور ہو جاتی۔ اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مذہب اسلام نے علوم و فنون کو ہمیشہ بُرا سمجھا ہے اور ان کے شایقین کو سزائیں دی ہیں۔ حتیٰ کہ ان کا نام و نشان تک مٹا دیا ہے اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ اسلام کے دو دوروں میں امتیاز کیا جائے:۔

(۱) بدو اسلام سے لے کر بارھویں صدی عیسوی کے آخر تک،

(۲) تیرھویں صدی عیسوی سے لے کر اس وقت تک،

اسلام کے دور اول میں معتزلہ وغیرہ مختلف المذاہب جماعتوں کے باعث مذہبی تعصب اور اس کے احکام کی پیروی کا جوش بہ نسبت دوسرے دور کے بہت کم تھا۔ اس لئے کہ اس دور ثانی میں اسلام پر تاتاری، بربری اور وحشی قومیں حکمران تھیں، جن میں ذرا بھی عقل کا مادّہ نہ تھا۔

یہ بات مشاہدہ کی جاسکتی ہے کہ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا مسلمانوں کا ایمان اور ان کا تعصب مذہبی سخت اور

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۲) ایک گروہ اسکے بالکل خلاف رائے رکھتا ہے جس میں عربی زبان کے ماہرین اور علم اللسان کے جید عالم شریک ہیں۔ علم و فلسفہ کے لئے عربی زبان کی صلاحیت کا اس سے بڑھکر کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ یورپ علمی اور فلسفی اصطلاحات کے لئے عربی زبان کا ممنون احسان ہے۔ عربی زبان میں چار لاکھ سے زائد ایسے مادّے ہیں جو قابل تحویل اشتقاق ہیں برخلاف اس کے انگریزی زبان کے پاس ۴۰ ہزار الفاظ اور فرانسیسی کے پاس پچاس ہزار الفاظ سے زائد نہیں ہیں جیسا کہ محققین لغات کا خیال ہے۔

ضبط ہوتا گیا اس لئے کہ بالکل ابتدا میں جو عرب مسلمان ہوئے تھے ان کی تصدیق رسالت و نبوت بہت ہی کمزور تھی جیسا کہ اسلام کی ابتدائی دو صدیوں اور تیسری صدی میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد خالص مذہبی عقائد کی پابندی تمام دینی اور دنیوی امور میں عام ہوگئی۔ اور لوگوں کو اس پر عمل کرنیکے لئے مجبور کیا جانے لگا۔ اور عدم پابندی کی صورت میں دردناک اور قابل نفرت سزائیں دی جانے لگیں کہ اس کی نظیر سوائے مجلس التفتیش ( ) کے اور کہیں نہیں مل سکتی جس کا کام یہ تھا کہ جو شخص عیسائیت کے خلاف کوئی عقیدہ رکھتا اُسے قتل کر دیا جاتا یا جلا دیا جاتا تھا۔ اس قسم کے واقعات اسپین، اٹلی اور فرانس وغیرہ میں بکثرت رونما ہوئے۔ یہ بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ مذہبی عقائد کی پابندی کے لئے جبر کرنا تمدنی آزادی کے لئے پیغام موت ہے۔ اور ہمارے زمانے میں یہ سوائے ممالک اسلامیہ اور یورپ کے ماتحت ملکوں کے ہمیں کہیں نظر نہیں آتا جس کو دینی اور دنیوی امور میں ایک ساتھ اقتدار حاصل ہے۔ لیکن یورپ کے ماتحت ملکوں کا حصہ بہت کم ہے۔ بخلاف مذہب اسلام کہ وہ دنیا کے ایک بڑے حصہ پر حکمران ہے جو ہر قسم کی ترقی سے محروم ہے کیونکہ وہ آسمانی وحی اور عقائد پر مبنی ہے جیسا کہ تمام مسلمان بزعم خود سمجھے ہوئے ہیں۔

فلاسفۂ یورپ اور شیدایان حُریت جو مذہب اسلام کی مدافعت کرتے ہیں، فی الحقیقت وہ اسلام سے واقف نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں مذہب اسلام عبارت ہے ایک ایسے مذہب سے جو دینی اور دنیوی اُمور کا بدرجۂ اتم جامع ہے حالانکہ وہ صرف ایسے اصول و عقائد پر مبنی ہے جن پر بحث کرنے کی وہ اپنے پیروؤں کو مطلق اجازت نہیں دیتا۔ مذہب اسلام عقائد کی ایک ایسی بوجھل زنجیر ہے جو نوع انسان کی قوتِ برداشت سے باہر ہے ہمیں تسلیم ہے کہ اوائل قرون متوسطہ میں (یعنی ابتدائے اسلام میں) مذہب اسلام نے فلسفہ کی مُساعدت اور موافقت کی لیکن یہ جو کچھ تھا مجبوراً تھا۔ کیونکہ اہل اسلام کی آپس کی نااتفاقی اور فلسفہ کے مُزاحم اسباب کی عدم موجودگی کے سبب فلسفہ کی رَو کو بالکل روک دینا اسلام کی طاقت سے باہر تھا۔ اس لئے کہ تمام محکمہ جاتِ نظم و نسق عیسائیوں کے قبضہ میں تھے...... لیکن جب مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی اور انکا مذہبی تعصب سخت ہوگیا تو علم و فلسفہ کو زوال اور مذہبی خوف و نفاق کا دور دورہ ہوا۔ پس اسلام جب تک ضعیف تھا حُریت و عدل کا حامل تھا۔ لیکن جونہی وہ قوی اور مضبوط ہوا تو سراسر ظلم ہی ظلم تھا۔ ایسی حالت میں اس کو کوئی فضیلت نہیں دی جاسکتی کہ اس نے عدم استطاعت کی حالت میں علم و فلسفہ کی اجازت دی اسکی یہ فضیلت بعینہٖ ایسی ہے جیسے کہ ہمارے مذہبی پادریوں کو موجودہ علوم و فنون کی فضیلت دیدی جائے حالانکہ یہ ترقی بالکل ان کے علی الرغم ہوئی ہے۔ کیونکہ مسیحی عقائد اسلام سے بھی زیادہ علوم و

وفنون کے دشمن ہیں۔ لیکن اُن سے علم وفلسفہ کو اتنا نقصان نہیں پہونچا جتنا اسلام سے ممالک اسلامیہ میں۔ یورپ میں اور کہیں بھی ان مسیحی عقائد کو علم کے خلاف غلبہ حاصل نہیں ہوا سوائے اسپین کے کہ وہاں ایک ظالمانہ اور جاہلانہ طریقہ رائج تھا جس کی وجہ سے علوم تباہ و برباد ہوئے۔ لیکن یہ شریف ممالک مسیحیت سے ضرور انتقام لیں گے اور ان میں علم کو کامیابی نصیب ہوگی اگر تمام مجلسِ "تفتیش" لوگوں کے عقائد مذہبی کے لئے ہوتیں اور فلیپ ثانی اور پاپائے پی خامس کی کوششیں علم کے خلاف بارآور ہوتیں تو اسلام میں بھی وہ تمام باتیں پیدا ہو جاتیں جن کے پیدا ہونے کا امکان یورپ میں تھا۔

اگر کوئی شخص کسی امر میں نقصان پہونچانے کا قصد کرے اور اس میں ناکام رہے تو اس کی فضیلت یا تعریف نہیں تسلیم کی جاسکتی۔ دنیا میں جتنے مذاہب گذرے ہیں ان میں حالاتِ زمانہ کے لحاظ سے کچھ مفید باتیں ضرور ہوتیں ہیں جو اُس زمانہ میں حالتِ دنیا کی اصلاح کرتی ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ جو باتیں مذہب کی مساعدت کے بغیر، بلکہ اس کے علی الرغم پیدا ہوگئیں اس کے لئے بھی مذہب ہی کو مستحق فضیلت تسلیم کیا جائے۔ جبکہ قاتل مقتول کا وارث نہیں ہوسکتا، اور نہ یہ مناسب ہے کہ ظالم کو مظلوم سے نفع اُٹھانے دیا جائے۔ بااینہمہ ہر وہ شخص جس کو اسلام سے تعلق ہو گیا ہو ان تمام ترقیوں کے لئے جو اسلام کے علی الرغم معرض وجود میں آئیں اسلام ہی کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں۔

ابن سینا، ابن زہر، اور ابن رشد کو اسلام سے وہی نسبت ہے جو گلیلیو[1] (Galileo) کو رومن کیتھولک سے بیان کی جاتی ہے حالانکہ مسیحیت نے اس کے انکشافاتِ علمیہ میں کوئی مدد نہیں کی بلکہ الٹا اس کو نقصان پہونچایا ہے۔ اور میرے دل میں ایسے مذاہب کے خلاف کوئی معمولی اعتراض بھی پیدا نہیں ہوتا جنہوں نے بنی آدم کو ان مشکل مسائل پر بحث کرنے سے نجات دلادی اور جن پر خود آدم (علیہ السلام) نے اپنے مشاہدہ عالم اور اس کے مآل کار پر نظر کرتے وقت غور و فکر کیا تھا۔ مذہبِ اسلام کے احکام فی نفسہ بہت بلند رتبہ اور قابل احترام ہیں اور اپنی زندگی میں جب کبھی میں مسلمانوں کی مسجدوں میں داخل ہوا ہوں تو میں نے اپنے قلب کے اندر ایک کشش اور تاثیر محسوس کی ہے، بلکہ مجھے اپنے مسلمان نہ ہونے پر افسوس ہوا ہے۔ مگر بات صرف اتنی ہے کہ اس (اسلام) نے عقل انسانی کو بہت پیچھے کر دیا ہے اور اپنے حیرت انگیز اثر و نفوذ سے کام لے کر، جو دیگر مذاہب کو نصیب نہیں ہے اس نے عقل انسانی کو حقایق اشیاء میں غور و فکر کرنے سے بالکل روک دیا، یہاں تک کہ بعض ممالک کو جہاں اسلام

[1] فلکیات کا مشہور مسیحی عالم جو ۱۵۶۴ء میں اٹلی میں پیدا ہوا اور ۱۶۴۲ء میں انتقال کر گیا۔ زمین کے گھومنے کا نظریہ اسی نے ایجاد کیا تھا۔

پھیلا علمی نقطۂ نظر سے بالکل صفاچٹ میدان بنا کر رکھدیا جہاں حقائق اشیا سے بحث کرنا[1] جس سے عقل انسان وسیع ہوتی ہے، خواب وخیال سے بہت دور ہے۔ اس پر اتنا اور اضافہ کرلو کہ ان ممالک کے لوگوں کی عقلیں خود ہی قاصر ہوتی ہیں اس پر طرّہ یہ کہ وہ ہوتے ہیں مسلمان جن کی امتیازی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ علوم وفنون سے بُغض رکھیں، اس کو بُرا سمجھیں اور یہ اعتقاد رکھیں کہ بحث کرنا کفر ہے، اس سے عقل کم ہوجاتی ہے اور کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ کیونکہ کائنات عالم کا علم سیکھنا گویا خدا سے معارضہ کرنا ہے، اور علم تاریخ سے اگلے وقتوں کی گمراہیاں عود کرآتی ہیں کیونکہ وہ تمامتر ازمنۂ قبل از اسلام کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس سلسلہ میں مثال کے طور پر شیخ رفاعہ کا نام لیا جاسکتا ہے جو پیرس میں مدرسہ مصریہ کے مدتوں امام رہ چکے ہیں۔ پیرس سے واپسی پر شیخ صاحب موصوف نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں فرانسیسی قوم کے عجیب وغریب خیالات بیان کئے ہیں اس میں وہ بڑے شدومد سے لکھتے ہیں کہ یورپ کے تمام علوم کُفر ہیں خصوصاً ان کا عقیدہ "قدم عالم" کے بارہ میں ہمیں شیخ صاحب کا یہ قول دیکھ کر مطلق تعجب نہیں ہوا کہ یہ اسلام کے عین مطابق ہے، اور اسلام جو نام ہے ایسے عقائد دینیہ الہامی کے مجموعہ کا جو حریت خیال اور حقائق اشیا پر آزادی سے بحث کرنے کے کُلّیتہً منافی اور بسا اوقات مخالف ہیں۔

علوم کی غرض دین و مذہب کی نفی نہیں ہے بلکہ مقصد صرف ہے کہ حوادث کائنات کو قدرتِ الٰہی سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ تجربات مافوق العقل اعتقاد رکھنے کے منافی ہیں۔ اور عقائد اسلام کی تو بنیاد ہی ایسے اعتقاد پر ہے۔ پس ایسی حالت میں اسلام کا علوم کے ساتھ بغض رکھنا اس کے اصول کے عین مطابق ہے، لیکن اس مطابقت نے خود اسلام کو بھی بہت سے نقصانات پہونچائے ہیں اور علوم کو تباہ کرکے تو اسلام نے اپنے آپ کو تباہ کرلیا ہے اور وہ اس انتہائی قعرتنزل میں جا پڑا ہے،

جب انسان یہ اعتقاد رکھے گا کہ حقائق اشیا پر بحث کرنا احکام خداوندی کے خلاف ہے تو اس کی عقل کُند ہوجائیگی اور اس پر اوہام وشکوک کا غلبہ ہوگا چنانچہ ہم مسلمانوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ آخر بحث ومباحثہ میں کہہ دیتے ہیں "واللہ اعلم"[2]

---

[1] منطقی اصول پر حقائق اشیاء سے بحث کرنا اسلام کا اصل اصول ہے۔ قرآن مجید میں ہے "قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین" اور اہل عرب نے قرآن مجید کی بدولت فلسفی بن گئے کہ اسلام کا ایک خاص اپنا فلسفہ ہے جس کے مبادیات سے اہل عرب یونانی فلسفہ اور اس کے متراجم سے روشناس ہونے کے پہلے ہی واقف ہوچکے تھے حتیٰ کہ علم منطق کے بعض اصول بھی انہوں نے وضع کئے تھے۔ ملاحظہ ہو ہماری کتاب "الاسلام اُزاء العلم والفلسفہ" باب ممھد للتفلسف فی الاسلام۔ (مترجم)

[2] "واللہ اعلم" کہنے سے فلاسفہ کے طریقہ پر نفی بحث بطور شک وشبہہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک طرح کا کلمہ تواضع ہے جو بقولہ تعالیٰ (بقیہ نوٹ بر صفحہ ۱۷)

اس کی شہادت میں موسیو لیارڈ کا واقعہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ جب موسیو موصوف موصل پہونچے تو انہوں نے موصل کی آبادی، اس کی تجارت اور اس کے تاریخی حالات کے متعلق واقفیت حاصل کرنے کا ارادہ کیا چنانچہ ان امور کے متعلق قاضی شہر سے استفسار کیا تو اُن قاضی صاحب نے بذریعۂ ترجمان حسب ذیل جواب دیا:۔

"میرے معزز اور پیارے دوست! آپ نے جن امور کے متعلق مجھ سے سوال کیا ہے وہ غیر مفید ہی نہیں بلکہ مضر ہیں، باوجودیکہ میری پوری زندگی اسی شہر میں گذری ہے لیکن مجھے کبھی خیال بھی نہیں پیدا ہوا کہ یہاں کے مکانات اور رہنے والوں کا شمار کروں، اور مالِ تجارت جس کو بعض لوگ اپنے خچروں پر لادکر لاتے ہیں اور بعض اپنی گردنوں پر تو ان کا کوئی اندازہ نہیں ہوسکتا، اب رہے یہاں کے تاریخی حالات سو اس کا علم تو سوائے خدائے علیم و قدیر کے کسی کو بھی نہیں ہے خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اسلام کے پہلے یہاں کے گمراہ باشندوں کی تعداد کیا تھی اور اس کا جاننا ہمارے لئے بجائے مفید ہونے کے مضر ہے

"محب من! آپ کو ان چیزوں سے بحث نہیں کرنی چاہیے جو آپ کے لئے کچھ بھی مفید نہیں ہیں۔ آپ میرے پاس آئے ہیں اور اس سے ہم خوش ہوئے ہیں تو مناسب ہے کہ آپ اسی طرح خوش و خرم واپس بھی جائیں۔ کیونکہ جو کچھ باتیں آپ نے کہیں ان میں میرا کوئی حرج نہیں ہے اس لئے کہ کہنے والا اور ہے اور سننے والا اور۔ آپ نے جیسا کہ آپ کے ہموطنوں کی عادت ہے، مختلف ممالک کی سیر و سیاحت کی ہے یہاں تک کہ یہی سفر آپ کے لئے زادِ راہ بن گیا ہے، یعنے سفر کرنا آپ کے لئے بہت آسان ہو گیا ہے، لیکن ہمارا تو یہ حال ہے کہ ہم بحمداللہ اسی جگہ پیدا ہوئے اور یہاں سے دوسری جگہ جانے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ عزیز من! سنو کہ ایمان باللہ سے بڑھکر کوئی چیز نہیں ہے جو ساری دنیا کا پیدا کرنے والا ہے۔ تو کیا ہمارے لئے یہ جائز ہوسکتا ہے کہ اسکی مخلوقات اور کائنات سے بحث کریں اور اس طرح اس کی برابری کرنے لگیں۔ دیکھو یہ ستارہ ہے جو اُس کے اور اس دُمدار ستارہ کے گرد گھومتا ہے جس سے برسوں کا شمار کیا جاتا ہے۔ پس اس کو پیدا کرنے والے ہی کے لئے چھوڑ دو کہ وہی اس کا متکفل ہے۔ اب اگر آپ مجھ سے کہیں کہ اے شخص میرے پاس سے ہٹ جا کیونکہ میں تجھ سے زیادہ علم رکھتا ہوں، اور آپ اس چیز کو دیکھیں جس کو حقیقت میں آپ نہیں دیکھتے اور اس کی وجہ سے آپ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ آپ مجھ سے افضل ہیں تو اے دوست یہ آپ ہی کو مبارک ہو، میں تو خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھ کو ان چیزوں کی بحث سے جن سے

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۶) "وَمَا اُوتِیتُم مِنَ العِلمِ اِلَّا قَلِیلاً" استعمال کیا جاتا ہے علاوہ ازیں بہت کم تعداد ایسے متاخرین کی ہے جنہوں نے اپنی کتابوں میں اس کو استعمال کیا ہے، ورنہ عربی کی علمی اور فلسفی تصانیف اس سے بالکل خالی ہیں۔ (مترجم)

میرا کچھ فائدہ نہیں ہے، نجات دیدی ہے۔ تم نے اُن چیزوں کو سیکھا ہے جو میرے نزدیک کچھ بھی اہم نہیں ہیں، اور اُن چیزوں کو دیکھا ہے، جو میرے نزدیک حقیر ہیں پس کیا کثرتِ علم سے تمھارے لئے زادراہ (سامان آخرت) مُہیا ہوسکتا ہے؟ یا وسیع النظر ہونے سے تمھیں جنت کا راستہ مل سکتا ہے؟ پس اے دوست! اگر تم سعادت چاہتے ہو تو کہو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ مُحَمَّدُ الرَّسُوْلُ اللّٰہ، کسی کو نقصان نہ پہونچاؤ اور اس طرح لوگوں کو خوف دل سے نکال دو، اور موت سے ڈرتے رہو جو تمھارے لئے مقرر ہو چکی ہے"۔

یہ قاضی صاحب اپنے طریق پر ایک بہت بڑے فلسفی ہیں لیکن ہم میں اور اُن میں فرق یہ ہے کہ ہم ان کے تمام جوابات کو محض ظرافت ہی سمجھتے ہیں اور اگر انہیں معلوم ہو جائے کہ اس وقت ہم ان کے متعلق کیا کہہ رہے ہیں تو وہ بہت چراغ پا ہوں! ایسی ہی عقل کے لوگ اس قوم کو تباہ کر دیتے ہیں جس کی عقلیں بہت کچھ ترقی کر سکتی ہیں۔ اس قسم کے خیالات سے جو علم اور عقلیت سے بالکل عاری ہی ہوتے ہیں دو باتیں پیدا ہوتی ہیں ایک تو نہایت ذلیل خرافات و توہمات اور دوسرے اپنے عقیدہ کا تعصب۔ اور یہی دوسری چیز ہے جو لبسا اوقات نہایت خراب نتائج پیدا کرتی ہے۔

مسلمانوں میں جو مشرقی مسلمان ہیں وہ خرافات کی طرف مائل نہیں ہیں۔ لیکن پھر بھی ان کے ہاں ایک بڑی مصیبت یہ ہے کہ ان کی عقلوں پر ٹھیٹھ مذہبی عقائد کا بڑا تسلط ہے جو نوع انسانی کے ادائے فرائض کے لئے سدراہ ہے۔ اس لئے کہ اس زمین پر ہم جہل میں مبتلا اور اسی پر مطمئن رہنے کے لئے نہیں پیدا کئے گئے بلکہ اس لئے کہ باطل اور مضرت رسان عناصر کا مقابلہ کریں۔ علم ہر ہیئت اجتماعیہ (سوسائٹی) کی روح رواں ہے، اسی سے قوموں کی عقلیں علیٰ قدرِ مراتب فنون حرب اور صنعت و حرفت میں ترقی کرتی ہیں۔ اور سی سے انسان قومی ترقی کے اعلیٰ مدارج پر پہونچ سکتا ہے، یعنی اس سے وہ اعتدال پیدا ہوتا ہے جو بقاء عالم کے لازمی ہے۔ علم ہی سے قوائے عقلی کی آبیاری ہوتی ہے۔ اگرچہ آج بھی ایشیا میں ایسے جاہل و وحشی پائے جاتے ہیں جیسے کہ ابتداءً لشکر اسلام میں اور اس کے بعد بھی ہلاکو اور چنگیز خاں کے لشکر میں تھے، لیکن یورپی علوم نے اب اقوام یورپ کی ایسی کایا پلٹ کر دی ہے یہ اگر حضرت عمرؓ یا چنگیز خاں بھی جن تو افواج یورپ کے مقابلہ پر نہیں ٹھہر سکتے، بلکہ ان کو اپنے "صحرا" سے نکلنے کی جرأت ہی نہیں ہو سکتی کہ ان نو ایجاد، آتشین آلات حرب کے سامنے ٹھہرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ تمھیں معلوم ہوگا کہ ابتدا میں ان آلات کی بہت مذمت کی جاتی تھی حالانکہ وہ اس وقت ہمیں بہت مدد دیتے اور ترقی کی اشاعت میں ہماری مساعدت کرتے ہیں۔ لیکن میری رائے میں تو علم ہی سچی نعمت ہے اور اسی کی بدولت آلات و اسلاح فتنہ و شر سے ہمیں بچانے اور محفوظ رکھنے کے لئے ایجاد ہوئے جو لبسا اوقات اسی (علم) سے منتج ہوتے ہیں اور میری رائے یہ بھی ہے کہ علم صرف اُسی ترقی کی مساعدت

کرتا ہے جو انسان کی حفاظت اور آزادی پر مبنی ہو۔

ہندوستان اور اُس کی زبانیں

از

سر جارج گریرسن ۔ کے ۔ سی ۔ آئی ۔ ای

(مترجمۂ مولوی عبدالستار صاحب فاروقی)

اُن مختلف طریقہ ہائے زبان کے مشاہدہ کے لئے جن کے ذریعہ سے بنی نوع انسان نے مسئلہ زبان کو حل کیا ہے بحیثیت مجموعی دُنیا کا کوئی خطہ ہندوستان سے زیادہ مواقع پیش نہیں کرسکتا۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ خاص ہندوستان کی زبانیں ۱۷۹ ہیں اور اگر اس میں برما کو شامل سمجھا جاوے تو ان کی تعداد ۱۹۰ تک پہونچتی ہے۔ ان زبانوں کا تعلق اُن چھوٹے شعبوں کے علاوہ جو ابھی تحقیق طلب ہیں زبان کے اُن چار مسئلہ خاندان سے ہے جن کو علم اللسان میں تبتی چینی (Tibeto-Chinese) ، دراویدی (Dravidian) آسٹروی (Austric) اور آریئن (Aryan) کہتے ہیں۔ ہندوستان کو ان لسانی تعلقات کی بنا پر ایک ایسے لسانی جنکشن کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے، جہاں سے مسافر بلا تبدیلی پلیٹ فارم کے ایک گاڑی سے دوسری گاڑی میں منتقل ہو کر ہر سمت میں دنیا کے بعید ترین گوشہ تک پہونچ سکتا ہے۔ چنانچہ آسٹروی لائن کے ذریعہ ہم جنوب مشرق میں پنجاب سے ہندوستان کو طے کرتے ہوئے برما، انڈو چین، انڈونیشیا (Indo-nesia) ، ملانشیا (Melanesia) اور پولی نشیا (Poly-nesia) سے گزر کر جنوبی امریکہ کے ساحل سے دور جزیرۂ ایسٹر (Easter) تک جا سکتے ہیں، اور تبتی چینی کے ذریعہ ہم مشرق میں بالتستان (کشمیر) اور وہاں سے ہمالہ کی تلہٹیوں سے گزرتے ہوئے آسام، برما اور سیام کے راستہ سے چین کو پہونچ سکتے ہیں؛ جبکہ آرین زبانیں ہمیں انڈو یورپین کی بڑی شاخ سے ملاتی ہوئی تمام مغربی ایشیا کی وسعت میں گھما کر یورپ میں اور وہاں سے اطلانتک پار امریکہ پہونچا سکتی ہیں۔ غرضکہ بلحاظ زبان ہندوستان کے تعلقات کی وسعت تمام دنیا کو محیط ہے

زمانہ دراز سے ہندوستان میں جو زبانیں بولی جاتی رہی ہیں اُن کا تعلق آسٹروی خاندان سے تھا اور ہے؛

بلکہ جہاں تک ہمیں معلوم ہوسکا ہے ہندوستان کی قدیم ترین اور اصلی بھاشا آسٹروی خاندان ہی کی ایک قسم تھی جو آگے چل کر دو بڑے شعبوں آسٹرونیسین اور آسٹرو ایشیاٹک میں منقسم ہوگئی۔ ان میں سے اول الذکر ملک کے صرف ایک گوشہ میں برما کی انتہائی جنوبی سرحد پر ایک ساحلی خانہ بدوش قبیلہ کی زبان رہی ہے جو سالونز (Selung) کے نام سے مشہور ہے۔ وہاں سے، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، وہ (آسٹرونیسین) بحر الکاہل (Oceanic) کے اس پار جزیرۂ ایسٹر تک، اور جنوب میں آسٹریلیا کو بیچ میں چھوڑتی ہوئی، نیوزیلینڈ تک پھونچتی ہے۔ انڈو چینی زبانیں آسٹرو ایشیاٹک شعبہ کی خاص نمایندہ ہیں جن سے اس وقت ہمیں کوئی سروکار نہیں ہے۔ علاوہ انڈو چین کے اسکی دوسری شاخیں برما، آسام، اور خلیج بنگال کے پار جزائر نکوبار میں ہوتی ہوئی وسط ہند میں پھیلی ہوئی ہیں، جہاں اس کو سنتالی اور دیگر مخلوط زبانوں کی شکل میں وہ پہاڑی جرگے مثل سنتال، منڈے، اور کرکو استعمال کرتے ہیں جن کے ناموں سے مشنری سوسائیٹیوں کے رسائل پڑھنے والے بخوبی واقف ہوں گے۔ ہندوستان کے لسانی معائنہ سے جو حال ہی میں اختتام کو پھونچا ہے، ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس شعبہ کی زبانیں وادی گنگا کے ایک بڑے حصہ اور کوہ ہمالہ کے جنوبی رُخ میں براہِ راست پنجاب تک مروّج رہی ہیں۔ اس تمام وسیع رقبہ پر اگرچہ دوسری زبانیں بھی اب تک قابض ہیں جن کو وہاں بعد کو آ کر آباد ہونے والے لوگ بولا کرتے تھے، تاہم اصلی زبان کی بہت سی یادگاریں آسٹرو ایشیاٹک الفاظ اور محاورات کی صورت میں محفوظ ہیں۔ علاوہ بریں بہت قدیم زمانہ میں ان کا سراغ لگایا جاسکتا ہے جیسا کہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔ جب آرین لوگ شمال مغرب سے ہندوستان میں داخل ہوئے تو ان کو اپنے اس نئے مسکن میں ایسی چیزوں سے سابقہ پڑا جن کے ناموں سے وہ پہلے قطعاً ناآشنا تھے۔ اس لئے وہ مجبور ہوئے کہ ان کو ان کے دیسی ناموں ہی سے یاد کریں۔ اسی طرح کئی دیسی نام انکی زبان پر چڑھ گئے اور یہی نام اب بطور اصلی زبان کی یادگار کے سنسکرت میں، جو آج سے دو ہزار سال پیشتر مُردہ ہو چکی ہے، باقی ہیں یہاں ہم مثالاً چند اشیا کے نام لکھتے ہیں جو آسٹرو ایشیاٹک نژاد ہیں، اور سنسکرت میں عام طور پر مستعمل ہیں:۔

"پان - روئی - روئی کا کپڑا - بانس کا تیر،" وغیرہ

یہ الفاظ اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہونے سے پہلے محققین السنۂ ہند کے لئے باعثِ پریشانی تھے۔ ان الفاظ کی طرح بعض شہروں کے نام بھی باوجود آسٹرو ایشیاٹک نسل سے ہونے کے سنسکرت لٹریچر میں داخل ہوگئے ہیں۔ آرین قوم نے ان کو استعمال ہوتے دیکھا اور اختیار کرلیا۔ اس کی ایک دلچسپ مثال اس قبیلہ کا نام ہے جس کو ملایا والے۔ جن کی زبان آسٹرونیسین ہے، "کلنگ" کہتے ہیں۔ یہ لفظ دراصل ہندوستان کے مشرقی ساحل

کے سنسکرت نام "کلنگا" کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ لطف تو یہ ہے کہ لفظ "کلنگا" اصل میں آسٹروایشیاٹک ہے۔ جس کو سنسکرت نے عاریتاً لے کر اپنا بنا لیا تھا۔ اب یہ اس قدر عام ہو گیا ہے کہ یورپین بھی اس کو استعمال کرنے لگے ہیں چنانچہ پلینی (Pliny) کی کتاب نیچرل ہسٹری (تاریخ طبیعی) میں یہ لفظ موجود ہے۔ یہ آسٹروایشیاٹک لفظ کی ایک عمدہ مثال ہے جس کو انڈو آرین نے اختیار کیا، اور جو بگڑی ہوئی صورت میں مجمع الجزائر ملایا کی آسٹرونیشین بھاکا میں دوبارہ نمودار ہوا۔ ویانا (Vienna) کے پادری اسمڈٹ (Schmidt) جو اس موضوع پر ہمارے لئے ایک بہت بڑی سند ہیں، یہ رائے رکھتے ہیں کہ اُن تمام آسٹروی زبانوں کی قدیم ترین شکل، جس کا سراغ لگایا جا سکتا ہے خود ہندوستان میں ضرور مستعمل رہی ہو گی، اور یہاں سے یہ زبانیں آگے بڑھتی ہوئی بحرالکاہل کے پاس جزیرۂ ایسٹر اور نیوزیلینڈ تک پہونچ گئی ہونگی۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اس طویل سفر کے باعث ان میں اہم تبدیلیاں واقع ہوگئیں، مگر یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اب بھی صاف طور پر ان کی قرابت قریبہ کا پتہ چلتا ہے ہندوستان کی آسٹروایشیاٹک زبانوں میں قابلِ ذکر ایک تلنگ زبان ہے جو پہلے برما میں بولی جاتی تھی اور اب جنوبی حصۂ پیگو (Pegu) کی بولی ہے، اور دوسری آسام کی خاصی اس ضلع کی زبان ہے جس میں صوبہ کا صدر مقام شیلانگ واقع ہے۔

اگر ہم سنتالی زبان کو ان ہندوستانی آسٹروایشیاٹک زبانوں کی ایک اہم شاخ کے طور پر لیتے ہیں تو فوراً ہماری نظر اس کے نحوی قواعد کی ظاہری پیچیدگی میں اُلجھ کر رہ جاتی ہے، حالانکہ وہ تمامتر باقاعدگی کا ایک عمدہ نمونہ ہے، اور اس لحاظ سے وہ اسی قدر آسان ہے جتنی کہ اسپرانٹو (Esperanto) اس زبان میں آسان ترین خیال کو ادا کرنے کا طریقہ اس بات کا مقتضی ہے کہ ہر فعل پورے جملہ کی جزئیات پر مشتمل ہو مثلاً "دال" ایک فعل ہے جس کے معنی ہیں مارنا، پیٹنا۔ اب اگر ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ:۔

"میرے غلام کا لڑکا خود کو پیٹنے کی اجازت دیتا ہے"، تو فعل دال کی یہ صورت ہوگی:۔

"ڈالوچوا کنتا ایتنائی" (dalachoakantahenta aetinea) اس جملہ میں ہر کلمہ پر زور دیا جاتا ہے، ورنہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ:۔

"وہ شخص جس کا تعلق اُس سے ہے جو مجھ سے تعلق رکھتا ہے اپنے تئیں لوگوں کے ہاتھ سے مار کھلاتا رہے گا!"

ایک سنتالی فعل کی پوری گردان کے لئے اگر ایک معمولی گرامر کے چھ سو صفحات وقف ہو جائیں تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ مگر پھر بھی اس کے تمام اصول اور قواعد اس قدر آسان اور منطقی ترتیب پر ہیں کہ صرف چند

گھنٹوں کی کوشش سے ہم اون پر حاوی ہو سکتے ہیں۔

آسٹروی زبان کے برعکس دراویدی زبانوں کے باہمی تعلقات اگر منقطع نہیں ہوگئے ہیں تو مشتبہ ضرور ہیں۔ یہ زیادہ تر جنوبی ہند میں مروّج ہیں۔ ان میں قابل ذکر السنہ تامل، کانڑی، اور تلگو ہیں اور ان کے بولنے والے علی الترتیب ایک کروڑ اسی لاکھ۔ ایک کروڑ۔ اور دو کروڑ چالیس لاکھ ہیں۔ یہ زبانیں باقاعدہ اور اصول نحو کے ساتھ منضبط ہیں ان میں ہندوستان کے قدیم تمدن سے متعلق قیمتی لٹریچر پایا جاتا ہے۔ ان زبانوں کے علاوہ بہت سے چھوٹے چھوٹے قبائل کی خانگی بولیاں جو شمالی ہند بلکہ بلوچستان اور دریائے سندھ کے اوپر جانب مغرب پھیلے ہوئے ہیں، دراویدی ہیں، اور اسی دیسی زبان کو برتنے والے مجموعی طور پر اب بھی جرمنی کی آبادی سے زیادہ یعنی چھ کرور چالیس لاکھ ہیں۔ ہر شخص اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ اگلے وقتوں میں دراویدی بولنے والے قبائل مغربی ہند اور پنجاب پر قابض تھے مگر وہ کہاں سے آئے تھے اور مغربی ہند پر کس طرح قابض ہوئے، یہ ایسے سوالات ہیں جن پر اب تک محققین متفق الرائے نہیں ہوئے۔ ایک گروہ کا جس کے مؤیدین میں مسٹر (Slater)[۵] کا حال میں اضافہ ہوا ہے، یہ خیال ہے کہ آریوں کی طرح مگر ان سے بہت پہلے دراویدی بھی شمال مغرب سے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔ اور یہ مسلم الثبوت امر ہے کہ جب آرین لوگ ہندوستان میں داخل ہوئے تو انہوں نے ان دراویدوں کو بہت متمدن میں پایا تھا، جو بڑے شہروں میں سکونت پذیر اور پنجاب پر قابض تھے، جہاں قابض ہونے سے پہلے ان کو سخت معرکہ آرائیاں کرنی پڑی تھیں۔ ایک گروہ کا یہ خیال ہے کہ زمانۂ قبل التاریخ میں آسٹریلیا دراویدی اس وقت ہندوستان آئے جبکہ ان ہر دو ممالک کے درمیان خشکی کے راستہ سے آمد و رفت کا سلسلہ جاری تھا۔ یہ نظریہ ابھی زیر تحقیق ہے اور اس کے متعلق کوئی ناطق فیصلہ دینا یقیناً قبل از وقت ہوگا اور اگرچہ ہم اس کے ثبوت میں کوئی بات اس قسم کے تعلقات کی نسبت پیش نہیں کر سکتے، تاہم بعض وجوہ مشترکہ کی بنا پر ہم اس نظریہ کو ناممکن بھی نہیں کہہ سکتے۔

(باقی)

---

[۵] گلبرٹ سلیٹر ایم، اے، باٹی۔ ایس سی سابق پروفیسر معاشیات مدراس یونیورسٹی اور مصنف "ہندوستانی تہذیب میں دراویدی عنصر" (مترجم)

کتاب الاغانی

اور

ابو الفرج اصفہانی

(از قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی)

ہمارے دوست قاضی احمد میاں صاحب اختر کا یہ مضمون عرصہ ہوا رسالہ العصر (لکھنؤ) میں شائع ہو چکا ہے لیکن حال ہی میں ایک مضمون مصر کے عربی رسالہ الزہرا میں آغانی اور اس کے مصنف پر شائع ہوا ہے اس میں سے بعض معلومات مفیدہ کو اخذ کر کے بادنی تغیر قاضی صاحب موصوف نے ہمیں بغرض اشاعت ارسال فرمایا ہے جس کو ہم ذیل میں شائع کرتے ہیں۔ "اڈیٹر"

عرب قدیم کے متعلق اسلامی مورخین کے لئے اشعار وامثال عرب ایک بہت بڑا ذریعہ معلومات کا ہوئے، چنانچہ اسلامی مورخین یعقوبی، طبری، مسعودی، ابن اثیر، ابوالفدا، ابن خلدون وغیرہ نے علاوہ دیگر ذرائع معلومات کے زیادہ تر اسی ذریعہ سے عرب قدیم کا حال لکھا ہے، اس میں شک نہیں کہ اشعار عرب سے ایام عرب، ان کی لڑائیاں، اور اخلاق وعادات کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے، لیکن یہ اشعار ایک مدت تک زبانی روایت ہوتے چلے آئے اس بنا پر انکا اکثر حصہ برباد ہو گیا، اگرچہ اسلام میں ابوعبیدہ اور اصمعی اشعار عرب کے سب سے بڑے راوی خیال کئے جاتے ہیں لیکن ان لوگوں نے بھی جو سرمایہ جمع کیا تھا اس کا اکثر وبیشتر حصہ ضایع ہو گیا۔ تاہم عرب قدیم کے لوگوں کی تاریخ ان کے عادات واطوار اور ان کی طرز معاشرت کے متعلق لٹریری حیثیت سے جو کچھ باقی رہ گیا ہے وہ اب تک "کتاب الاغانی" میں محفوظ ہے۔

کتاب مذکور اصل میں سو قسم کی ان مختلف راگنیوں کے بیان پر مبنی ہے جن کو مغنیون نے خلیفہ ہارون الرشید کے لئے اختیار کیا تھا[1] ان راگنیوں میں مصنف نے بھی کئے ایک راگنیوں کا اضافہ کیا ہے گویا یہ ان تمام موسیقانہ عربی اشعار کی تاریخ ہے جو مصنف کے زمانہ تک گائے گئے ہیں۔ ان اشعار کے بول اور ان کی دھن بتانے کے بعد ان کے موجدین شعرا اور مغنیون کے حالات بھی بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے، جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے، کہ مصنف نے صرف اسی موضوع پر اکتفا کیا ہے، بلکہ اخبار و اشعار، اور انساب وایام عرب کے

---

[1] مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۵۵۱۔

علاوہ اُن تمام مغنیّوں اور شعراء کے حالات پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے جن کا کلام اس کتاب میں درج ہے، اور بعض جگہ تاریخ و دیگر علوم سے بھی بحث کی ہے۔ علاوہ بریں مغنیہ اور شاعرہ عورتوں، کنیزوں، شراب ملانے والوں، اور گانیوالے حسین لڑکون کے حالات بھی اس کتاب میں مذکور ہیں۔ مختلف اوقات میں مختلف قسم کے لوگوں کے نوادر اور لطائف و ظرائف بیان کئے ہیں۔ مشاہیر شعراء مثل ابو تمام، ابو نواس، بحتری وغیرہ کے کلام کا اکثر حصہ جمع کر دیا ہے۔ بعض مستند احادیث و روایات، نحو و لغت، سیر و مغازی، طلب و بیطاری، اور ہیئت و نجوم سے متعلق کئی باتیں اس میں درج کی ہیں غرضکہ مصنف نے کوئی چیز رطب و یابس اُٹھا نہیں رکھی اور اس نے ہمارے لئے ایک ایسا مواد فراہم کر دیا ہے جس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اصفہانی نے کوئی واقعہ اغانی میں ایسا نہیں لکھا جسکی اسانید اور مختلف روایات کو نہ بیان کیا ہو۔ ان اسانید اور روایات مختلفہ سے متناقض اور مبالغہ آمیز روایات میں ہم تمیز کر کے صحیح اور غلط کو پہچان سکتے ہیں۔ کتاب الاغانی کا طرز تحریر بلیغ حشو و زوائد اور تعقید و تکلیف سے پاک ہے۔ بغداد کے بویہی حکمراں معز الدولہ کے وزیر ابو محمد المہلبی اس کتاب کی تعریف میں لکھتے ہیں:۔

"فهو للزاهد فكاهة، وللعالم مادة وزيادة، وللكاتب والمتادب بضاعة وتجارة، وللبطل رحلة وشجاعة، وللمضطرب رياضة وصناعة وللملك طيبة ولذادة" [۱]	یہ کتاب ایک زاہد خشک کے لئے تفریح کا سامان، ایک عالم کے لئے معلومات کی کان، ایک انشا پرداز اور طالب ادب کے لئے سرمایہ تجارت، ایک بہادر کے لئے سفر اور شجاعت، ایک مضطرب آدمی کے لئے ورزش و ریاضت اور ایک فرماں روا کے لئے تفریح و لذت ہے۔

بلاشبہہ عربی لٹریچر میں یہ ایک نہایت اہم کتاب ہے۔ مشہور مورخ ابن خلدون اس کتاب کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

ولعمري انه ديوان العرب وجامع اشتات المحاسن التي سلفت لهم في كل فن من فنون الشعر والتاريخ والغناء وسائر الاحوال	بجان عزیزم! یہ کتاب عربوں کا پورا دفتر یا رجسٹر ہے اور اُن تمام مختلف محاسن مثل شعر تاریخ اور موسیقی وغیرہ پر حاوی ہے جو انہوں نے زمانۂ قدیم میں حاصل کئے تھے۔
ولا يعدل به كتاب في ذالك فيما نعلمه، وهو الغاية التي يسمو اليها الاديب ويقف عندها واني له بها [۲]	جہاں تک ہمیں معلوم ہے کوئی کتاب اس فن میں اس کی برابری نہیں کر سکتی۔ ایک ادیب کے لئے یہ غایت مانی الباب ہے جہاں تک وہ پہونچ سکتا ہے اور جس کے بعد اس کو کسی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی

[۱] دیکھو مقدمۂ اغانی۔ [۲] مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۵۵۱۔

ابن خلکان کی روایت مندرجہ ذیل سے اس کتاب کی اہمیت بخوبی ثابت ہوتی ہے :۔

"کہا جاتا ہے کہ صاحب بن عباد[1] تیس اونٹ کتابوں کا بوجھ سفر میں ہر وقت مطالعہ کرنے کے لئے ساتھ رکھا کرتا تھا لیکن جب کتاب الاغانی اسے مل گئی تو اس نے صرف اسی ایک کتاب کو ساتھ رکھنے پر اکتفا کیا"[2]

الغرض یہ نہ صرف موسیقی عرب کی ایک ڈکشنری ہے بلکہ اہل عرب کی شاعری، ان کی تاریخ، اور ادب کی ایک جامع و مانع انسائیکلو پیڈیا ہے۔

اس مشہور کتاب کا مصنف قاضی علی بن حسین بن محمد بن احمد بن ہیثم اُموی مشہور بہ ابو الفرج اصفہانی ہے۔ وہ ۲۸۴ھ مطابق ۸۹۷ء بمقام اصفہان پیدا ہوا۔ وہ عرب عربا قریش کی خاص نسل سے اور سلاطین اُمویہ کے آخری خلیفہ مروان بن محمد کے خاندان سے تھا۔ اس کا خاندان اگرچہ اصفہان میں مقیم تھا۔ لیکن اس کا عنفوان شباب زیادہ تر بغداد ہی میں گذرا تھا جہاں وہ بطور ایک ادیب اور مصنف کے مشہور رہا۔ وہاں اس نے تعلیم و تربیت پائی اور وہیں سکونت اختیار کی۔ وہ بنی امیہ کے خاندان سے ہونے کے باوجود مذہباً شیعہ تھا[3]۔ سکونت عراق اور قرب فارس کی وجہ سے نیز عجمی اہل تشیع کے میل جول سے (جو بغداد آتے جاتے رہتے تھے) غالباً وہ مائل تشیّع ہوا ہوگا۔

امیر سیف الدولہ حاکم شام کے دربار میں اس کی رسائی تھی اور امیر اسے انعام و اکرام سے سرفراز کیا کرتا تھا۔

اسی طرح بنی اُمیہ اندلس سے بھی پوشیدہ طور پر اس کی چند تصانیف کا صلہ ملا کرتا تھا جن کو وہ اندلس وقتاً فوقتاً بھیجا کرتا تھا۔

یاقوت حموی کا بیان ہے کہ ابو الفرج بہت کثیف اور میلا کچیلا رہا کرتا تھا۔ اور کبھی اپنے کپڑے نہیں دُھلواتا تھا حتی کہ جب تک وہ بوسیدہ ہو کر نہ پھٹ جاتے وہ ان کو اپنے جسم سے نہیں اُتارتا تھا[4]۔

اصفہانی ہجو گوئی میں بہت مشہور تھا۔ چنانچہ لوگ اسکی مذمت اور زبان تلخ سے بہت ڈرتے تھے۔ ابو عبداللہ البریدی کو جب عہدۂ وزارت تفویض ہوا تو اس نے ہجو لکھی جسکا مطلع یہ ہے :۔

یاسماء اسقطی ویاارض میدی	اے آسمان ٹوٹ پڑ اور اے زمین متزلزل ہوجا
قد تولی الوزارۃ ابن البریدی	ابن البریدی کو وزارت مل گئی ہے!

[1] یہ بڑا عالم فاضل اور ادیب شخص مؤید الدولہ اور فخر الدولہ (بوئیہی) کا وزیر تھا۔ اس کا نام ابو القاسم اسمٰعیل بن ابی الحسن عباد بن عباس ہے ۳۸۵ھ میں بمقام رے وفات پائی (ابن خلکان ج ۱ ص ۷۵ و ص ۷۶)

[2] ابن خلکان ج ۱ ص ۳۳۴ [3] ایضاً

[4] ارشاد الاریب الی معرفۃ الادیب ج ۵ ص ۱۵۲ - ص ۱۵۳

تغزل میں اس کے عمدہ اشعار ہیں جو یاقوت اور الفخری نے نقل کئے ہیں[۵۱]

کہتے ہیں کہ کتاب الاغانی کی تصنیف میں اس نے اپنی عمر کا ایک معتدبہ حصہ یعنے پچاس برس کر دئے، اور اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ امیر سیف الدولہ کی خدمت میں پیش کیا تو اس نے ایک ہزار دینار عطا کئے اور ساتھ ہی ایک ایسی معرکۃ الآرا کتاب کی تصنیف پر اس قدر قلیل رقم دینے پر معذرت خواہی کی[۵۲] حاجی خلیفہ نے لکھا ہے کہ عضدالدولہ نے اس کتاب کا ایک نسخہ چار ہزار درم کو خریدا تھا جسے وہ سفر و حضر میں کسی وقت اپنے پاس سے جدا نہیں کرتا تھا[۵۳]

اُسی زمانہ میں اندلس میں امیر الحکم بن عبدالرحمن الناصر (المتوفی ۳۶۶ھ) بڑا علم دوست اور کتابیں جمع کرنے کا شایق تھا۔ اس کی یہ خاص کوشش تھی کہ جو نادر تصنیف ممالک مشرقیہ میں لکھی جائے بغداد سے پہلے اسپین آئے، اس کوشش میں وہ بہت سا مال و زر صرف کیا کرتا تھا جب اس کو یہ خبر پہونچی کہ ابوالفرج کتاب الاغانی تصنیف کر چکا ہے تو اس سے درخواست کی کہ یہ کتاب عراق (بغداد) پہونچنے سے پہلے اُن کے پاس بھیجدی جائے! ور اس کے عوض میں الحکم نے ایک ہزار اشرفیاں بھیجیں[۵۴]

ابوالفرج نے چہارشنبہ ذی الحجہ ۳۵۶ھ مطابق ۹۶۷ء میں بمقام بغداد وفات پائی۔ مرنے سے چند روز قبل اس کے حواس معطل ہو گئے تھے[۵۵]

ابوالفرج کی تصانیف حسب ذیل ہیں جن کا ذکر ابن الندیم حاجی خلیفہ اور یاقوت نے کیا ہے:۔[۵۶]

۱ کتاب الاغانی الکبیر	۸ اخبار القیان
۲ کتاب مجرد الاغانی	۹ الممالیک الشعراء
۳ التعدیل والانصاف فی اخبار القبائل وانسابہا	۱۰ ادباء الغرباء
۴۔ مقاتل الطالبیین (چھپ گئی ہے)	۱۱ اخبار جحظۃ البرمکی
۵ الماء والشواء	۱۲ کتاب اخبار الطفیلیین
۶ الدیارات	۱۳ کتاب مناجیب الخصیان
۷ دعوۃ التجار	۱۴ الاخبار والنوادر

[۵۱] ملاحظہ ہو اسکا کلام ارشاد الاریب ج ۵ ص ۱۵۲ ۔ ص ۱۵۳ میں، نیز الفخری کی کتاب الآداب السلطانیہ ص ۳۸۷ ۔ ص ۳۸۸ میں۔
[۵۲] ابن خلکان ص ۳۳۴ ۔ [۵۳] کشف الظنون ج ۱ ص ۱۲۶ ۔ [۵۴] نفح الطیب للمقری ج ۱ ص ۱۸۰ ۔
[۵۵] ابن خلکان ج ۱ ص ۳۳۵ ۔ [۵۶] کتاب الفہرست ص ۱۱۵ ، ارشاد الاریب ج ۵ ص ۱۵۱ ۔ ص ۱۵۲

۱۵ کتاب الخمارین والخمارات
۱۶ کتاب فی النغم
۱۷ اعیان الفرس
۱۸ الفرق والمعیار فی الاوغاد والاحرار
(ہارون بن المنجم کے لئیے یہ رسالہ لکھا گیا تھا)
۱۹ کتاب الدیانات
۲۰ تحف الوسائد فی اخبار الولائد
۲۱ جمہرۃ النسب
۲۲ نسب المہالبہ
۲۳ نسب بنی شیبان
۲۴ نسب بنی عبد شمس
۲۵ نسب بنی تغلب
۲۶ تفصیل ذی الحجۃ

جہاں تک ہمیں معلوم ہے اصفہانی کی کوئی کتاب سوائے کتاب الاغانی اور مقاتل الطالبین کے اب تک معرض طبع میں نہیں آئی۔ اور اس طویل فہرست میں سے شاذ ہی چند رسائل یا ان کے متفرق اجزا ممالک اسلامیہ کے کتب خانوں یا یورپ کی لائبریریوں میں مل سکیں۔ اگرچہ قرین قیاس تو یہی ہے کہ تاتاری سیلاب نے جہاں لاکھوں بیش بہا جواہر دجلہ فرات میں غرق کر دئے۔ وہاں ان کو بھی دریا برد کر دیا ہوگا۔ کیونکہ اس طویل عرصہ میں اس کی کسی تصنیف کی موجودگی کا پتہ نہیں چل سکا۔

یورپ میں سب سے اول جب فرانسیسیوں نے مصر پر چڑھائی کی اس وقت کتاب الاغانی کا قلمی نسخہ موسیو ریج (M. Reige) کو دستیاب ہوا جو اب تک پیرس کی رائل لائبریری میں رکھا ہوا ہے[۱]
کتاب الاغانی سب سے پہلے قاہرہ کے مطبع بولاق میں ۱۲۸۵ھ میں، ۲۰ جلدوں میں ناقص طبع ہوئی بعد ازاں مستشرق رُدولف برونو (R. E. Brunnow) نے ۱۳۰۶ھ میں اس کی اکیسویں جلد لیڈن سے شائع کی۔ اور پروفیسر جویدی (Guidi) اطالوی مستشرق نے بعض مستشرقین یورپ کی مدد سے اس کی چار حسب ذیل فہرستیں (انڈکسین) مرتب کیں:-
(۱) اسماء شعراء (۲) قوافی اشعار مندرجہ کتاب (۳) رجال ونساء قبائل (۴) امکنہ وجبال ومیاہ۔
۱۳۱۸ھ میں یہ انڈکس لیڈن سے شائع ہوئی۔ پھر الحاج محمد الساسی نے اس کو مکرر چھاپ کر اغانی کے اکیسویں جلد کے ساتھ ملحق کر دیا۔ یہ انڈکس طبع مصریہ کے حوالۂ صفحات کے ساتھ استاد مفضال بک مسعود نے تیار کی تھی۔
بیروت کے ایک عیسائی پروفیسر انطون صالحانی نے رنات المثالث والمثانی کے نام سے دو لطیف

[۱] روزگارڈن آف پرشیا ازمس کاسٹیلو ص ۹

جلدوں میں اغانی کی تلخیص تیار کی جو ۱۸۸۸ء میں شائع ہوئی لہ

استاد شیخ محمد خضری مفتش المعارف مصر نے اغانی کی تہذیب مرتب کی ہے، یعنی تمام مکررات اور اسانید حذف کرکے، شعراء کے حالات ان کے قبائل کے لحاظ سے ترتیب دئے ہیں، اس تہذیب کو دارالکتب المصریہ نے شائع کیا ہے۔ اور طباعت کے تمام اخراجات کے لئے سید علی بک راتب نے دو ہزار پونڈ (مصری) عطا کئے ہیں۔

ابن منظور صاحب لسان العرب نے بھی اغانی کا اختصار کیا تھا جو مختصر الاغانی کے نام سے مشہور ہے۔ حال میں یہ کتاب محب الدین الخطیب (اڈیٹر الزہراء) کے "مطبع سلفیہ" میں سید محمد عمر الخشّاب کتب فروش کے خرچ سے چھپ رہی ہے۔ یہ نسخہ بھی مکرر روایات، اسانید و اصطلاحات موسیقی سے خالی ہے اور اس میں شعرا کے حالات حروف معجم کی ترتیب پر رکھے گئے ہیں۔

غزل

(ابو الخیال قاضی امانت علی صاحب تسکین (بٹالوی)

یہ کہہ رہی ہیں کلیاں ہنس ہنس کے بیکلی میں
اک موت کا بھی دن ہے دو دن کی زندگی میں

جھڑتے ہیں پھول اُن کے منہ سے ہنسی ہنسی میں
کھلتے ہیں جس طرح سے غنچے شگفتگی میں

تابندہ ہو گیا ہے بندہ بھی بندگی میں
حسن ایاز چمکا ہے عشق غزنوی میں

ہمدم نہ کوئی مونس غمخوار ہے نہ محرم
بس مجھ سے بےکسی ہی لپٹی ہے دوستی میں

ہے حسن و عشق باہم اک دوسرے میں پنہاں
شکل ایاز روشن ہے شکل غزنوی میں

میری زبان کو کیا گوئی کی ضرورت
اظہارِ مدعا کا جذبہ ہے خامشی میں

دُنیا تو عیش میں ہے آباد ساری خلقت
میں ایک بس رہا ہوں دنیائے بیکسی میں

لینے دے لطفِ اُلفت لے ہوش وصل کی شب
ڈوبی ہوئی خودی ہے خود شوق بیخودی میں

اک سانس آنے والی اک سانس جانے والی
ہے رازِ زندگی کا بس یہ ہی آدمی میں

لہ القفا ء القنوع بماہو مطبوع صفحہ ۲۸۱

مترجمات

ہندوستان اور جاپان

رسالہ ماڈرن ریویو بابت جولائی ۱۹۲۶ء میں ڈاکٹر جے۔ ٹی سنڈرلین ہندوستان اور جاپان کا مقابلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"جاپان جو کچھ عرصے کے پہلے بالکل گمنامی کی حالت میں تھا آجکل اس کا شمار ایشیا کی سربرآوردہ اقوام میں ہوتا ہے اور وہ دنیا کی ایک ترقی یافتہ حکومت بن گیا ہے۔ ستر برس پہلے جبکہ کوموڈر پیری نے جاپان کا جمودِ غفلت دور کیا اور بیرونی ممالک سے اس کے تعلقات قائم کرنے کے لئے اس کے دروازے کھول دئے اس وقت وہ ایشیا میں غیر معروف سا تھا۔ جاپان تماتر زراعتی ملک تھا، جس کے مصنوعات بہت تھوڑے اور اس کی خارجی تجارت بالکل محدود تھی۔ اس کے پاس لوہا یا کوئی دوسری فلزات نہ تھیں۔ کوئلہ بھی اس کے ہاں کچھ زیادہ نہ تھا۔ برخلاف اس کے لوہا، کوئلہ اور دیگر ضروری اشیاء ہندوستان میں بکثرت اور غیر مختتم تھیں۔ جاپان کی دولت ہندوستان کے مقابلہ میں (جو اُسے برطانوی اقتدار سے قبل حاصل تھی) بہت معمولی تھی۔"

تو پھر جاپان کی ترقی اور کامیابی کا راز کس چیز میں مضمر ہے؟ ڈاکٹر سنڈرلینڈ ہمیں بتاتے ہیں کہ جاپان گورنمنٹ نے جاپانیوں کے لئے جو کچھ کیا ہے اس کے بالکل برعکس حکومت ہند نے ہندوستانیوں کے لئے کیا ہے۔ اس کو وہ بدفعات ذیل بیان کرتے ہیں:-

"(۱) سب سے پہلے جاپان گورنمنٹ نے اپنی رعایا کی تعلیم کی طرف توجہ کی اور اس میں یہاں تک کوشش کی کہ تمام ملک میں کسی گھر میں کوئی شخص جاہل نہ رہنے پائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دنیا کی تمام اقوام کے مقابلہ میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ قوم ہے۔

بجائے اس کے ہندوستان کی گورنمنٹ نے اپنی رعایا کے تعلیمی مطالبہ کا اس قدر انکار کیا کہ ایک سو ساٹھ (۱۶۰) برس کے بعد بھی ہندوستان کے لوگوں میں فی صدی نو آدمی جاہل اور بے پڑھے پائے جاتے ہیں۔

(۲) حکومت جاپان نے ابتدا ہی سے ہر قسم کی صنعت و حرفت کو اپنے ملک میں رائج کر دیا اور ہر قسم کی اشیاء

اپنے ہاں بنانی شروع کردیں حتیٰ کہ اس لحاظ سے اب وہ ایشیا کی ایک ترقی یافتہ قوم ہے۔

بجائے اس کے ہندوستان کی غیر ملکی حکومت نے اپنے تجارتی محصولات اور دوسرے طریقوں سے رفتہ رفتہ ہندوستان کی مقامی پیداواروں اور ملکی مصنوعات کو انگلستانی مصنوعات کی بہبودی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھادیا اور اس طرح ہندوستان کو ایک زبردست صنعتی قوم سے برطانیہ عظمیٰ کی مصنوعات کے لئے خام پیداواریں مہیا کرنے والے ملک میں تبدیل کردیا۔

(۳) جاپان کی حکومت خود اختیاری نے شروع ہی سے ہر ممکن طریقہ سے خارجی تجارت اور جہاز سازی کو اپنے ہاں داخل کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فی الحال جاپان نہ صرف ایشیا میں بلکہ تمام دنیا میں بلحاظ تجارت اول درجہ رکھتا ہے۔

اس کے برخلاف ہندوستان کی برٹش گورنمنٹ نے اپنے برطانی تاجروں اور جہاز ران کمپنیوں کی سرپرستی کرکے عملی طور پر ہندوستان کی تجارت اور اس کی صنعت جہاز سازی کو تباہ و برباد کردیا ہے حتیٰ کہ ہندوستان کی خارجی تجارت اب زیادہ تر برطانی ہی ہے جو برطانیہ کے زیر اقتدار ہندوستان کی بجائے برطانیہ کے تمول میں اضافہ کررہی ہے۔"

آخر میں ڈاکٹر سنڈرلینڈ کہتے ہیں کہ اگر ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں اپنی قومی حکومت کی باگ ہوتی جیسی کہ جاپانیوں کے ہاتھ میں ہے تو ہندوستان اپنی ملکی پیداواروں سے (جو ہر حال میں جاپان سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہیں) اور اپنی غیر محدود فردکاری کی بہم رسانی کے ذریعہ جاپان سے کہیں سے زیادہ شاہراہِ ترقی پر گامزن ہوتا۔

ہندوستان کی تعلیم کا دردناک انجام

مندرجہ بالا عنوان سے ایک مضمون مسٹر آلڈس ہکسلے کے قلم سے اخبار نیشن میں شایع ہوا ہے اگرچہ اس میں کچھ مبالغہ معلوم ہوتا ہے تاہم اس میں شک نہیں ہے کہ ہندوستان میں انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کی کثرت نے انکی حالت کو ایک ناگفتہ بہ "ٹریجڈی" بنادیا ہے جس سے ہمیں عبرت حاصل کرنی چاہئے۔ مضمون نگار لکھتا ہے:-

"کاشمیر میں تم ایک کلرک کو اپنے باورچی کی نصف تنخواہ پر ملازم رکھ سکتے ہو۔ کچھ کاشمیر ہی پر منحصر نہیں ہے

بلکہ ہندوستان بھر کی یہی حالت ہے۔ حال ہی میں ایک سرکس کا تماشا کرنے والی کمپنی لاہور میں آئی اور اس نے ایک دربان کے لئے پندرہ روپیہ کی تنخواہ کا اشتہار دیا۔ مجھ سے لوگوں نے بیان کیا کہ اس نوکری کے امیدوار دو سو میں کوئی چالیس کے قریب گریجوٹیوں کی عرضیاں بھی تھیں"۔

یونیورسٹیاں ایسے گریجوٹیوں کی ایک کثیر تعداد پیدا کر رہی ہے جن کو کوئی کام نہیں ملتا۔ حکومت ان کی صرف ایک محدود تعداد کو ملازمتیں دے سکتی ہے، اور مغربی تعلیم پائے ہوئے لوگوں کے لئے گورنمنٹ کی ملازمت کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ ایسے صنعتی تجارتی کاروبار کا ہندوستان میں خیر سے وجود ہی نہیں ہے جن کے لئے ہمارے کئی مغربی نوجوان اپنے تئیں وقف کر دیتے ہیں اور کوئی ایسا سرمایہ ناممکن الحصول ہے جس کے ذریعہ اس قسم کا صنعتی کاروبار بڑے پیمانہ پر جاری کیا جا سکے۔ پھر عام تعلیم یافتہ ہندوستانیوں میں بطور خود اس قسم کا کام مختصر پیمانہ پر کرنے کی جرأت اور مادّہ نہیں ہے ان کا نصب العین کوئی ایسا محفوظ عہدہ کلرکی ہے۔ جو ذمہ داریوں سے بالکل پاک ہو اور آخر میں تھوڑی سی پنشن! طوطے کی طرح رٹ کر حاصل کی ہوئی تعلیم ان کو کسی مصرف کا نہیں رکھتی۔ اور بدقسمتی سے ایسی پنشن والی محفوظ کلرکیوں کی تعداد بہت ہی محدود ہے غرضکہ تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی جماعت ہندوستان میں روز افزوں ترقی کر رہی ہے جو ایک مستحکم گورنمنٹ کے لئے بڑی حد تک خطرناک ہے۔

موجودہ انگریزی مصنفین کی تصانیف کا معاوضہ

لندن کے مشہور روزنامہ گرافک میں انگریزی زبان کے موجودہ مصنفین کی بعض تصانیف کا معاوضہ بتایا گیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے تعجب ہوتا ہے کہ انشا پردازوں اور مصنفوں کی یورپ میں کیسی کچھ قدر کی جاتی ہے۔ روزنامہ مذکور لکھتا ہے کہ:-

"مس ایتھل ایم ڈیل کا خیال کرو کہ اس کو اپنی تصانیف کے معاوضہ میں کیسی عظیم الشان کامیابی حاصل ہوئی! کیا مسز ایسکوتھ نے اپنی توزک (آپ بیتی) کے لئے تیرہ ہزار پونڈ، اور مسٹر اے۔ ایم ہچنسن کو اس کے ایک ناول "*Mrs Tantiness*" [illegible] کے عوض تیس ہزار پونڈ نہیں حاصل ہوئے؟ کچھ عرصہ ہوا ایک نشر کتب کمپنی نے مسٹر لائڈ جارج کو تین لاکھ الفاظ کی ایک کتاب کے لئے نو ہزار پونڈ پیش کئے۔ سر آرتھر کینن ڈائل نے بارہ افسانے

لکھکر جن میں اس نے شرلاک ہومز کو پھر زندہ کیا ہے، نو ہزار پونڈ وصول کئے۔ مسٹر چرچل کی علمی تصانیف کی آمدنی ایک بہت معقول رقم ہے اور یہ تو ہمیں معلوم ہی ہے کہ ان کو بعض خاص مضامین کے لئے ہر مضمون پر ۲۵۰ پونڈ کا صلہ دیا گیا۔"

کیا اس قسم کی فیاضانہ قدردانیوں کی امید ہندوستان میں بھی کبھی کی جاسکتی ہے؟ غریب مصنف کو مشکل سے اتنا موقعہ ملتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اپنی تصانیف کو چھپوا سکے تا بمعاوضہ چہ رسد! اس کے لئے اس غریب کو رؤسا اور امرا کی خوشامد اور والیان ریاست کے درباروں میں جبہہ سائی کرنی پڑتی ہے تب کہیں جا کر بشرط "انتساب" صرف چھپوائی کے اخراجات ملجاتے ہیں۔

عربوں کا اکتشاف امریکہ

کلمبس سے پہلے

یورپ کے بعض فضلا عرصے سے اس بات کے مدعی ہیں کہ کلمبس سے پہلے مسلمان عربوں نے امریکہ کو دریافت کرلیا تھا سب سے پہلے ڈاکٹر ڈریپر نے اپنی کتاب "معرکہ مذہب و سائنس" میں اس بات کا اعتراف کیا کہ کلمبس کو ابن رشد کی کتاب پڑھکر اس کی تصانیف کے لاطینی متراجم عرصہ تک یورپ کی درسگاہوں میں پڑھائے جاتے تھے۔ اکتشاف امریکہ کا خیال پیدا ہوا پھر بیروت کے ایک عیسائی نوفل آفندی نے اپنی کتاب "صناجۃ الطرب" میں ملطبرون کے جغرافیہ کے حوالہ سے لکھا کہ اندلس کے ایک عرب قبیلہ نے اطلانتک پار کا سفر کرکے چھٹی صدی میں دریافت کرلیا۔

حال میں اس کے متعلق ایک تازہ شہادت یورپ کے ایک محقق نے بہم پہونچائی ہے جو نہایت مستند اور ناقابل تردید ہے۔ چار سال کا عرصہ ہوا ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر لیو تیز (Leo - Wiener) نے "افریقہ و اکتشاف امریکہ" کے نام سے ایک کتاب ۳ ضخیم جلدوں میں شایع کی ہے، اس کتاب میں مصنف نے امریکہ کے ہندیوں (Amer - Indians) کی زبان میں عربی الفاظ کے وجود کا پتہ چلایا ہے۔

مصنف مذکور ۲۶ زبانوں کا ماہر ہے اور چند سال ہوئے اس نے امریکہ کے ہندیوں کی زبان سیکھنا شروع کیا ہے تاکہ وہ اُن الفاظ کو دریافت کرسکے جن سے ان ہندیوں تک پہونچنے والی قوموں کا سراغ لگایا جاسکے چنانچہ اس زبان میں اُسے انگریزی، اسپینی، اور پرتگال الفاظ ملے اور ان سب سے قدیم تر عربی الفاظ تھے مصنف نے اپنی

کتاب کو شائع کرنے کے بعد لکھا ہے کہ ان عربی الفاظ کی تاریخ ۱۲۹۰ء تک پہونچتی ہے یعنے کولمبس کے امریکہ پہونچنے سے دو برس قبل۔

بعض محققین یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ ازد اور مایا کی آبادیاں خالص عربی تھیں یہ دونوں عربی نو آبادیاں ہیں جو امریکہ میں ۱۱۵۰ء کے درمیان قائم ہوئی تھیں۔ عربوں کی آبادی افریقہ میں نویں صدی عیسوی میں اپنے اوج کمال پر پہونچی ہوئی تھیں جہاں سے وہ جنوب کی طرف بڑھتی ہوئی منڈنجو تک مغربی افریقہ اور وہاں سے مشواکان تک پھونچ گئی جو خلیج میکسیکو (Mexico) کے کنارے پر واقع ہے یہی دونوں مقام ہیں جہاں امریکہ کی زبان میں عربی الفاظ کے آثار پائے جاتے ہیں یہ وہ وہی الفاظ ہیں جو قدرتی طور پر فاتح کی زبان سے نکل کر مفتوح کی زبان میں (مثل طبی اور سیاسی الفاظ کے) باقی رہ جاتے ہیں جب عربوں کا تعلق امریکہ سے یک لخت منقطع ہوگیا تو ازد اور مایا کی آبادیاں بھی برباد ہوگئیں کہ وہ عربوں کے تجارتی تعلقات پر مبنی تھیں۔

سائنس کی حدود

یورپ کا مشہور سائنس داں ڈاکٹر ورنن کیلوگ رسالہ "ورلڈ آف ٹوڈے" میں لکھتا ہے کہ:۔

"سائنس نے میرے ضمیر کی شناخت سے متعلق مجھے کچھ بھی واقف نہیں کیا، اور مجھے نہیں بتایا کہ میں کس لئے گیت بناتا اور گاتا ہوں یا موسیقی کے خوشگوار ترانوں سے متاثر ہوتا ہوں سوائے اس دلیل کے کہ میرے آبا و اجداد ایسا ہی کیا کرتے تھے چنانچہ میں نے بھی یہی باتیں ورثہ میں پائی ہیں۔ مگر میرے پیش رؤں کی نسبت بھی یہ معما ایسا ہی لاینحل رہ جاتا ہے۔

سائنس نے مجھے نہیں بتایا کہ میں اپنی چھوٹی بچی سے اس قدر شدت کے ساتھ کیوں محبت کرتا ہوں اور نہ یہ بتایا کہ میں شعر کس لئے کہتا ہوں (اگر میں کہہ سکوں) اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے میرے اس سوال کا جس کو میں بار بار پیش کرکے جواب کے لئے اصرار کرتا رہا ہوں کوئی جواب نہیں دیا۔ کہ مجھ میں ایک فانی روح ہے یا نہیں؟"

کیا خدا نے اپنے برگزیدہ پیغمبر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) سے نہیں کہہ دیا کہ وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (قرآن مجید)

تیرہ سو برس کے بعد سائنس کی زبان سے اس عاجزی و بیچارگی کا اظہار مغربی سائنس کے فدا کاروں کے لئے تازیانۂ عبرت سے کم نہیں ہے!

ادبیات

ایک دوست کی شادی پر

مبارکباد کا پہلا خط

یہ ادبی مضمون ہمیں جناب محمد یوسف صاحب قیصر مدیر ظل السلطان بھوپال کی جانب سے موصول ہوا ہے جس کی پہلی شق مسئلہ ازدواج پر تحقیر آمیز مغربی خیالات ایک ہندوستانی خاتون کی ترجمہ ہے دوسری شق خود جناب قیصر صاحب کی رہین منت ہے۔

قیصر صاحب نے جس خوبی و عمدگی سے اصل خط کے ساتھ دوسرا خط چسپاں کیا ہے وہ نہایت کامیاب اور اس قابل ہے کہ اس کی ضرور داد دی جائے لہذا ہم شکریہ کے ساتھ درج کرتے ہوئے قارئین "زبان" کے ذوق ادب سے بھی داد چاہتے ہیں۔

(اڈیٹر)

دوست!

اب تمھاری شادی ہو گئی ہے، جس وقت میں نے یہ الفاظ سنے میں ٹوکیو (جاپان) کے ایک خوبصورت ہوٹل میں بیٹھی ہوئی چائے پی رہی تھی اس طرح جیسے جی گھبرا جانے کے بعد روح جسم سے علیحدہ کر لی جاتی ہے میں نے بھی چائے کی پیالی تشتری میں رکھدی۔

تمھیں یاد ہوگا، موسم بہار کی ایک لطیف شام کو دریائے نیل کے کنارے پر تم بحری کہانیاں پڑھ رہی تھیں اور میں تمھیں کسی ایک بات پر ستا رہی تھی اور تم سے کھیل رہی تھی اور ہم دونوں شادی اور ازدواجی زندگی کے متعلق گفتگو کر رہے تھے، ہاں خیال کرو، اگر تمھیں وہ شام ذرا بھی یاد ہو؟- !!

جب مجھے اس کا خیال ہوا، اور یقین بھی ہو گیا، کہ اب تم نے اپنے جذبہ خودداری، مستقل مزاجی، اور رپوٹے"

انکاری اشاروں، کو فنا کر کے خاک میں ملا کیے ازدواجی زندگی میں قدم رکھا ہے (جس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے ایک قسم کی نوکری قبول کر لی ہے) تو میرا لوہے کی مانند گرم دل، برف کی مانند سرد ہو کر پگھلنے لگا۔ تحلیل ہونے لگا!

خیر جو کچھ تم نے کیا، اپنے ہی لئے کیا ہے وہ اچھا کیا ہو یا برا کیا ہو مگر میں ...... جس کے متعلق تمھارا یہی یقین ہے کہ ایک سچی دوست ہوں صرف یہی کہوں گی کہ خدا تمھیں نوازے اور امن دے اور جیسا میں نے موسم بہار کی اس خوبصورت شام کو "دریائے نیل کے کنارے کنارے، شادی کو "اپنے خاص نقطۂ نظر سے" ایک قسم کا جرم اقرار دیا، خدا تمھیں صبر دے کہ جرم کی مرتکب بن کر تم "راہ نجات" تلاش کرنے کی بیہودہ کوشش نہ کرو، اور نجات حاصل کرنے کی آرزو کو اس طرح بھول جاؤ جیسے جانور عمر کی زیادتی سے اپنی حقیقی اولاد کو بھول جاتے ہیں۔

تم نے غلطی کی اور مبتلا ہو سکیں، جرم کیا اور مجرم بن گئیں، کوئی مضائقہ نہیں مگر اس کی کیا ضرورت تھی کہ تم مجھے بھی اپنے اس جرم سے آگاہ کر دیں؟ مجرم فطرتاً اپنے جرم کی پوشیدگی چاہتا ہے، مگر شاید یہ سچ ہو کہ شادی کے بعد انسان احمق بن جاتا ہے اور تم لوگوں سے پوشیدگی کا مادہ اس طرح مفقود ہو جاتا ہے جیسے کسی پودے کے سوکھ جانے کے بعد زمین پر اس کا کوئی نشان موجود نہیں ہوتا!!

آخر تم نے اپنے جرم سے مجھے آگاہ کر ہی دیا! ہاں مجھے ...... جو پچھلے چند دنوں سے ٹوکیو میں مطمئن زندگی بسر کر رہی تھی بے امن اور قدرے سراسیمہ کر دیا۔ میرا وہ تنفس، جو گذشتہ چند مہینوں سے مطمئن تھا ایک طویل آہ سرد کی شکل مبدّل ہو گیا۔

اگر حقیقتاً شادی امن، مسرت، محبت، قدر دانی کا نام ہے تو میں پوچھتی ہوں۔ اس میں نجات اور امن کی کوئی شکل کیوں نظر نہیں آتی، دوست! تم برا نہ مانو تو میں ضرور کہوں گی، ایک بات ضرور پوچھوں گی کہ جب مریض کے دو طبیب ہوتے ہیں تو علاج کا نتیجہ موت ہوتا ہے پھر ازدواجی زندگی کے متعلق کیا رائے دیتی ہو جب دونوں کی زندگیاں ایک بنا دی جاتی ہیں تو نتیجہ کیا ہوتا ہے، وہی نا جو دو طبیب والے مریض کا ہوتا ہے، یہی، ناکامی، مایوسی، بے امنی، بے قدری، اور بے لطفی؟ آہ۔

زندگی میں سب سے زیادہ قابل غور مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ ہم زندگی کیوں کر بسر کریں نہ یہ کہ محبت کیوں کریں۔ اس کا خیال نہ کرو کہ محبت کس سے کی جائے میرا خیال ہے کہ وہ شخص، جس نے نہ صرف اپنی غریب زندگی پہ بلکہ تمھاری بیچاری حیات پر بھی ظلم توڑا اسے ذرا سوچے تو اسے بھی معلوم ہو جائے کہ اس نے حقیقتاً تم سے محبت کر کے شادی نہیں کی ہے، بلکہ اس نے تم سے محبت کر کے تمھاری تحقیر کی ہے اور تمھیں دنیا میں رسوا کر دیا جس کا نہ اب تمھیں احساس ہے

اور نہ تمھارے شخص کو، آیندہ تم نے ایک ایسے راستہ کو اپنے لئے پسند کیا ہے جس کی کوئی منزلِ مقصود نہیں اور تم اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک جاؤگی!! تم غریب ——!!

جب میں اپنے شادی شدہ دوستوں کی زندگی کا خیال کرتی ہوں تو نہ صرف میرا جسم بلکہ میرا دل، میرے حواس، میری روح سب لرز جاتے ہیں اور میں ایک صوفے پر گر پڑتی ہوں، پھر مجھے اُس وقت تک کسی قسم کی خبر نہیں ہوتی جب تک کہ میری خادمہ مجھے میری کی صبح ڈاک نہ لادے یا شام کے ملاقاتیوں کے متواتر کارڈ نہ دکھائے کہ وہ ملاقاتی کمرے میں میرا انتظار کر رہے ہیں!

دوست! دل چاہتا ہے کہ تم پر خوب خفا ہوں مگر خیال صرف اتنا ہے کہ تم زیادہ قابلِ رحم ہو اور میں اس ہستی کو زیادہ چھیڑنا نہیں چاہتی جسے کشمکشِ حیات سے آیندہ فرصت ملنے کی کوئی مشکل نظر نہ آئے۔

سچ کہنا اب تم کیسی ہو، زندگی کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے، تم نے تو کبھی مجھ سے اس شخص کا ذکر ہی نہیں کیا اور نہ تعارف کرایا جس نے تمھاری، ایک نامعلوم طور پر، ایک غیر احساس انداز میں تحقیر کی ہے۔

شادی ایک احمقانہ شجاعت ہے مرد کی، اور عورت کی ایک پوشیدہ چال ہے کہ جب وہ مرد کا مضحکہ اڑانا چاہتی ہے تو اس سے شادی کر لیتی ہے مگر وہ ذرا غور کرے، اپنی آپ وہ کتنی تحقیر کرا لیتی ہے! کیوں کہ میرا پختہ یقین ہے کہ عورت کی بدترین تحقیر اس وقت ہوتی ہے جب وہ کسی کی بی بی بن جاتی ہے۔

لو دوست خدا تمھارا نگہبان رہے، تمھارے امن کے لئے میں دعا کروں گی اور مجھے اس کا بھولے سے بھی انتظار نہ ہوگا کہ تم نجات کا خوبصورت راستہ آیندہ ٹٹولتی نظر آؤگی، شرم ——!

مس حجاب اسمٰعیل،

(دی پاسس (لین تھم)

دوسرا خط

مکرم دوست! آپ کا خط مجھے اسوقت موصول ہوا جبکہ میں پیرا کے ایک زرنگار ہوٹل میں اپنے احباب کی دلچسپ گفتگو میں شریک تھا، میں نے خط پڑھا اور پھر پڑھا اور بار بار پڑھا جس میں آپ نے مجھے اپنی شادی کا مژدہ سنایا ہے مجھے ایک تعجب انگیز مسرت ہوئی کہ میرے دوست نے اپنی غلطی کا احساس کر لیا گو یہ احساس کسی قدر تاخیر سے ہوا، اب آپ ایک مکمل انسان بن گئے، یعنی تکمیل انسانیت کے لئے عورت و مرد کی شخصیتوں کی باہمی امتزاج اور رفاقت کی ضرورت ہے اور آپ نے اس ضرورت کو پورا کر لیا، اور اب آپ ناکامی مایوسی، بے امنی کے خارزار سے نکل کر امن،

مسرت، محبت، قدردانی کے اس سرسبز گلزار میں پہونچ گئے جہاں آپ اپنی زندگی کے حقیقی لطف سے لذت اندوز ہوں گے، بلکہ لذت اندوز ہو رہے ہیں کیونکہ آپ کے خط کے ایک لفظ میں شادمانی کی روح ہے، اوس کی شاداب عبارت آپ کی شگفتگی طبیعت کی جاسوسی کر رہی ہے اب آپ ہیبت اور بربریت کی اُس تنگنائے سے جہاں ہیبب اور خطرناک اسباب تھے نکل کر ایسے فردوس میں پہونچ گئے جو روحانی مسرتوں اور حقیقی شادمانیوں کا مرکز ہے۔ اب آپ نے اپنی زندگی کو حاصل کرلیا مجھے یہ پڑھ کر مسرت ہوئی کہ آپ کی رفیق زندگی نے ،،انکار شادی،، کا جو معاہدہ اپنی ایک زندہ دل سہیلی سے دریائے نیل کے کنارے پر کیا تھا اور مشرقیت کی بہترین روح کو اوس دریا میں غرق کر دیا تھا۔ آج وہ معاہدہ ایک ”پرزۂ کاغذ“ سے زیادہ حقیر ہو گیا۔ مغربی تہذیب نے جو فضاعیان اون کے صاف و شفاف قلب پر کی تھیں وہ مشرقی روحانیت نے نقش باطل ثابت کردیں اور حقیقت میں آپ سے زیادہ مبارکباد اور اگر سچ پوچھتے ہو تو قابل صد ہزار تحسین و تبریک آپ کی محترم خاتون ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کا ثبوت اور اپنے وطن اور اپنے مذہب کی عزت کو قائم رکھا اور گو اُن کی توبہ شکنی سے اُن کی ایک فاضل سہیلی کو سخت افسوس ہوا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اسی توبہ شکنی میں ابدی راحت کا راز پنہاں ہے ؎

ٹوٹی ہے توبہ آج کسی مے پرست کی ۔۔۔ بجتی ہے گھر میں فتح کے نوبت شکست کی

میں سمجھتا ہوں کہ مغربی تہذیب کے دست کرم نے آج مشرقی خواتین کو بھی اوس بزم ناز میں لا بٹھایا جہاں مادیت کی شمعیں ہر طرف روشن ہیں اور جہاں زندگی کا ہر لحظہ مصنوعی ملمع کاریوں میں گذرتا ہے مغربی عورت اپنے حدود نسائیت سے گذر کر اوس ہیبت ناک غار میں گرنے کے لئے تیار ہو گئی ہے جو اسی غیر مآل اندیشیوں کی ظلمات میں پوشیدہ ہے، اوس نے اپنے جنس کی سخت توہین اور تذلیل کی ہے اوس نے اپنے نوع کو تبدیل کرنے کی ناکامیاب کوشش کی، اور دیکھا جاتا ہے کہ اُن اثرات نے مشرق کو بھی اپنے ساتھ شامل کرنے کی جدوجہد شروع کی ہے لیکن میں خوش ہوں کہ آپ کی اہلیہ مکرمہ جو مغربی لٹریچر سے بخوبی واقف ہیں وہ پہلی خاتون ہیں جنھوں نے اس عزت کو برباد ہونے سے بچالیا۔ اور اگر یہی خیال بکثرت اشاعت پذیر ہو گیا تو آپ دیکھیں گے کہ یورپ کی مجالس تہذیب میں ایک دن صفِ ماتم بچھی نظر آئے گی۔

عورت و مرد اپنے باہمی تعلقات کے لئے فطرتاً مجبور ہیں، اور یہی مجبوری ہے جس نے قبل اس کے کہ تمدن اور تہذیب کی بنیاد دنیا میں قایم ہو، اُن تعلقات کو قائم کر دیا۔ ایسے حصۂ زمین کو فی الحال چھوڑ دیجئے جہاں تمدن اور تہذیب کے سورج کی کمزور سی کمزور شعاع بھی پرتو فگن ہے۔ اُن طبقات حارہ اور باردہ پر نظر دوڑائیے۔ جواب تک

ہماری آپ کی تہذیب سے محروم ہیں اور جہاں ہماری آپ کی خود غرضی، دغا بازی، حیل سازی، کذب، بطلان کا شائبہ تک نہیں ہے، جن کی زندگی ابھی معصومانہ فضا میں ہے جن کی آبادی سادگی کی اصلی حالت پر ہے، وہاں بھی عورت و مرد ایک دوسرے کے شریک اور باہمی رفیق زندگی ہیں۔ شادی یا ایک عورت کے لئے ایک مرد اور ایک مرد کے لئے ایک عورت کا ہونا وہاں بھی پایا جاتا ہے۔ اکثر جانوروں تک میں یہ احساس موجود ہے کہ وہ اپنے لئے ایک ایک رفیق زندگی تلاش کریں اور اوس کے ساتھ اپنی عمر گزار دیں، بہرحال عورت کے باہمی تعلقات ضرور ہوں گے اور جب تک اس کرۂ ارض پر انسان کا آخری قدم بھی ہے اُن تعلقات کا رہنا یقینی ہے لیکن اکثر نوجوان دل و دماغ میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ شادی مرد کی "احمقانہ شجاعت" اور عورت کی ایک پوشیدہ چال ہے، اوس کی بنیاد حماقت اور خود غرضی پر ہے لیکن اگر آج اس حماقت کو بے نقاب کر دیا جائے اور عورت کی اس پوشیدہ چال کو پہچان جائے تو آپ دیکھیں گے کہ تمدن انسانی میں ایک ایسا زلزلہ پیدا ہو جائے گا جو ایک دن اس کی عمارت کو ڈھا دے گا۔ وہ زمانہ کس قدر مضحکہ انگیز نہ ہو گا جب کہ عورتوں کی تمام جنس مردوں سے بے نیاز ہو کر اپنی ایک دنیا الگ[1] قائم کر لے گی، جہاں اون کی "پوشیدہ چال" کا نام و نشان نہ ہو گا۔ اور مردوں کی کُل نوع عورتوں کی شرکت سے الگ ہو کر اپنی زندگی بسر کریں گے جہاں اون کی "احمقانہ شجاعت" بالکل بے اثر رہے گی، اوس وقت نظام کائنات اور انسانی آبادی اور اون کی تعداد پر موت کی نیند مسلط ہو جائے گی اور یہ دُنیا کے فنا ہونے کا ایک آخری نظارہ ہو گا۔

لیکن آپ ہنسیں گے کہ یہ خیالات میرے ہی دماغ کے افکار مخصوص ہیں جو عورتیں کہ شادی کی مخالف ہیں اور جو مرد کہ اس سے انکار کرتے ہیں اُن کو ان حالات سے کوئی تعلق نہیں نہ اُن کا مدعا یہ ہے کہ عورت و مرد حالت تجرد میں زندگی گزاریں بلکہ اون کا مقصد یہ ہے کہ قدرت کی اُن حسین اور نازک بدن تیلیوں کو صرف ایک ہی پھول پر قناعت نہ کرنا چاہئے بلکہ دنیا کی فردوس میں ہر پھول اون کے واسطے اپنی آغوش تمنا کو کھلا رکھے اور یہی حالت مردوں کی ہو۔

[1] امریکہ میں عورتوں نے اپنی ایک نو آبادی الگ قائم کی ہے جہاں مرد کا وجود تو درکنار اوس کا نام تک نہیں لیا جاتا تھا۔ کوئی نر جانور نہیں رکھا جاتا تھا تمام انتظام حکومت اور متعلقات حکومت عورتوں ہی کے ہاتھ میں تھے مگر دو ایک برس کے بعد یہ احساس پیدا ہوا کہ مرد کی ضرورت فطرتاً ہے اور بغیر اوسکے قدم بقدم ہمیشت لزوم کے انسانی فردوس دوزخ سے بدتر ہے، مجبور ہو کر چند مردوں کو وہاں آنے کی تکلیف دی گئی مگر اس شرط کے ساتھ کہ سوائے عورت کے اور انتظام حکومت اور کاروبار ریاست میں ہاتھ نہ لگائیں اور نہ دخل دیں ۱۲۔

خط بہت طویل ہوگیا اور آپ میری فضول تحریر کا غالباً مضحکہ اوڑائیں گے لیکن اس سے میری غرض ہے کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو اپنی اہلیہ معززمہ کی خدمت میں میرے خط کا یہ حصہ یا اوس کا اقتباس پیش کردیں میں اون کی عزت کرتا ہوں آپ کے ساتھ شادی کرنی نہیں بلکہ اس معاہدہ کے شکست کی اون کو خلوص قلب سے مبارک باد دیتا ہوں میں اون پر ظاہر کرنا نہیں چاہتا ہوں کہ یہ ابدی راحت ہے اپنے معاہدہ کی شکست سے نظام کائنات کی شکست کو بچالیا۔ اون کو معلوم ہوگا کہ اون کی زندگی اب شروع ہوئی ہے۔ مسرت کے اثرات اب اون کے دل و دماغ کو شاداب اور شگفتہ رکہیں گے۔ وہ دیکھیں گی کہ محبت اپنے حقیقی معنوں میں اون کا کیسا شاندار خیر مقدم کررہی ہے عشق کی جلوہ آرائیاں اون کے لئے اب کس قدر پُرکیف خمار آگین ہوں گی۔ اور آپ بھی معلوم کرینگے کہ دنیا میں امداد باہمی کا پہلا اصول اور اتحاد باہمی کا پہلا رکن یہی ہے، آپ نے اپنی اور اپنی بی بی کی دنیا کو روشن کردیا اور اپنے دل و دماغ پر قابو پالیا جو اب آپ کے لئے محبت اور خلوص کے خزانے پیش کرے گا اور آپ کی زندگی کو ہمیشہ تازہ اور سرسبز رکھے گا۔

اس خط کے ساتھ جو ہدایات پیش کئے جاتے ہیں اگرچہ وہ اس قابل نہیں ہے کہ آپ اور آپ کی اہلیہ محترمہ کی نظروں میں کوئی وقیع جگہ حاصل کرسکیں لیکن جب میرا خلوص قلب اور میری نیازمندی اس میں شامل کردی جائے تو میں یقین کرتا ہوں کہ آپ ان کو قبول فرماکر مجھے ممنون اور مسرور فرمائیں گے۔

قیصر از بھوپال

رُباعیاتِ امجد

(جناب سید احمد حسین صاحب امجد)

(بیکسی)

غم دیدہ پہ کون رحم فرماتا ہے ،
اس تن کے سیہ خانے میں کون آتا ہے
لے دیکے بس اک دم ہے ہمدم اپنا
وہ بھی کبھی آتا ہے، کبھی جاتا ہے

(اعتبار حال)

آثار سے ظاہر ہے کہ میں بندہ ہوں
سر تا بقدم حدوث کا پُتلا ہوں ،
کیا تھا کیا ہونگا، اس سے کیا حاصل
مجھکو تو یہ دیکھنا ہے میں اب کیا ہوں

امجد

تسلیم و رضا

(سر رابندرناتھ ٹیگور کی ایک نظم کا ترجمہ)

طالب: شکوہ نہ کیا میں نے اے یار کبھی تجھ سے		لے لیتا ہوں ملتا ہے جو کچھ بخوشی تجھ سے
میں حرص سے مستغنی بندہ ہوں قناعت کا		وسعت سے نہیں واقف دامن مری حاجت کا

مطلوب: اے سائل رنگیں تو اخلاق کا پتلا ہے		معلوم ہے سب مجھ کو جو کچھ ترا منشا ہے
ہے مانگ رہا مجھ سے دنیا کی ہر اک شے تو		دربار میں منعم کے اک طالب کل ہے تو

طالب: مل جائے اگر تجھ سے اک مجھ کو گلِ خنداں		آراستہ ہو جائے ایوانِ دل ویراں

مطلوب: بخشش کا اگر میری تو اتنا ہے دلدادہ		کیا خارِ مغیلاں بھی لینے کو ہے آمادہ؟

طالب: ہاں ان کو بھی میں اپنے سینہ میں جگہ دونگا		پُرلطف خلش اُن کی میں شوق سے سہ لونگا

مطلوب: اے سائل رنگیں تو۔ اخلاق کا پتلا ہے		معلوم ہے سب مجھکو جو کچھ تیرا منشا ہے
ہے مانگ رہا مجھ سے دُنیا کی ہر اک شے تو		دربار میں منعم کے اک طالب کل ہے تو

طالب: صہبائے مسرت سے پیمانۂ دل بھر دے		صرف اک نظر میرے چہرے کی طرف کر دے
صدقہ میں اِن آنکھوں کے میں دادِ وفا پاؤں		وہ موت مروں جس میں جینے کا مزا پاؤں

مطلوب: پُرلطف نگاہوں سے دنیا ہو اگر خالی		ہوں قہر بھری آنکھیں گر مائلِ پامالی

اُن کو بھی بصد ارماں لبیک کہوں گا میں — تیروں کی طرح دل میں چھبنے انہیں دونگا میں۔

معلوم ہے سب مجھکو جو کچھ ترا منشا ہے — خود منھ سے نہیں کہتا کس شے کی تمنا ہے
ہے مانگ رہا مجھ سے دنیا کی ہر اک شے تو — دربار میں منعم کے اک طالب کل ہے تو

جناب منشی لشیشر پرشاد صاحب منور لکھنوی

انقلاب

عبرت آموز ہے گل کاریٔ ایواں جہاں — جس کا ہر نقش تغیر کا پتہ دیتا ہے
حیرت افزا ہے عجب شاہدِ فطرت کا طلسم — کہ جو انسان کو مبہوت بنا دیتا ہے
خاک صحرا سے نکلتا ہے ہوا کا جھونکا — چرخ پہ ابر کا اک فرش بچھا دیتا ہے
جلوۂ برق وہ رکھتا ہے نہاں سینہ میں — موتی پیشانیٔ عالم پہ گرا دیتا ہے
صحن بستاں میں نسیم سحری کا انداز — غنچہ کو خواب پریشاں سے جگا دیتا ہے
دیدۂ مہر جہاں تاب۔ مژہ سے اپنی — پردۂ شب رُخ گیتی سے اُٹھا دیتا ہے
دورِ باطل میں جو اُٹھتا ہے کوئی شیر خدا — نعرۂ حق سے وہ دُنیا کو ہلا دیتا ہے
آہ جانسوز سے ظلمت کدۂ عالم میں — جلوۂ برق جہانتاب دکھا دیتا ہے
زلف دوراں میں وہ مشاطۂ فطرت بن کر — اک لڑی گوہر مقصد کی بڑھا دیتا ہے
اس کا ہر تار نفس بادِ تمنا بنکر — دل شگوفہ کی طرح سب کے کھلا دیتا ہے
صفحۂ دل پہ جو ہوں جور پرستی کے نقوش — صورت حرف غلط ان کو مٹا دیتا ہے

درد ملت کا جو آنکھوں سے ٹپکتا ہے لہو
رُخ گیتی پہ عجب غازہ چڑھا دیتا ہے

محمود اسرائیلی

جذبات سلیم

(از جناب وحید الدین صاحب سلیم پروفیسر جامعہ عثمانیہ)

تجھ کو نہ دیکھ سکنے پہ قرباں ہوں بینشین
تجھ کو نہ جان سکنے پہ صدقے ہوں دانشین

تیری نگاہِ شوخ کی تاثیر کیا کہوں
جسموں میں زلزلے ہیں تو روحوں میں لرزشین

چہرہ ہے زرد دیدہ و دل عشق میں ہیں خون
یاد آئیں گی یہ حسن کی رنگیں نوازشین

پامال کرکے دی مجھے رحمت سے مخلصی
ہر نقشِ پا پہ تیرے ہوں رحمت کی بارشین

تیرے جمال کا ہے نگاہوں پہ یہ اثر
تاروں پہ ناچتی ہیں ستاروں کی تابشین

کیا ڈر ہے کہ زیر و زبر کرکے دہر کو
محشر بپا کریں تری پلکوں کی جنبشین

عذرِ خطا کریں بھی تو کیوں کر خطا شعار
سانسوں میں لرزشین ہیں زبانوں میں لغزشین

پھولوں کو رنگ و بو دیا گوہر کو آب و تاب
قدرت کی ہر محل پہ نرالی ہیں بخششین

دو چار گام پر کہیں تھک کے رہ نہ جائیں
تیری طلب میں دوڑتی پھرتی ہیں کوششین

ہر حرف ایک شعلہ ہے ہر لفظ اک شرر
دل کے ورق پہ غم نے یہ کی ہیں نگارشیں

میدانِ حشر کیا کوئی دنگل ہے اے خدا
کرنی پڑیں جو مجھکو عبادت کی ورزشیں!

آگے سے ہٹ تو اے خس و خاشاکِ عقل و ہوش
پنہاں ہیں میرے دل میں محبت کی سوزشیں

کشتیٔ صبر الٹ گئی اے موجِ اضطراب
کب تک رہیں گی یہ تیرے طوفاں کی شورشیں؟

محور نہ علم کا ہوا اگر ذات ذوالجلال
بے کار ہیں عقل کے پہیوں کی گردشیں،

لپٹے ہوئے یہ سب تھے غلافِ سحاب میں
کھولی ہیں ارتقا نے ستاروں کی بندشین

کافی ہے ان کو برقِ تجلی کی اک لپک
پرواز پر ہیں اپنی ملائک کو نازشین،

لالہ کا کھیت ہے مرے دیوان کا ہر ورق
اللہ رے میرے خونِ جگر کی تراوشین

دل کے صنم کدہ میں دکھایا جو تو نے رخ
پندار کے بتوں مٹا دیں پرستشین

پھونکا ہے تیرے شوق نے کیا نغمۂ فریب
دل کی فضا میں ناچتی پھرتی ہیں خواہشین

مت کھا فریب باغِ جہاں کی بہار کا
ہیں یہ سراب رنگ کی ساری نمائشیں

آہوئے دل کو میرے نہ تو کر سکا شکار
اے شیرِ نفس دیکھ لیں اب تیری غرشیں

آنکھیں حصارِ دل کے ہیں دو در کھلے ہوئے
کیوں کر ہوں بند فوجِ تمنا کی یورشیں

میری نظر میں ہیچ ہے عالم کا التفات
بل بے تری نگاہِ تغافل کی پرسشیں

کویل سے

طائر زیبا ہے تو بے شک لے میری دلربا
خیر مقدم دل سے اے کویل ترا کرتا ہوں میں

آم کی ڈالی پہ جب ہوتی ہے تو نغمہ سرا
کان ہر دم خوشنوائی پر تری دھرتا ہوں میں

نیلگوں نہرِ رواں کے اُس کنارے جس گھڑی
چھائی ہوتی ہے فضا میں ایک پُر غم خامشی

میں فقط ہوتا ہوں تنہا محوِ سیرِ بوستاں
فرش سبزہ پر میں جا کر لیٹ جاتا ہوں وہاں

توڑتی ہیں قفلِ خاموشی کو آوازیں تری
آہ اے فرقت زدہ تو درد و غم سے ہے بھری

قالبِ بیجاں میں گویا میرے پڑ جاتی ہے جاں
ایسی تنہائی میں ہے تو ہمنوائے عاشقاں

تری کُو کُو نالہ ہائے عاشقِ دلگیر ہیں
آہ یہ نالے ترے ہر بار پُر تاثیر ہیں

تیرے نغموں سے کلیجہ مُنہ کو آتا ہے کھنچا
کیوں ہے اس آواز میں سوز و گداز اتنا بھلا

گونجتے ہیں تیری آوازوں سے دشت و کوہسار
جھنڈ میں آموں کے جب آ بیٹھتی ہے بار بار

چھوڑ جاتی ہے ہوا میں تو اشاراتِ غنا
کیا ہی وہ دلچسپ ہوتا ہے سماں لے دلربا

ہاں یوں ہی کُو کُو کئے جا طائرِ شیوا بیان
کیوں نہ اختر مدح پیرا ہو ترا جانِ جہاں

مرحبا اے مرغِ خوش الحانِ ایامِ بہار!
لے کے آئی ہے تو اپنے ساتھ پیغامِ بہار

(اختر جوناگڑھی)

اخبارِ علمیہ

عربی شعر کی قدامت

بلادِ یمن کے پُرانے کھنڈروں میں سے کسی ایک کھنڈر میں ایک عربی قصیدہ دستیاب ہوا ہے جو عادی خط میں منقوش ہے۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ یہ قصیدہ تقریباً ایک ہزار برس قبل مسیح کندہ ہوا ہے۔

وحدتِ لسانی وطن سامی میں

۱۸۸۹ء میں تل العمارنہ میں مابین منیا و اسیوط جو اثوری کتبات پائے گئے ہیں ان کو پڑھ کر پروفیسر سالیس نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مصر سے بنی اسرائیل کے خروج سے پہلے، مصر، شام اور عراق کے علماء اور اہل سیاست کی زبان اثوری تھی۔ گویا ازمنۂ قدیمہ میں تمام سامیوں کی ایک ہی زبان تھی۔

ایک عظیم الشان فلکی دوربین

اجرامِ سماوی کے معاینہ کے لئے دنیا کا سب سے زیادہ عظیم الشان اور قوی دوربین وہ ہے جو بمقام وکٹوریہ (برٹش کولمبیا) قائم کیا گیا ہے۔ اس کا وزن ۵۵ ٹن ہے آج تک انسانی آنکھوں سے تقریباً ۸۰۰۰ ستارے دیکھے جا چکے ہیں۔ مگر اس جدید دوربین کے ذریعہ تیس کروڑ ستارے معلوم ہو چکے ہیں۔ اس دوربین کی نلکی اتنی بڑی ہے کہ اس میں سے ایک موٹر باسانی گزر سکتا ہے۔ اس قدر عظیم الشان ہونے کے باوجود اس کے بالائی حصہ پر صرف ۵ پونڈ کا وزن اس کو متحرک کر دیتا ہے۔

اس کا شیشہ دنیا کے تمام دوربینوں سے بڑا ہے جس کا قطر چھ فٹ ہے۔ اور اس کے کنارے بارہ انچ موٹے ہیں۔ اس شیشہ کو صاف و شفاف بنانے اور اس کے مرکز میں ساڑھے دس انچ کا سوراخ کرنے میں کئی ماہ صرف ہوگئے ہیں۔ اس شیشہ کا وزن ۲ ٹن ہے۔

امریکہ میں موٹروں کی لاگت

ریاست ہائے متحدہ کے محکمہ صنعت وحرفت کے موٹروں کی صنعت سے متعلق جو اعداد فراہم کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ میں دو کرور موٹروں کی تیاری پر ڈیڑھ ارب اسی کرور پونڈ سالانہ لاگت آتی ہے۔ امریکہ والوں کا یہ دعویٰ ہے کہ یہ روپیہ بیجا نہیں صرف ہوتا کیونکہ ملک کا بڑھا ہوا تجارتی کاروبار، دولت وثروت اور اسباب کی خریداری انہیں موٹروں کی بدولت ہے کہ انہی کے ذریعہ اسباب کے فوری حمل ونقل میں بڑی سہولت ہے۔

دنیا کا قدیم ترین درختِ گلاب

ہلڈشیم (جرمنی) میں ایک درخت ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا کا قدیم ترین گلاب کا پیڑ ہے جو کلیسائے پیرلش کے تمام مشرقی رخ پر چھایا ہوا ہے۔ کلیسائے مذکور کے دفتر میں ایک ہزار برس پہلے سے اسکی نشو ونما اور حفاظت کے طریقوں سے متعلق حوالے پائے جاتے ہیں۔ اس درخت کی جڑیں کلیسائے مذکور کے نیچے کے مقبرہ تک نظر آتی ہیں۔

طاعون میں حفظ ماتقدم

ازمنۂ قدیمہ میں لہسن کو جو غالباً مشرق سے ممالک مغربیہ میں پہونچا ہے، کئی امراض میں بطور علاج استعمال کیا جاتا تھا۔ جالینوس اس کو دیہات والوں کا علاج کہتا ہے۔ حکیم براکلوس (مصنف اسباغرایا) طاعون سے محفوظ رہنے کے لئے اس کو بہترین علاج بتایا ہے۔ ایک اور نامور طبیب لہسن کو ناشتہ میں استعمال کرنے کی ہدایت دیہات والوں کو کرتا ہے کہ اگر وہ لہسن کی چند ڈلیاں روٹی اور مسکہ کے ساتھ استعمال کریں تو وہ تمام کام کرنیکے قابل ہوسکیں گے جن کے لئے قدرت نے ان کو وضع کیا ہے۔

کاٹھیاواڑ کے اکثر شہروں اور دیہات میں ہر سال موسم سرما میں لہسن کو مختلف غذاؤں کے ساتھ کھانے کا طریقہ مروج ہے۔

دریائی گھونگھوں سے ریشم

برلن (جرمنی) کے دو مشہور ماہران سائنس ڈاکٹر پی او - ہرزوگ اور ڈاکٹر جی، کے ناٹنگ کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے سبز و سُرخ ٹڈّوں، زنبوروں اور دریائی گھونگھوں کے سروں اور پنجوں سے مصنوعی ریشم تیار کیا ہے۔ ان حشرات الارض میں ایک طرح کا لیسدار مادہ ہوتا ہے جس کو "جِترن" ( ) کہتے ہیں اس کو باریک سوراخوں والے آلات میں سے نکال کر اس کی ڈوریاں بنائی جاتی ہیں۔ یہ ڈوری نہایت باریک اور اس کی بناوٹ اس قدر مضبوط ہوتی ہے کہ اس سے کپڑا بھی بنا جا سکتا ہے۔

تصحیح

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲	۲	طلب منفعت	جَلبُ منفعت	۱۱	۱۹	معزول	معتزلی
۳	۸	سنہ ۷۱ھ	سنہ ۷۱۸ھ	۱۳	۲	علم الجر	علم الجبر
۳	۹	سنہ ۷۸ھ	سنہ ۷۸۸ھ	۱۳	نوٹ	حر بن یقظان	حی بن یقظان
۸	۱۱و۱۴	زائد ہیں قومیں نہ ہونی چاہئیں		۲۴	۲	ہر وقت	ہر وہ
۹	۲	قرون اول	قرن اول	۲۶	۱۰	اس قدم کا نقش قدم	اس قسم کا نقش قدم
۱۰	۱	کری	کسریٰ	۲۸	۸	مگر ہمیں	مگر اس میں
۱۰	۱۰	اکابرہ	اکاسرہ	۳	۱۴	تومیں ہیں جہانیاں جہانگشت کی بجائے	
۱۰	۱۶	عیسیٰ	عیسائیون			خلیفہ جہانیاں جہاں گشت	
۱۱	۱۶	موسیو روزی	موسیو دوزی	۳۸	۱۰	بجائے سیٹج پر کے اسٹیج پہ	

۷۸۶
یا قادر

غزلیات

(جناب محمد شفیع صاحب شفیعؔ اکبر آبادی)

آج برہم قلب کی آواز ہے
کیا یہ آوازِ شکستِ ساز ہے

بے سکون وہ محوِ خوابِ ناز ہے
میرا نالہ دور کی آواز ہے

مطربِ نالحق تری آواز ہے
تو سراپا اک نوائے ساز ہے

مائلِ پرواز پہلے تھا خیال
اب قفس خود مائلِ پرواز ہے

قابلِ عزّت سہی دیر و حرم
تیری بزمِ ناز بزمِ ناز ہے

یوں سمجھئے وحدت و کثرت کا راز
ہیں صدائیں مختلف اِک ساز ہے

کر نہ ظاہر میرا رازِ عاشقی
تو بھی تو آخر کسی کا راز ہے

دل کی دھڑکن سے جب آتی ہے صدا
میں سمجھتا ہوں تری آواز ہے

اک ادا ہے یہ تغافل بھی ترا
بے نیازی بھی تری اک ناز ہے

سحر ہیں پیکر میں دو آنکھیں تری
اور باقی ہے جو کچھ، اعجاز ہے

تو نہیں، اک راز ہے تخلیق کا
دل نہیں، پردہ سرائے راز ہے

میرے سجدوں کا نہیں ملتا مزاج
عرش ہے یا آستانِ ناز ہے

آہ سناٹا ہے پچھلی رات کا
یا کسی مایوس کی آواز ہے

کیا حقیقت منکشف ہو راز کی
اب حقیقت خود اسیرِ راز ہے

میرے دل پر داغ ہے حوالے شفیعؔ
تازہ تصنیف نگاہِ ناز ہے

(عبدالرحمٰن خوشتر منگرولی اڈیڈیٹر رسالہ ہذا)

کہا میں نے تو پھر اس کا مزا کیا — تمہیں کہدو ہے میرا مدعا کیا
کہیں کیا جب وہ ہم پر مہرباں تھا — اُٹھائے زندگی کے لطف کیا کیا
ستاؤ مجھ کو جی بھر ستاؤ — نہ نکلے حوصلہ وہ حوصلہ کیا
تمہارا اک نظر بس دیکھ لینا — تمنا دل کی ہے اس کے سوا کیا
کہانی خواب کی تھی زندگانی — کہیں کیا آہ دیکھا کیا سنا کیا
ہے کیا کہنا نظر جس پر ہو تیری — تو پُوچھے جس کو اُس کا پوچھنا کیا
ستاتے ہی رہے ہم قصۂ غم — وہ کہتے ہی رہے ہر بار کیا کیا؟
تمہیں ہم پیار سے گر دیکھتے ہیں — برائی اس میں ہے آخر بھلا کیا
میری عرض تمنا سن کے اُس نے — کہا جھنجلا کے پھر کہئے کہا کیا؟
کیا گر ہم نے وصف زلف پیچاں — بگاڑا بندہ پرور آپ کا کیا؟
کہیں کیا عہد برنائی کی باتیں — نہیں معلوم وہ تھا خواب یا کیا
مجھے اُلفت ہے اُن سے اُن کو نفرت — نہیں کھلتا ہے آخر ماجرا کیا
کوئی اُس بت پہ دے کر جان دیکھے — فنا کیا چیز ہے اور ہے بقا کیا
شب تنہائی تو کھیل کھیلئے کچھ — ہٹاؤ پردہ ہے شرم و حیا کیا
ہے عالم سوز کیوں ہر سمت منظر — فغاں کرتا ہے کوئی دل جلا کیا
تمنا ہے۔ نہ پوری ہو تمنا، — ہو پورا مدعا وہ مدعا کیا

جگر میں ٹیس کیوں اُٹھتی ہے خوشتر
کوئی بھولا ہوا یاد آگیا کیا

زبان

جلد ۱ — فہرست مضامین ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء — نمبر ۴

زبان خلق

مشفقم جناب عبدالرحمن صاحب - السلام علیکم

آپ کا رسالہ زبان اور لفافہ ملے میں آپ کا بہت مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے یاد فرمایا مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے رسالہ زبان کی علمی مدد نہیں کرسکتا کیونکہ میں یکم ستمبر کو ولایت جارہا ہوں، بہرحال آپ کے رسالہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اس کی تیاری میں کافی محنت سے کام لیا ہے اور امید ہے کہ ذرا سی کوشش سے رسالہ ہندوستان کے اچھے ادبی رسالوں میں شمار ہونے لگے گا۔

موجودہ نمونہ یہ توقع دلاتا ہے کہ بہت جلد آپ نہایت اعلیٰ درجہ کا رسالہ پبلک کے سامنے پیش کرینگے

راقم خاکسار

محمد ناظم (پروفیسر سٹری مسلم یونیورسٹی علیگڈھ) از بمبئی

مکرم بندہ زاد لطفکم - السلام علیکم و رحمۃ اللہ

ماشاء اللہ بارک اللہ، بہت خوب رسالہ نکالا مگر افسوس کا ٹھیاواڑ بہت نا اہل ہے اگر حضرت شیخ صاحب (نواب شیخ محمد جہانگیر میاں صاحب بالقابہ) یا ولیعہد صاحب (بہادر) کی امداد شامل حال رہی تو انشاء اللہ رسالہ چلے گا محض خریداروں کے بھروسے پر یہ ضروری کام نہیں چل سکتا ......

عنوان کا بیت یوں چاہیے۔

لقد وجدت مکان القول ذا سعتہ   فان وجدت لسانا قائلاً فقل

اور یہ کہ یہ بیت متنبی کا ہے نہ کہ اعشیٰ کا،

صفحہ ادارت پڑھکر بہت خجل ہوا میں ہرگز اتنا کام کا نہ تھا جتنا کہ آپنے جذبہ ہموطنی سے متاثر ہو کر ظاہر کیا ہے، بہرکیف آپکے حسن ظن کا مرہون احسان ہوں اور آپ کو اپنے بلند اور نیک ارادوں میں کامیابی بخشنے میں بہت غیر مطمئن ہوں انشاء اللہ اکتوبر کے آخر تک شاید کوئی قلمی خدمت کرسکوں امید کہ آپ میرے ہجوم اشغال پر نظر کرکے معذور تصور فرمائیں گے۔ (مولینا) میمن عبدالعزیز (پروفیسر مسلم یونیورسٹی علیگڈھ) از راجکوٹ

نکات

(از ضیا ءالملک ملا رموزی جرنلسٹ فاضل الہیات)

کہتے ہیں کہ آجکل جو شخص "پائنیر" انگلش مین، اور بمبئی ٹائمز - پڑھ سکے، دوستوں کو بجائے اردو زبان کے انگریزی میں "مائی ڈیر" لکھہ سکے، اور اردو زبان میں آدھی سے زیادہ انگریزی ملا کر گفتگو کر سکے - وہ "تعلیم یافتہ" باقی تمام علوم اور زبانیں جاننے والے - ابوجہل

اب سوال یہ ہے کہ اچھا اگر "تعلیم یافتہ" سے مراد صرف انگریزی دانی ہے تو ذرا ان انگریزی خوانوں اور دانوں کی عقل و فراست کا اندازہ کر لیجئے پتہ چل جائیگا کہ یہ ان کی "تعلیم یافتگی" کہاں تک "تعلیم یافتہ" بنانے کی صلاحیت رکھتی ہے ؟

مان لیجئے کہ عقل و فراست آج کل کے - اسکولوں - کالجوں - اور یونیورسٹیوں سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ یہ تاثیر تو کچھ، دیوبندی وضع کے - حجروں - مکتبوں - مدرسوں اور مسجدوں کی چٹائیوں پر بیٹھ کر اور - ہل ہل کر پڑھنے - فارسی، عربی اور دینی علوم کی تحصیل ہی سے پیدا ہوتی ہے، اس فقرے سے پیشانی پر بل ڈالکر نتھنے تو پھلائیے نہیں بلکہ سیدہی طرح سن لیجئے کہ اگر عقل و تعلیم - کا مقصد یہی ہے کہ آپ اپنی تمام قومی و مادری خصوصیات کو ترک کر کے دوسری قوموں کی خصوصیات کو اختیار کر لیں، اور اپنی آبائی تہذیب و طرز معاشرت کی ہنسی اڑائیں تو یہ آپ کے "تعلیم یافتہ" ہونے کا کوئی قابل تعریف ڈپلوما نہیں - بلکہ آپ کے "نرے کندہ نا . . . ." ہونے کی عدالتی سند ہے،

ہم نے تو آپ کو اسکولوں - کالجوں، اور، یونیورسٹیوں میں اس لئے بھیجا تھا کہ آپ کے دماغ علوم جدیدہ کی عالم آرا روشنی سے منور ہوں گے، اور اس روشنی کے صدقہ میں آپ "اصلاح و تخریب" کے فرق کو محسوس فرما کر ہم "دقیانوسی کسانوں" کی اصلاح فرمائیں گے، ہماری زبان کو ترقی دیں گے - ہمارے لباس سے محبت کرینگے، ہماری رسم و رواج کو عروج دیں گے - ہمارے مذہب کی خدمت و حفاظت کریں گے، کیونکہ یہی اور صرف یہی وہ چار خصوصیتیں اور علامتیں ہیں قوموں کی جن کے بقا و عروج سے قوم - قوم کہلاتی ہے، لیکن ہمنے تو یہ دیکھا

کہ جب آپ کالجوں اور یونیورسٹیوں سے "تعلیم یافتہ" ہوکر نکلے تو ہمارے وہ "ننھے میاں"، اور "ننھے میاں" ہی نہ رہے جو کالج جاتے وقت تھے، بلکہ جب آئے تو خاصے آئرلینڈ کے لاٹ پادری کا وہ خول پہنے آئے جس کے اندر نہ آپ کی۔ قومی زبان نظر آئی نہ آپ کا لباس، نہ آپ کا رسم و رواج دیکھا نہ مذہب کی توقیر و پابندی۔ پھر تعلیم یافتہ ہوکر اپنی قومی و مادری زبان۔ لباس۔ رسم و رواج کو ترک کر دینے والا بھی۔ تعلیم یافتہ۔ کہلائے جانے کا مستحق ہے؟ یا "انگریزی یافتہ"؟

اسکولوں۔ کالجوں۔ اور۔ یونیورسٹیوں۔ سے ہر سال نونہالانِ قوم کی جو کثیر تعداد "فارغ التحصیل" یا "تعلیم یافتہ" ہوکر نکلتی ہے اُس میں کتنے ہوتے ہیں جو "بین الاقوامی مسائل" کے مصلح اور عقدہ کشا ہوتے ہیں کتنے ہوتے ہیں جو ملازمانی جہنم میں جھونک دیئے جاتے ہیں اور انسانیت کے جملہ فرائض کو بھول جاتے ہیں کتنے ہوتے ہیں جو غریب اور بے کس مسلمانوں کی اخلاقی، اجتماعی، دینی۔ اور ذہنی۔ اصلاح و ترقی پر اپنے۔ دماغ۔ وقت۔ اور۔ دولت کو صرف کرتے ہیں؟ کتنے ہوتے ہیں جو ناموس امت یعنی بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی اعانت و سرپرستی فرماتے ہیں؟

یہ وہ سوالات ہیں جو کالجوں کے ہر برخود غلط "تعلیم یافتہ" سے کئے جانے کے قابل ہیں لیکن اگر آج یہ سوالات ہمارے انگریزی یافتہ طبقہ سے کر دیجئے تو جو جوابات ملیں گے وہ یہ ہوں گے؛

کالج سے نکل کر۔ ملازمت کرتے ہیں، بے کس اور مجبور مسلمانوں پر اکڑ کر حکومت کرتے ہیں تنکا رکھیلتے ہیں، موٹر خریدتے ہیں ٹینس، کرکٹ۔ اور ہاکی کھیلتے ہیں سی۔ آئی۔ ڈی۔ بنکر اپنے قومی بھائیوں کو بڑے گھر۔ پہونچاتے ہیں، کوتوال اور سب انسپکٹر بنکر شریفوں کی عزت لیتے ہیں قومی لباس و زبان کو نفرت و ذلت سے دیکھتے ہیں۔ کہئے کیا بُرا کرتے ہیں؟؟؟

خیال تھا کہ صحبت کا اثر لازمی ہوا کرتا ہے جو بچہ درجہ الف سے۔ ایم۔ اے ایل۔ ایل۔ بی تک خالص علمی ماحول اور درس گاہ میں بہاڑ جھونکتا رہے اُس کے اندر علمی مذاق پیدا ہی نہیں بلکہ طبع ثانی ہوکر رہے گا، لیکن ہمارے موجودہ "انگریزی یافتہ" حضرات میں جس قسم کا "علمی مذاق" پیدا ہوتا ہے اُس کا نمونہ یہ ہے کہ فیشن ایبل

مکان کے ایک نظر فریب کمرے میں قیمتی الماریوں کے اندر انگریزی کی بے شمار کتابیں رکھی جاتی ہیں کیونکہ آجکل کتابوں سے آراستہ الماریاں - اور، کوئی رنگین جانماز کمرہ میں رکھنا داخل فرنیچر ہے، لیکن کوئی پوچھے کہ کیوں حضور ان ملٹن اور شکسپیئر کی مطلا و مذہب کتابوں میں غریب مادری زبان اردو کی کتنی قدیم و جدید کتابیں ہیں؟ تو بجائے معقول جواب کے انسلسٹ کہہ کر بگڑ جائیں گے! پھر مصیبت پر مصیبت یہ ہے کہ ایسے ہی ڈپٹی کلکٹرانہ زندگی والی آخر عمر میں قوم کے لیڈر ہی نہیں بلکہ "مولانا" بھی ہو جاتے ہیں، اب یہ تعلیم یافتہ ہونے کا ثبوت ہے یا "گھوڑ دوڑ" کا؟

کالجوں اور سکولوں میں - اردو املا، لکھنے کی جگہ املا اور دینیات کے گھنٹہ میں - پانی پینے کے بہانے سے بھاگ جانے کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ ہماری روزمرہ گفتگو میں آدھی سے زیادہ انگریزی داخل ہو رہی ہے، ہم اردو خطوط میں بجائے مشفقی و مکرمی - لکھنے کے - مائی ڈیر - اور ڈیر سر - لکھنے کے عادی ہو رہے ہیں اور آج نول کشور پریس کی وہ "انشائے مادہورائے" کوئی چھدام میں نہیں خریدتا جس میں مشرقی آداب والقاب لکھے گئے تھے، ہمیں اردو اخبارات اور رسالوں سے محبت کی جگہ نفرت ہے، ان حالات کا اثر یہ ہے کہ ہماری ملکی و مادری زبان اردو کا خاصہ شلغہ ہو رہا ہے اور ہم اس "انگریزیت" پر خوش ہی نہیں بلکہ مغرور بھی ہیں، یہ ہے غلام دماغی کی اس آب و ہوا کا نتیجہ جس میں ہم روزانہ بلا مپپ کے سانس لیتے ہیں -

---

جمعیۃ الاقوام واقع جنیوا سوئزرلینڈ میں دوسری حکومتوں کی طرح مملکت ہند زیر سایہ برطانیہ کیطرف سے ہر سال ایک عدد نمایندہ جایا کرتا ہے، پچھلے سال لالہ لاجپت رائے جو ہندوستان میں ہندی زبان کو ملک کی مشترکہ زبان بنانے کے حامی اور اردو زبان کے نیم ادیب ہیں اس مجلس میں فرد وران ہند کے نمایندہ بنکر گئے تو مجلس کے تمام شرقی و غربی نمایندوں نے دیکھا کہ لالہ جی اپنے ملک کا بنا ہوا کپڑا کھدر ڈانٹے ہوئے ہیں، لیکن جب آپ نے تقریر شروع کی تو وہ ان کی ملکی و مادری زبان میں نہیں تھی بلکہ - انگریزوں کی زبان تھی، اب پچھلے ستمبر میں پنجاب کے مایۂ ناز فرزند اور اردو زبان کے دیرینہ سرپرست خان بہادر شیخ عبد القادر بیرسٹر ایٹ لا سابق ایڈیٹر مخزن و وزیر تعلیمات جو اس مجلس میں گئے تو امید پیدا ہوئی کہ آپ کسی طرح بھی لالہ جی کی پیمٹری - اختیار نہ کریں گے اور اپنی پیاری مادری زبان ہی کو استعمال کریں گے؟ لیکن اغلب یہ ہے کہ جمعیۃ الاقوام

کے۔ لال منہ نمایندوں سے شیخ مرعوب ہو کر انگریزی ہی بول اُٹھیں گے، یہی حال ہمارے رہنمائے اعظم حاجی محمد علی و شوکت علی صاحب کا۔ موتمر مکہ۔ میں تھا کہ آپ نے موتمر میں بجائے اردو کے انگریزی زبان میں تقریریں فرما ڈالیں، اور ایک حجازی نے ان انگریزی تقریروں کا ترجمہ عربی میں کر کے موتمر میں پیش کیا، کیا اگر مولانا محمد علی اردو میں تقریر کرتے تو مولانا سید سلیمان علامہ کفایت اللہ علامہ عبدالحلیم بھوپالی اور، مولانا عرفان اس کا عربی ترجمہ موتمر میں پیش نہیں کر سکتے تھے؟ حالانکہ دُنیا کی ہر بین الاقوامی مجلس میں اس کے نمایندوں کو سرکاری زبان نہ جاننے کی صورت میں اُن کی مادری زبان میں اظہار خیال کی اسی طرح اجازت ہوتی ہے جس طرح ہندوستان کے انگریزی ہائی کورٹس میں مجرمین کو اردو، ہندی، بنگالی، اور، گجراتی۔ بولنے کی حاصل ہے، پھر ایسی صورت میں کہ ہندوستانیوں کے پاس اُن کی کوئی ملکی و مادری زبان تک نہو کیا ہم اونھیں حیوان مطلق۔ کہہ سکتے ہیں؟

---

۱۵ اگست ۱۹۲۶ء کو زیر صدارت ڈاکٹر عبداللطیف۔ ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد "اندھیرا ایجوکیشنل کانفرنس" کا اجلاس منعقد ہوا اس خالص علمی مجلس میں ڈاکٹر صاحب نے جو عالمانہ خطبہ ارشاد فرمایا وہ اپنی علمی ضوفشانیوں کے لحاظ سے ممتاز و مختص ہے اس خطبہ میں ڈاکٹر صاحب نے "اندھیرا یونیورسٹی" کے قانون پر جو بحث فرمائی اُس سے یہ معلوم ہوا کہ اندھیرا یونیورسٹی نے اپنے تمام انتہائی درجوں میں۔ اُردو زبان۔ کی تعلیم کو اس صوبہ کی دوسری زبانوں کے مقابل درجہ اور امتیاز عطا کیا ہے اور یہ قانون۔ مدراس لیجیلیٹو کونسل سے باقاعدہ پاس ہو چکا ہے اسی طرح میسور یونیورسٹی نے بھی اُردو زبان کو بطور ایک مستقل مضمون کے درجہ ایم۔ اے۔ کے امتحان کے لئے منظور کر لیا ہے اور میسور میں ایک مستقل اُردو کالج۔ کی تجویز زیر غور ہے لیکن ایک سات کروڑ مسلمانوں کی "مسلم یونیورسٹی" ہے جہاں سے اُردو کے کھنڈ میں نہ فقط طلبہ ہی بھاگ جاتے ہیں بلکہ اُس کے ہاں اُردو پروفیسر اور اُردو ریڈر زبجز تک کے پتہ نہیں راوہ سید جالب دہلوی ایڈیٹر ہمدم لکھنو، یعنی روایت کیا اسکو سید جالب دہلوی نے بہ پنج اخبار ہمدم اپنی کے۔ اب اُردو زبان کے ساتھ ہمارے بچوں سے لیکر لیڈروں نمایندوں اساتذہ تک کا جب یہ سلوک ہو تو کہنا چاہئے کہ ؎

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

صفحۂ ادارت

باوجود انتہائی سعی و کوشش کے رسالہ اپنے وقت پر نہیں نکل سکتا اس کا ہمیں سخت ملال ہے اگرچہ ہم فراہمی مضامین سے عہدہ برآ ہو کر ٹھیک وقت پر رسالہ مرتب کر کے مطبع کو بھیج دیتے ہیں پھر بھی اہل مطبع اپنی شان بے نیازی دکھائے بغیر نہیں رہتے۔

ہر چند یہ تعویق کہ ستمبر کا نمبر آخر نومبر میں شائع ہوا خریداروں کو بددل اور پریشان کرنے والا ہے لیکن ان سے زیادہ ہمیں اس امر کا احساس ہے اگرچہ مطبع کی دوری اور اہل مطبع کی بے پروائی کا علاج ہماری دسترس سے باہر ہے۔

انہی دشواریوں کو مدنظر رکھ کر اکتوبر و نومبر کا یہ مشترکہ نمبر دو چند ضخامت پر نکال کر تلافی مافات کرتے ہیں اگرچہ اُردو جرائد کا یہ عیب خصوصی عیب ہے مگر مجبوراً ایسا کرنا پڑتا ہے ساتھ ہی کوشش کریں گے (اگر پھر اہل مطبع نے شان بے نیازی سے کام نہ لیا) کہ دسمبر نمبر بھی اگر آخر دسمبر تک نہیں تو شروع جنوری تک قارئین کرام کی خدمت میں پہنچ جائے، اس طرح ممکن ہے ہم وقت کی پابندی کرسکیں ارادۃ اللہ غالب علی ارادۃ الناس۔

اگرچہ دنیائے صحافت میں ہمارا یہ پہلا قدم ہے مگر اس قلیل عرصہ میں ہمیں جن دشواریوں سے دوچار ہونا پڑا ہے اور جو جو تجربات حاصل ہوئے ہیں ان کو ملحوظ رکھ کر ہم یہ کہنے پر آمادہ ہوئے ہیں کہ دُنیا سے سچی ہمدردی اگر کلیتہً مفقود نہیں ہوئی تو نایاب ضرور ہو گئی ہے نمایشی ہمدردی اور ظاہری خیر خواہی روز بروز وسعت پذیر ہوتی جاتی ہے۔

ثبوت میں اگر ہم اپنے قیام بمبئی (ستمبر ۲۶ء) کے بعض اہم واقعات قلمبند کریں تو انسانی افعال و خصائل کا ایک عجیب و غریب دفتر اور علم النفس میں جدید مگر دلچسپ معلومات کا اضافہ ہو جائے مگر ہم ان واقعات کے اظہار سے قارئین "زبان" کی تضیع اوقات کرنا نہیں چاہتے اس لئے ان کو نظرانداز کر کے صرف اسی پر اکتفا کرتے

ہیں کہ ؎

ہم نہ سمجھے تھے یہ ظاہرداریاں
تیری باتوں نے بڑا دھوکہ دیا

بمبئی سے لگ بھگ ایک سو ایسے خریداروں کے وی۔پی واپس آئے ہیں جنھوں نے ہمیں رو برو و ویلو روانہ کرنے کی اجازت عطا فرمائی تھی، ان کی اس "ستم ظریفی" سے دفتر کو ناقابل برداشت نقصان اُٹھانا پڑا ہے لہٰذا اُن سے اگر وہ ان سطور کے دیکھنے کی زحمت گوارا فرمائیں) التماس ہے کہ اس وقت اگر کسی سبب سے آپ رسالہ کی اعانت نہیں فرما سکے تو اب از رہِ کرم مبلغ چار روپیہ ذریعہ منی آرڈر روانہ فرما کر دفتر کے اس عظیم نقصان کی تلافی کردیں۔

ہمیں گذشتہ نمبر ہی میں اُن معاونین کرام کا جنھوں نے اپنے بیش بہا عطایا رسے "زبان" کو نوازا ہے اور جنھوں نے رسالہ کی توسیع اشاعت میں ہمیں کافی مدد دی ہے شکریہ ادا کردینا چاہیئے تھا لیکن بعض ابتدائی مراحل کی انجام دہی کے سبب اب تک قاصر رہے امید کہ معاونین کرام معاف فرمائیں گے۔

معاونین کی فہرست میں تمام تر ایسے حضرات کے نام ہیں جنہیں اُردو سے بہت کم تعلق رہا ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ اُردو جانتے ہی نہیں ہیں تو حقیقت سے بعید نہ ہوگا اس کے ساتھ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ ان کے دلوں میں قومی درد اور اپنے وطنی بھائیوں (اہل کاٹھیاواڑ) کی پستی کا احساس اور ملک میں اُردو کو عام رواج دینے کا خیال بدرجہ اتم موجود ہے۔

سب سے بڑی بات جس کا ہمیں فخر یہ اظہار کرنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ ہمارے معاونین سب کے سب منگرول والے ہی ہیں اور پھر انکی مالی حالت بھی متقابلتاً منگرول اور کاٹھیاواڑ کے دیگر اپنے ہمقوم بھائیوں سے کچھ زیادہ تسکین بخش نہیں ہے۔ لیکن محض قومی ہمدردی کی بنا پر اور اس خیال سے کہ اپنے وطن سے ایک اُردو رسالہ کا اجراء عمل میں آیا ہے رسالہ کی سرپرستی ومعاونت فرماتے ہیں۔

ان میں سب سے زیادہ ہمارے شکریہ کے مستحق ہمارے مخلص دوست جناب محمد خاں گلاب خاں صاحب (منگرولی) ٹیمبر مرچنٹ سنبل پور ہیں جنھوں نے ہمارے خیال کو عملی جامہ پہنانے میں سبقت فرمائی ہے صرف ہمارے عزم اجرائے رسالہ کا سن کر فوراً ذریعۂ تار ڈیڑھ سو روپیہ روانہ فرما کر اپنی ہمدردی و علم دوستی کا ثبوت دیا اور آیندہ بھی بہت کچھ توقع دلائی ہے۔ اسی طرح مکرمی جناب میمن اسحاق محمد (منگرولی) اینڈ کمپنی ٹیمبر مرچنٹ بمبئی نے ایک سو روپیہ مرحمت فرما کر ہماری حوصلہ افزائی اور آیندہ بھی اعانت کا وعدہ فرمایا اور ہمدرد ملک و قوم جناب سید واصل میاں صاحب (منگرولی) نے بھی کھمبات سے پچاس روپے روانہ فرما کر اپنی ملکی و قومی کا ثبوت دیا ہے جن کے ہم بیحد ممنون ہیں۔

جناب اے۔ ایس۔ دلی بار ایٹ لا (بمبئی) کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ انھوں نے پچیس مرحمت فرمائے اگرچہ ہم کو آپ کے مشاغل علمی کو دیکھتے ہوئے اس سے زیادہ قدر دانی کی امید تھی۔

اس سلسلہ میں دس دس روپے کی رقم دینے والے چند قدر دانوں کے اسمار کا اظہار کر دینا بھی غالباً بیجا نہ ہوگا۔ جناب محمد میاں صاحب، نجم الدین میاں صاحب (منگرولی) جناب سید مصطفےٰ میاں جعفر میاں اور جناب سید عبداللہ میاں جعفر میاں۔

جن کاٹھیا واڑی حضرات نے باوجود متمول و مقدرت کے اب تک اپنے اس ملکی رسالہ کی اعانت نہیں فرمائی وہ توجہ فرمائیں کہ یہ رسالہ بغیر کسی سرمایہ کے محض آپ کی فیاضی کی امید پر جاری کیا گیا ہے اگر آپ نے اس کی اعانت میں کوتاہی اور عدم توجہی سے کام لیا تو رسالہ مالی مشکلات سے تنگ آکر بند ہو جائے گا تو اس کی تمام ذمہ داری آپ کے سر ہو گی۔ ہم نے ملک کے ایک گوشہ سے صدا بلند کی لیکن افسوس کہ چند اہل وطن کے سوا کسی نے سماعت نہ فرمائی۔

ہم نے اپنا فرض ادا کیا آپ اپنا فرض ادا کریں

رسالہ کا سالانہ خرچ بارہ سو روپیہ ہے اور ہیں اب تک صرف سوا سو خریدار ہم پہنچے ہیں اسلئے ملک کے

متمول ذمہ دار افراد سے ہم اسکی اعانت کے طالب ہوئے ہیں اگر صرف تین سو خریدار ہم پہنچ جائیں تو ہمیں کسی کی اعانت کی ضرورت نہ رہے ہاں بارہ سو سے زاید رقم جمع ہو جانے پر ہم رسالہ کی ظاہری و معنوی خوبیوں میں اضافہ کر سکینگے۔

ہمنے گذشتہ اگست نمبر میں ملک کے نامور اہل قلم حضرات سے مضامین کی درخواست کرتے ہوئے معاوضہ دینے کا بھی وعدہ کیا تھا۔ لیکن افسوس کہ مالی حالت کے درست نہ ہونے پر ہم انکی خدمات سے ابتک محروم ہیں ان سے معذرت کرتے ہوئے نہایت ندامت سے ملتجی ہیں کہ رسالہ کے سنبھلنے تک قلمی اعانت سے ہمارا ہاتھہ بٹائیں رسالہ کی مالی حالت درست ہونے پر ہم اپنی بساط بھر آپ کی خدمات سے دریغ نہ کرینگے۔

یہ بات کسی سے بھی مخفی نہیں ہے کہ مخدومی خواجہ حسن نظامی صاحب مدظلہ جہاں اسلام کی بہت کچھ ناقابل فراموش و لائق صد تحسین خدمات انجام دے رہے ہیں وہاں اشاعت اُردو کے بھی سچے بہی خواہ و ہمدرد ہیں اور دل سے اس کی ترویج و توسیع کے خواہاں ہیں حال ہی میں ہماری خوش نصیبی سے خواجہ صاحب موصوف بسلسلہ تبلیغ اور ہندی ترجمہ قرآن مجید کے چندہ کی فراہمی کی غرض سے کاٹھیا واڑ کے مختلف شہروں کا دورہ کرتے ہوئے ۱۰ اکتوبر ۲۶ء کو منگرول میں بھی تشریف لائے تھے اس موقع پر ”رسالہ زبان“ کو آپ کی خدمت میں باریابی کا شرف حاصل ہوا رسالہ دیکھکر بہت پسند فرمایا اتنا ہی نہیں بلکہ اشاعت اُردو کے خیال سے ”زبان“ کو خریداری کا بھی شرف بخشا اور اپنے دیگر ہمراہیوں کو بھی اس کی خریداری کی طرف توجہ دلائی اور کاٹھیا واڑ میں جہاں گئے اسی کا ذکر خیر فرمایا۔

کیا اب بھی اہل کاٹھیا واڑ کو اپنی اپنی ذمہ داری کا احساس نہ ہوگا کہ ایک غیر کاٹھیا واڑی اور وہ بھی ایسا شخص جس کی خدمت میں زبان سے بہتر ہندوستان کے کئی رسالہ ہدیتہً پیش ہوتے ہیں وہ ”زبان“ کی اس لئے نہیں کہ وہ زبان اردو کا ایک رسالہ ہے بلکہ اس لئے کہ وہ ایک ایسے مقام سے نکلتا ہے جہاں اُردو کو رواج دینے کی سخت ضرورت ہے مدد کرنا اپنا اور ہر اُردو داں کا فرض سمجھتا ہے۔ یہ خواجہ صاحب ہی پر موقوف نہیں ہے بلکہ ہر وہ شخص جس کو اشاعت اُردو کی اہمیت کا احساس ہے زبان کی امکانی امداد

سے دریغ نہ کرے گا۔

کس قدر افسوس ہے کہ چند دیسی ریاستوں میں جہاں سالہا سال سے تمام دفتری کارروائی اُردو میں ہوتی تھی وہاں اب اس کی حریف ہندی زبان میں ہوتی ہے اور آئے دن جس سُرعت کے ساتھ اسکو ترقی ہو رہی اور جس سرگرمی سے ہمارے ہندو بھائی اس کو اوج کمال پر پہنچانے میں جدوجہد کر رہے ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔

کیا ہمنے بھی اپنی وطنی اور مادری زبان "اردو" کو وسعت دینے کی کوئی نمایاں اور عملی کارروائی کی ہے؟

ہمارے مخلص دوست جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڑھی اور مکرمی مولانا عبدالستار صاحب فاروقی زبردست قلمی اعانت کے علاوہ زبان کی توسیع اشاعت میں بھی بڑی سرگرمی سے حصہ لے رہے ہیں جس کے لئے ہم ان کے بیحد ممنون ہیں۔

اڈیٹر

التجا

طبع الم نواز دے ذوق فغاں طراز دے
یعنی دل فسردہ کو تابِ نفس گذار دے

سرد ہیں سارے ولولے آتشِ شوق پھونک دے
سوز دروں کو پھر مرے قوتِ شعلہ ساز دے

نقشِ عبودیت جو تھے اب ہیں وہ کچھ مٹے مٹے
شانِ فتادگی بڑھا، بیخودی نیاز دے

رنگ بہارِ دہر کا نذرِ سموم ہو چکا،
موجِ نسیم کر رواں ذوقِ چمن طراز دے

درخورِ لطف گر نہیں رزمی خستہ و حزیں
تیری نگاہ قہر ہی عزت و امتیاز دے

رزمی بھوپالی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زبان

ماہ اکتوبر ۱۹۲۶ء

مقالات

زوجیتِ عامّہ اور قرآن مجید

(از قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی)

ازمنۂ قدیمہ میں جبکہ تمدّن بشری کی ابتدا تھی نباتات کے روابط و اسرار بہت کم دریافت ہوئے تھے۔ مثلاً یہ معلوم تھا کہ درختِ خُرما میں جنسِ نر و مادہ ہوتی ہے، مگر اس بات کا علم نہیں تھا کہ تمام اقسام نباتات میں ذکور و اُناث پائے جاتے ہیں۔ آج سے تیرہ سو برس پیشتر قرآن کریم نے اس نظریہ کو دُنیا سے روشناس کرایا کہ "زوجیت عامّہ" یعنی جنسیتِ نر و مادہ تمام نباتات میں موجود ہے:-

وَاَنْبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍ بَهِيجٍ (سورۂ حج) اور ہر جنس نباتات کو تر و تازہ اُگاتا ہے،

مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ جَعَلَ فِيهَا زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ (سورۂ رعد)

تمام میووں میں سے اس نے جوڑے بنائے ہیں۔

نباتات کے علاوہ بھی قرآن مجید ہمیں ایسی چیزوں میں جنسیت اور زوجیت کی خبر دیتا ہے جنکو ہم نہیں جانتے۔

سُبْحَانَ الَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ وَمِنْ أَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُونَ (سورۂ یٰس)

پاک ہے وہ (خدا) جس نے ہر اس چیز سے جوڑے پیدا کئے جنکو زمین اگاتی ہے اور انسانوں میں سے، اور اُن (مخلوقات) میں سے جن کو وہ نہیں جانتے۔

بلکہ اس کا دعویٰ تو یہاں تک ہے کہ :-

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ (الذاریات)

اور ہر چیز سے ہم نے جوڑا پیدا کیا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو

باوجود ان روشن اور واضح تر بیانات کے لوگ اس نظریہ سے نا آشنا رہے۔ مگر جب علم الحیات اور علم نباتات نے ترقی کی زینہ پر قدم رکھا اور حکمائے اسلام تحقیقات علمیہ کی طرف متوجہ ہوئے تو نباتات میں جنسیت نر و مادہ کی حقیقت پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی چنانچہ آج اس بات کو زمانہ حال کے تمام نباتیئن اور شجارین تسلیم کرتے ہیں اور علم اشکال الاعضا (morphology) کا ہر ایک ماہر جانتا ہے کہ پیش رستہ (Prothalium) پودوں میں اعضائے جنسیہ ہوتے ہیں جنکو اصطلاح میں تخم خانہ (archegonia) اور زر خانہ (Antheridia) کہتے ہیں اور یہ دونوں ہمصورت (Homosphorous) فرن[۵۱] کی قسم کے پودوں میں یکجا، اور مختلف قسم کے تخمدان والے (Heteresporous) پودوں میں (ذکور و اناث پیش رستہ میں پائے جاتے ہیں[۵۲]۔

---

۵۱ بے پھول جماعت کے چوبی درختوں کی قسمیں جن کے ورق ملائم ہوتے ہیں۔
۵۲ تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا لفظ "بوسنی"

لیکن جمادات اب تک اس قاعدہ کلیہ سے مستثنیٰ سمجھے جاتے تھے۔ حال ہی میں رُوس کے ایک نامور سائنیس داں مینو ایلوف (Manuilofe) نے، جو انسانوں حیوانوں اور نباتات میں جنسیت کی تحقیق کر رہے تھے اس اہم نظریہ کا انکشاف کیا ہے کہ "جمادات میں بھی جنسیت پائی جاتی ہے!

ڈاکٹر مینو ایلوف لینن گراڈ (روس) کی "انجمن معالجہ نفسی" کے ایک سربرآوردہ رُکن ہیں، اور حال میں اُنہوں نے اپنے تازہ انکشافات پر انجمن مذکور میں ایک تقریر کی تھی۔ وہ کہتے ہیں کہ تازہ اختبارات نے اُن پر یہ ثابت کر دیا کہ بلور (Crystal) کی دو خاص شکلوں ہشت پہلو اور مکعب میں جنسیت پائی جاتی ہے، چنانچہ اس نظریہ کی مزید توثیق و تصدیق کے لئے اُنہوں نے بالکل سائنٹفک طریقہ پر مختلف قسم کی گیارہ معدنیات کا تجربہ کیا، اور ہر تجربہ کا یہی نتیجہ برآمد ہوا[۱]۔ اس طور پر جمادات میں جنسیت کے وجود کا یقینی ثبوت مل گیا۔

نباتات کی جنسیت کے نظریہ کو حکمائے اسلام نے تحقیق کیا اور جمادات کا مسئلہ محققین یورپ نے حل کیا۔ اس طرح مشرق و مغرب نے مل کر قرآن مجید کے بیانات کی تصدیق کر دی! وَلِلّٰہ درّمن قال:-

جمیع العلم فی القرآن لکن　　تقاصر عنہ افہام الرجال

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اس نظریہ علم و حکمت کو ایک اُمّی (فداہ ابی و اُمّی) نے کس طرح دنیا کے سامنے پیش کیا؟ لیکن کیا یہ بین ثبوت اس بات کا نہیں ہے کہ قرآن مجید مُنزّل من اللہ ہے جس کو پروردگار عالم نے اپنے برگزیدہ بندہ کے ذریعہ نازل فرمایا؟ اور کیا اس سے وَمَا یَنطِقُ عَنِ الھَوٰی اور وَاِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحیٰ کی کامل تصدیق نہیں ہوتی؟

نگارِ من کہ بہ مکتب نرفت و خط نہ نوشت
بہ غمزہ مسئلہ آموزِ صد مدرّس شد!

---

[۱] رسالہ ([illegible]) بابتہ ۱۶ جنوری ۱۹۲۶ء

ایران

زیر حکومت رضا خاں

از میجر ای۔ ڈبلیو پولسن نیومن

(مترجمہ جناب اکبر علی صاحب۔ بی۔ اے۔ ناظم تعلیمات ریاست منگرول)

ہماری استدعا پر جناب اکبر علی صاحب بی۔ اے (پٹیالوی) ناظم تعلیمات ریاست منگرول نے زبان کے لئے انگریزی سے سلیس اُردو میں ترجمہ کر کے عطا فرمایا ہے جس کے لئے ہم ان کے بیحد مشکور ہیں۔

موصوف کا نام اگرچہ دنیائے ادب میں نیا ہے لیکن اگر وہ اس علمی شغل کو جاری رکھیں تو یقین ہے کہ بہت جلد ایک اچھے انشا پرداز مشہور ہو جائیں۔ حال میں موصوف نے ہمارے سرپرست و آقا نواب صاحب منگرول بالقابہ (جنھیں مسلمانوں کی تعلیم کا بڑا خیال ہے خصوصاً چھوٹے بچوں کی ابتدائی تعلیم کو آسان بنانے کی فکر ہر وقت دامنگیر رہتی ہے) کی فرمائش سے اُردو کا ابتدائی قاعدہ جدید اصول پر مرتب فرمایا ہے (جو عنقریب شائع ہو جائیگا) جس کو دیکھکر ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ آجتک اُردو کے جتنے قاعدے لکھے گئے ہیں ان میں سے کسی کو بھی قبولیت کا شرف نہیں حاصل ہوا لیکن امید ہے کہ یہ قاعدہ سب سے بہتر ہونے کے لحاظ سے بہت جلد قبولیت کا شرف حاصل کر لے گا۔

اس قاعدہ میں سب سے بڑی خوبی علاوہ آسان اور سریع الفہم ہونے کی یہ ہے کہ بچہ بہ یک وقت اُردو اور گجراتی دونوں زبانیں سمجھنے اور لکھنے لگ جاتا ہے اس لئے بچہ کا بہت سا قیمتی وقت ضائع ہونے سے بچ رہتا ہے۔ غرضکہ بمبئی پریسیڈنسی کیلئے یہ قاعدہ ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگا۔

اڈیٹر

منجملہ اخباری بیانات کے جو اطلاعیں مختلف ذرائع سے موصول ہوئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایران

کی عام حالت کے بارہ میں بہت غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے۔ ایران کی سرحدیں داخل ہونے سے پہلے مجھ سے کہا گیا تھا کہ ملک میں بالشویزم کا بہت زور ہے، سوویٹ گورنمنٹ ہی درحقیقت گورنمنٹ ایران ہے اور روس بتدریج (سیاسی نہ سہی)، اپنا اخلاقی اثر سرحد عراق اور خلیج فارس کی طرف بڑھا رہا ہے۔

خوش قسمتی سے میں بوثوق یہ بات بیان کرنے کے قابل ہوں کہ وہاں کی یہ حالت نہیں ہے اور مجھے اُمید ہے کہ میں اُن اصول کا کچھ خیال آپکو دلا سکونگا جن پر ایران آہستہ آہستہ حرکت کر رہا ہے۔

ملک ایران دراصل ایک سرسبز و شاداب زراعتی ملک ہے جس کے تمام اطراف میں میلوں تک فراخ وادیاں پھیلی ہوئی ہیں اور تمام ملک اگرچہ کوہستانی ہے لیکن اس کا ایک وسیع رقبہ قابل زراعت ہے۔

حملہ ضروریات کو پورا کرنے کے لئے وہاں ریل گاڑیاں نہیں ہیں اور تمام تجارتی مال و اسباب کو سُست رفتار قافلے ناہموار راستوں پر آرام و آہستگی سے لیجاتے ہیں۔ ملک کے مختلف حصّوں کے درمیان آمد و رفت بہت کم ہے۔ اگرچہ موٹر کے اجرا نے سفر میں بڑی سہولتیں پیدا کر دی ہیں جس سے آمد و رفت بڑھ گئی ہے تاہم بعض اضلاع ایک دوسرے سے اس قدر الگ تھلگ ہیں کہ ایک حصّہ میں قحط پڑ جاتا ہے تو دوسرے حصّہ میں گیہوں پڑے سڑا کرتے ہیں۔

ایران میں ہر چیز کی رفتار نہایت سُست ہے۔ مذہباً اکثر اہل ایران شیعہ فرقہ کے مسلمان ہیں۔ علما و مجتہدین کی مذہبی جماعت کو اب بھی بڑا اقتدار حاصل ہے، اور بحیثیت مجموعی ملک میں اسلامی احساس بہت بڑھا ہوا نظر آتا ہے۔ تعلیم کی طرف سے اب تک بہت غفلت برتی گئی ہے۔ حال ہی میں مُلّاؤں اور غیر ملکی مشنریوں (مبلغین) نے اسے کُلیتہً اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ فوج پہلے کم و بیش ناکارہ لوگوں کی ایک بے قاعدہ جماعت سے زیادہ نہ تھی جو وردی پوش رہا کرتی تھی۔ زندگی کے ہر ایک شعبہ میں "قرون وسطیٰ" کی سی فضا سرایت کئے ہوئے تھی، اور آمد و رفت کے ذرائع کی عدم موجودگی نے ترقی کے بڑھتے ہوئے قدم کو بہت روک رکھا تھا۔

اب ایران آہستہ آہستہ کروٹ بدلنے لگا ہے، اور بتدریج ارتقائی منزلیں طے کر رہا ہے۔ ترقی ضرور ہو رہی ہے، اور گورنمنٹ کی عملی کارروائی اور آئین حکومت کے ماتحت قائم شدہ عام درسگاہوں کی بدولت تعلیمی حالت روبہ ترقی ہے، لوگ زیادہ روشن خیال ہوتے جا رہے ہیں۔ ابتدائی اور ثانوی مدارس دہن میں بہتر تعلیم دی جاتی ہے، کا تعلیمی نصاب وزیر تعلیمات کے ماتحت ہے۔ اور دور دراز صوبجات

تک میں مدارس قایم کردیئے ہیں۔ طہران میں فرانسیسی علوم کا ایک شعبۂ تعلیم قائم ہے جہاں طب، قانون اور سیاسیات کی سندیں عطا کی جاتی ہیں۔ بایںہمہ تعلیم کو جسقدر امداد ملنی چاہیے اتنی نہیں ملتی، اور اگر ایرانی حکومت اشاعت تعلیم کے لئے مزید سرمایہ بہم پہنچائے تو بہت بہتر ہوگا۔

زبان فارسی کی تعلیم تمام مدارس میں لازمی ہے، قومی زبان اور قومی تاریخ کی تعلیم ہر جگہ دی جاتی ہے۔ فوج میں اصلاح کی گئی ہے اور امن عامہ کا انتظام اچھا ہے۔ بجٹ میں کچھ زائد رقم پس انداز کی جاتی ہے۔ جنگ کے بعد سے ایرانیوں کا قومی جذبہ بہت تیز ہوگیا ہے، اور معاشرتی اتحاد کے علاوہ، (جو ایرانی نسل کا امتیاز خصوصی ہے) قومی و سیاسی اتحاد کا خیال، فوج کے قیام، تعلیم اور موٹر کے اجرا سے مضبوط کیا جارہا ہے حق بات یہ ہے کہ اہل ایران کے پاس اس وقت ایک ایسی بنیاد موجود ہے جس پر وہ ترقی کی ایک ٹھوس عمارت بتدریج قائم کرسکتے ہیں۔ لیکن یہ خیال نہ کرلینا چاہیے کہ یہ بنیاد غیر متزلزل ہے۔ ضرورت ہے کہ اس میں بہت احتیاط سے کام لیا جائے۔ کیونکہ وہ ابھی اتنی مضبوط نہیں ہے جو سخت صدمات کو (خواہ وہ داخلی ہوں یا خارجی) برداشت کرسکے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ موجودہ اصطلاحات میں سب سے بڑی قوت متحرکہ رضا خاں پہلوی موجودہ شاہ ایران کی شخصیت ہے۔ جو پہلے وزیر اعظم، وزیر جنگ اور کمانڈر ان چیف تھے۔ اگرچہ ان کے اصلی اختیارات ایک خود مختار حاکم کے برابر تھے تاہم انکو "مطلق العنان" کہنا بھی صحیح نہیں کیونکہ انکو اقتدار پہلے ہی سے حاصل ہوچکا تھا اور وہ مناسب آئینی حکومت کے ماتحت صاحب اختیار تھے۔ وہ اس بنائے عمارت کے "سنگ بنیاد" پہلے بھی تھے اور اب بھی ہیں۔ اور انکی یہ طاقت تخت ایران پر جلوہ فرما ہونے سے بہت مستحکم ہوگئی ہے۔

فوجی جمعیت رضا خاں کی بہت بڑی مؤید تھی، اور فوجی طاقت بڑھانے کے لئے مجلس شوریٰ نے حال ہی میں ایک سخت فوجی قانون نافذ کیا ہے۔

طہران میں جن ایرانیوں سے میری ملاقات ہوئی ان کو یورپ میں تعلیم پانے، اور موجودہ سیاسی تدبر میں گہری دلچسپی لینے کی وجہ سے میں نے بہت روشن خیال پایا۔ امریکن کالج، اور ینگ پرشین سوسائٹی عام سطح خیال کو بلند کرنے میں بہت کوشاں ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ آئینی تدبر کے عناصر اس وقت ملک میں سرایت کررہے ہیں۔

اس وقت ایرانیوں کی اولوالعزمیوں کی نمایاں خصوصیت حصول "آزادی" ہے جو تمام ایرانی

حکمت عملی کا اصل الاصول ہے۔

قبل از جنگ ایران میں دو زبردست غیر ملکی اثرات تھے، یعنی برطانیہ عظمیٰ اور روس۔ روسی اثر بہت زبردست تھا۔ ایرانی کاسک فوج کا دستہ (Cossack Brigade) جس کا کمانڈر روسی کرنیل تھا، اپنے منتخب روسی افسروں کے ساتھ طہران میں، دنیا کی سب سے بڑی چھاؤنیوں میں سے ایک چھاؤنی میں ڈیرا ڈالے ہوئے تھا۔ ایک زبردست سفارتخانہ کے علاوہ ایک روسی بنک بھی تھا، جس کا مالی اثر بہت بڑھا ہوا تھا۔ ان ہر سہ ذرائع سے روسی رفتہ رفتہ اپنا اقتدار جمانا چاہتے تھے۔ ان میں سے ہر صیغہ سہولت کی غرض سے سینٹ پیٹرسبرگ (پٹرو گراڈ) میں ایک علیحدہ وزارت کے ماتحت رکھا گیا تھا۔ جو مداخلت کے الزامات کی تردید کے لئے ایک ذریعہ تھا۔

برطانوی اثر جو زیادہ تر جنوب مغربی ایران تک محدود تھا، شمال میں روسی اثر کی کمی بیشی کی بدولت منتظم اور باقاعدہ ہو رہا تھا۔ کچھ عرصہ تک ان دو بڑی حکومتوں کا عملدرآمد پیش قدمی اور پسپائی کی دو رُخی پالیسی پر تھا، اس کے بعد عدم مداخلت کا قانون بروئے کار آیا جس کی رو سے برطانیہ نے تسلیم کیا کہ وہ شمال میں اپنا اثر ڈالنے کی کوشش نہ کرے گا۔ اور روس اس بات پر رضامند ہوا کہ وہ جنوب میں عدم مداخلت کی حکمت عملی پر کاربند رہیگا۔ اس اثنا میں اہل ایران، طہران اور شمالی ایران پر روسیوں کے مسلسل تسلّط سے بہت تنگ آ گئے تھے اور عدم مداخلت کا جو اقرار تھا وہ بالکل بے سود ثابت ہوا۔ روس اور انگلستان کے مابین ۱۹۰۷ء کے معاہدہ کا منشا بھی (جو اسی طریقہ کار پر مشتمل تھا) روس اور انگلستان کی طرح ایرانی معاملات کے بارہ میں بھی اتحاد کی پالیسی کو رواج دینا تھا۔ اس پر بھی کامیابی کے ساتھ عملدرآمد نہ ہو سکا، اور ایرانیوں نے مشترکہ انگریزی اور روسی حکمت عملی کو ناپسندیدگی سے دیکھا اور اس پر اعتماد نہ کیا۔

۱۹۱۴ء میں برطانیہ عظمیٰ اور روس آپس میں اتحادی بن گئے۔ اس لئے ایران نے درخواست کی کہ غیر جانب دار علاقہ سے روسی افواج ہٹا دی جائیں۔ لیکن یہ درخواست منظور نہ ہوئی یہانتک کہ روسی انقلاب رونما ہوا۔ اس وقت صرف برطانیہ ہی کا اقتدار ملک میں باقی رہ گیا تھا۔ لیکن اسیوقت انگریزی اور روسی اتحاد کو اپنے ملک میں دیکھ کر ایرانیوں کو یہ خیال پیدا ہو چلا تھا کہ برطانوی اثر روسی

اثر سے کسی طرح بہتر نہیں ہے۔

دوسرا قدم وہ انگریزی ایرانی معاہدہ تھا جس نے محض ناکامیوں کی فہرست میں اضافہ کیا اور بالآخر جون ۱۹۲۱ء میں منسوخ ہوگیا۔ ایران غیر ملکی مداخلت سے تنگ آگیا ہے۔ وہ کامل آزادی اور قطعی عدم مداخلت چاہتا ہے اور بالآخر اس کو ترقی دینے اس میں حب الوطنی کا جوش پیدا کرنے اور قومی قوی اکو حرکت میں لانے کے لئے اس کو ایک زبردست عالی دماغ مل گیا ہے۔ یہ عالی دماغ شخص فتنۂ بالشویزم کے مقابلہ میں ایران کا سب سے بڑا محافظ ہے۔

ایران جانے سے مجھے یقین ہوگیا کہ ملک میں بالشویزم کی تحریک دبتی جارہی ہے اگرچہ روسی حکومت کے گماشتے اس بارہ میں کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھتے۔ تاہم میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ایرانی حکومت پر سوویٹ گورنمنٹ کا کچھ بھی اقتدار نہیں ہے اور بالشویزم کی بابت چیخ پکار کا مطلب محض سوویٹ روس کی اس خونخوار پالیسی کو (جو کامل عدم مداخلت" سے زیادہ کسی چیز کو نفرت کی نگاہ سے نہیں دیکھتی) مشتہر کرکے اس کی ہمت افزائی کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

ایران "سرخ پالیسی" سے متنفر ہے، صرف اس وجہ سے نہیں کہ وہ "سرخ" ہے بلکہ اس سبب سے بھی کہ وہ روسی ہے۔ اس پالیسی سے اس کی آزادی معرض خطر میں ہے ——— وہ آزادی، جو خود کو منوانے اور اپنے قیام و ثبات کے نصب العین سے برطانیہ کی ہمدردی کے ساتھ کسی بیرونی دباؤ کی زبردست محافظ ہے۔

اسلام کا شیعہ مذہب دراصل ایک ایرانی سیاسی تحریک تھی جس نے مذہبی فرقہ کی صورت اختیار کرلی ہے۔ اور اس لئے ملک ایران روسی ہوسناکیوں کی نشوونما کے لئے مناسب سرزمین نہیں ہوسکتی۔ اہل تشیع کو مذہبی پابندی کا پورا احساس ہے جس کی نگہداشت ان کے ملا کرتے ہیں۔ اس بارہ میں گورنمنٹ کی طرف سے ان ملاؤں کی ہمیشہ تائید ہوتی ہے۔ ایسے مذہب کے خلاف جس کی جمعیت کا دارومدار تمام تر قومیت پر ہو روسی حکمت عملی کامیاب نہیں ہوسکتی اور موجودہ حالات کے اعتبار سے بہت کم امید ہے کہ سوویٹ پروپگنڈا ایران میں بارآور ہوسکے۔ کیا تعجب ہے کہ یہی پروپگنڈا آگے چل کر قومی آزادی کی ترقی میں ایک مفید محرک ثابت ہو۔

روسی نقطۂ خیال سے ایران ہر طرح ایک اہم چیز ہے، اور اگر وہ سوویٹ پروپگنڈا کے سامنے

سرِ تسلیم خم کردے تو خلیج فارس اور عراق (بشرطیکہ برطانیہ میسوپوٹامیہ کو خالی کر دے) سے لیکر شام اور بحیرہ روم تک راستہ صاف ہو جائے، ایران اس وقت روس اور برطانیہ عظمیٰ کے درمیان ایک بین بین کی حالت میں ہے۔ البتہ برطانیہ جنوب اور جنوب مغربی ایران کے جائز و مقررہ حقوق کی نگہداشت کا خواہشمند، اور تمام ایران کے ساتھ اپنے تجارتی تعلقات کو وسعت دینے کا اُمیدوار ہے۔ لیکن ایرانی معاملات میں وہ دست اندازی نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ اپنے معاملات کو سلجھانے میں ایران جس قدر ذمہ داری قبول کرے اتنا ہی برطانیہ کے مفید مطلب ہے۔ پس ایرانی سمجھتے ہیں کہ انگریزوں کی طرف سے کبھی کوئی ناجائز دباؤ نہ ڈالا جائیگا۔ اسی طرح انہیں یقین ہے کہ ضرورت کے موقع پر برطانیہ بے غرضانہ مشورہ دینے کو تیار ہوگا۔

آزادانہ طریقوں سے ایران کی آیندہ ترقی اس کی مستقل مالی حالت اور اُس اقتصادی ترقی پر منحصر ہے جو انگلستان اور امریکہ کے مشترکہ اقتصادی اتحاد سے حاصل کی گئی ہو۔ زراعت کو ترقی دینا، آب پاشی اور آمد و رفت کے ذرائع بہم پہنچانا ملک کے لئے نہایت اہم اور ضروری ہیں۔ افیون کی کاشت کے مسئلہ کو حل کرنا چاہیئے اور بالآخر اس کی قائم مقام کاشت کو رواج دینا چاہیئے۔ کیونکہ افیون کی پیداوار نہ صرف قوم کے لئے جسمانی حیثیت سے مضرت رساں ہے بلکہ اس کا استعمال تمام ترقیوں کا مانع ہے۔ اس کی مقدار اس کی قیمت کے مقابلہ میں کم ہے، اور افیوں کی ایک قیمتی مقدار کا وزن اُٹھانے کے لئے ایک قلیل الجثہ گدہے کی پیٹھ کافی ہوتی ہے۔

افیون کی جگہ اور اجناس کی کاشت کو رواج دینے کے لئے آب پاشی اور آمد و رفت کے ذرائع مہیا کرنے کی ضرورت ہوگی۔ جن سے کسی طرح سے ملک کو فائدہ پہونچنے کی امید ہے۔ اگرچہ زراعت کو ترقی دینے کے لئے ایک بڑے سرمایہ کی ضرورت ہوگی۔ لیکن کوئی وجہ نہیں ہے کہ پیداوار معقول نہ ہو، اگر افیون استعمال کرنے والے ممالک جو اس کے استعمال کا انسداد کرنا چاہتے ہیں، اس کی جگہ اور فصلوں کی ابتدائی کاشت کے لئے کچھ مالی امداد دیں تو اس سے نہ صرف ان کو فائدہ ہوگا بلکہ وہ ایک وسیع پیمانہ پر ایران کی اقتصادی ترقی کا راستہ بھی صاف کر دیں گے۔

ایران میں افیون کے انسداد کا مسئلہ چونکہ بین الاقوامی اہمیت رکھتا ہے اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے، جس کا گہرا اثر اُس ملک کی اقتصادی حالت پر پڑتا ہے جہاں وہ پیدا ہوتی ہے، اس لئے

مسئلہ افیون سے واقفیت حاصل کئے بغیر ایران کے اصلی اور صحیح خال وخط کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔
منجملہ بائیس[۲۲] صوبجات کے ایران کے اٹھارہ[۱۸] صوبوں میں افیون پیدا ہوتی ہے، اور تقریباً چار لاکھ مربع میل رقبہ میں (جو ملک مصر کے رقبہ سے زیادہ ہے) اس کی کاشت ہوتی ہے، علاقہ کاشت سے خارج صرف وہ صوبجات ہیں جو خلیج فارس کے ساحل پر واقع ہیں، اور صوبجاتِ شمال مثلاً آذربائجان، گیلان، استرآباد، خمسہ، اور کردستان ہیں۔ افیون کی تجارت پر کوئی ضابطہ قائم کرنے میں بڑی مشکلوں کا سامنا ہے، کیونکہ افیون کی اقتصادی اہمیت اور اس کی تجارت میں کثیر منافع کا خیال اس کی راہ میں بڑی رکاوٹیں پیدا کریں گے۔ نیز تجارتی منفعت کے کثیر ذرائع کو کم کردینے، یا کسی خاص فرد کی آزادی میں مداخلت کرنے میں عام اور سیاسی مخالفت کا اندیشہ ہے۔
افیون کی تجارت ایران کے لئے اقتصادی حیثیت سے بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ فی الواقع ایران کے متعدد صوبوں میں صرف یہی ایک فصل ہے جو کسی نہ کسی صورت میں کاشتکار کی محنت کا نقد معاوضہ دیتی ہے۔ اور کلاً یا جزاً لوگوں کی ایک کثیر تعداد کی گذر اوقات اسی کی کاشت اور تجارت پر منحصر ہے۔
اصفہان کی اسی ہزار کی آبادی میں کم از کم پانچ ہزار آدمی ایسے پائے گئے ہیں جو اپنی آمدنی کا تمام یا ایک بڑا حصہ تجارتِ افیون کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں۔ اور اگر انمیں سے ہر ایک فرد کے متعلقین کا اوسط تین آدمی فرض کرلیا جائے تو معلوم ہوجائیگا کہ تمام آبادی میں کم از کم پچیس فی صدی لوگ زیادہ تر اسی افیون کی پیداوار پر اوقات بسر کرتے ہیں[۵]۔
بدقسمتی سے ملک میں صنعت و حرفت کا وجود نہیں ہے، جو تجارتِ افیون کے انسداد یا اسمیں کمی واقع ہوجانے کی حالت میں اس مزدور پیشہ جماعت کو کسی کام پر لگا سکے۔ نہ ہی زمیندار یا کاشتکار موجودہ حالت میں سخت نقصان اٹھائے بغیر افیون کی جگہ کسی اور چیز کی کاشت کرسکتے ہیں۔ اگر ان کے لئے فن زراعت کا کوئی ماہر اور افیون کی قایم مقام فصلیں بونے کے لئے کافی سرمایہ بہم پہنچایا جائے ایسے لوگوں کی طرف سے جنھیں افیون کی پیداوار کو کم کرنے یا روکنے کا حق حاصل ہے، تب بھی لوگوں کو ان فصلوں سے کافی آمدنی مہیا کرنے کے لئے سالہا سال درکار ہوں گے، تاکہ ان نقصانات

۵ ان اعداد وشمار میں صفہان دنواح اصفہان کے کاشتکاران افیون شامل نہیں ہیں۔ ۱۲

کی تلافی ہوسکے جو انسداد افیون کی وجہ سے پہنچیں گے۔

پھر بھی گورنمنٹ ایران نے بعض قوانین جاری کرکے صحیح طریقہ پر بہت کچھ اصلاح کردی ہے مثلاً گورنمنٹ نے "شیرہ سوختہ" کے ٹھیکے کو رواج دیا ہے۔ حقوں میں افیون پینے کے بعد جو مواد بچ رہتا ہے اسی سے یہ شیرہ تیار کیا جاتا ہے۔ یہ نہایت ہی خطرناک عرق ہے جو آجکل ایران میں استعمال ہورہا ہے۔ چنگی کا محصول بڑھا دیا گیا ہے، اور ۱۹۱۱ء میں چند دفعات بھی مرتب کی گئی تھیں جو سات سال کے اندر "شیرہ" کے استعمال کی ممانعت پر مشتمل تھیں۔ پھر ساتویں سال کے بعد ایسے قوانین کا نفاذ بھی ہوا تھا جن کی رو سے ادویہ کے سوا افیون کے استعمال کی سخت ممانعت کی گئی تھی۔ اس ممانعت کو عمل میں لانے کے لئے چند قواعد بھی مرتب کئے گئے تھے جن سے شیرہ کے ٹھیکہ کو مزید تقویت ہوگئی نیز عرق افیون کو ایک جگہ جمع کرنے، اور گورنمنٹ کے گودام خانوں میں اس کو تیار کرنے کا حکم دیا گیا تھا تاکہ ملک میں افیون کے مقامی استعمال پر ضابطہ قائم ہوسکے۔

شیرہ کے تمام گودام خانے براہ راست گورنمنٹ کی نگرانی میں ہیں، اور ادویہ کے سوا ماست افیون (Morphine) کے استعمال کی ممانعت ہے۔ اس ممانعت پر عملدرآمد کے لئے سرحدوں پر سخت نگہداشت کی جاتی ہے۔ مارفین کی بڑی مقدار اور مارفین پینے کی نلکیاں ضبط کرلی گئی ہیں۔ لیکن جنگ عظیم کے سبب سے جبکہ برطانوی، روسی، اور ترکی افواج کے لئے ایران میدان جنگ بنا ہوا تھا، مرکزی حکومت کا اقتدار گھٹ گیا تھا، اس وجہ سے افیون سے متعلق قوانین کے اجرا میں ایک طرح کی خامی واقع ہوگئی۔

لیکن جب رضا خاں (موجودہ شاہ ایران) نے ۱۹۲۲ء میں محصولات کی تحصیل بلاواسطہ اپنے ہاتھ میں لے لی تو افیون کے گودام خانوں میں ایک وافر ذخیرہ افیون نظر آیا۔ پھر جب امریکن مالی کمیشن نے بھی تحصیل دسمبر ۱۹۲۲ء میں اپنے اختیار میں لی تو اس نے ذخیرۂ افیون یکجا جمع کرنے کی تجویز پایۂ تکمیل کو پہنچانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اور اُن صوبوں میں جہاں یہ اصول قایم ہوچکا تھا سخت نگرانی ہونے لگی۔

افیون کی کاشت کو وسیع پیمانہ پر تقسیم کردینے سے، چھوٹے چھوٹے قطعات زمین میں (جیسے کہ "حریم" کے باغات میں نگرانی ناممکن ہے ہمنفعت بخش زراعت کے امکان سے، اور اس وجہ سے

کہ بہترین پیداوار کے بہت رقبے اب گورنمنٹ کے قبضہ میں آنے لگے ہیں، افیون کی پیداوار پر باضابطہ نگرانی قائم کرنے کا مسئلہ بہت پیچیدہ ہو گیا ہے۔ کھلیان کے زمانہ میں افیون کے کھیتوں میں کثیر التعداد لوگوں کے داخل ہو جانے سے افیون کے عرق کی نگہداشت بھی بہت مشکل ہو گئی ہے۔ فصل کے پکنے تک تو کاشتکار لوگ کھیتوں میں رہتے ہیں لیکن پوست کو پکنے کے ساتھ ہی کُرَچ لینا ضروری ہے ورنہ عرق دستیاب نہیں ہو سکتا اس مطلب کے لئے کئی مزدوروں کی ضرورت پڑتی ہے جنہیں عموماً افیون یا عرقِ افیون یا کچھ عرق اور کچھ نقد معاوضہ دیا جاتا ہے۔

فصل تیار ہونے پر دوکاندار اور چھوٹے بیوپاری دیہات میں جاتے ہیں جنھوں نے سال بھر میں کاشتکاروں کو مال اودھار دیا ہوتا ہے اور معاوضہ میں افیون کا عرق وصول کرتے ہیں اسی طرح تاجروں کو بھی یہی صلہ ملتا ہے۔ جونہی عرق کا ذخیرہ شروع ہوتا ہے، ہزارہا چھوٹی چھوٹی اشیاء فروخت کرنے والے اپنا سامان افیون کے کھیتوں میں عرق کے عوض بیچتے پھرتے ہیں۔ درویش، قصہ گو، فقیر، نوسیے، کھیل کرنے والے مداری، ان کھیتوں میں چکر لگاتے رہتے ہیں، جن کی ہتھیلیوں پر افیون کھرچنے کے چاقو پر چپکا ہوا حصہ بطور انعام لگا دیا جاتا ہے۔ اس طریقہ سے حاصل کردہ افیون وہاں آنے والے خریداروں کے ہاتھ بیچ دی جاتی ہے۔

ایسی حالت میں جبکہ فصل کے موقع پر ایک رقبہ میں تین سے پانچ ہزار باہر کے آدمی وہاں موجود ہوتے ہیں جن سب کے پاس افیون کا عرق ہوتا ہے کُل فصل کی افیون یکجا جمع کرنے میں جو مشکلات پیش آسکتی ہیں ان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ چونکہ اُن میں سے اکثر لوگوں کا گذران ہی سالانہ آمدنی کے بڑے حصہ پر ہوتا ہے، جیسے وہ فصل کے موقع پر حاصل کرتے ہیں، تو کامل طور پر ذخیرہ یکجا کرنے سے ان لوگوں کو کئی مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا اگر زمینداروں اور کاشتکاروں سے اُن کا تمام عرق جمع ہونے کے ساتھ ہی گودام خانوں میں رکھوا لیا جائے تو ان میں سے کم و بیش ہزارہا اوسط درجہ کے حقدار لوگوں کو اپنے پیشوں سے دست بردار ہونا پڑیگا مذکورۂ بالا کاشتکاروں کے علاوہ افیون کے دلال کمیشن ایجنٹ اور تجار بھی ہیں جو ملک میں افیون کی خرید و فروخت کے لئے تیار رہتے ہیں ان لوگوں اور ان کے عملوں کا گذران بہت کچھ اسی افیون کی تجارت پر منحصر ہے۔ اور ان کی تعداد سیاسی لحاظ سے آبادی کا غالب حصہ بنی ہوئی ہے

سرحد کی وسعت کے سبب سے افیون کی بڑی مقدار ملک میں سے خفیہ طور پر باہر چلی جاتی ہے لیکن اگر برآمد قطعاً بند کر دی جائے تو اس خفیہ نکاس میں اور اضافہ ہو جائے اور ساتھ منافع بھی بڑھ جائے

اس لئے چنگی کے محصول کی شرح احتیاط سے مقرر کرنی چاہیئے۔ پھر بھی عرق افیون اس کی سلائیوں اور ٹکیوں کی پیداوار کے مقام سے منزل مقصود تک لیجانے میں "طریق اجازت" (Permit System) کے اصول پر سخت نگرانی کیجاتی ہے۔

تجارت افیون پر ضابطہ قائم کرنے میں گورنمنٹ ایران کو کئی سیاسی اور خانگی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاجران افیون اور کاشتکاروں کی جماعتیں غالباً ایران میں سب سے زیادہ مالدار جماعتیں ہیں۔ اور آخرالذکر طبقہ میں کئی بارسوخ مقتدایان مذہب بھی شامل ہیں جن کے زیر اثر یا ملکیت میں اُن مقامات کا ایک معقول حصہ ہوتا ہے جو مذہبی غرض سے وقف کئے گئے ہیں۔ اس لئے افیون کی پیداوار، تیاری یا برآمد میں دخل دینے کی کوشش ان جماعتوں کی متحدہ مخالفت کا موجب بنجاتی ہے۔ تاوقتیکہ افیون کی تجارت سرمایہ اور مزدوری کے مقابلہ میں اسی قدر منفعت بخش ذرائع مہیا نہ کئے جائیں، گورنمنٹ کو انسداد کی ہر ایک تجویز میں سوداگروں اور تجارت پیشہ لوگوں کی (جن کا ملک کی منڈیوں میں بڑا رسوخ ہے) افیون کی کاشت والے صوبوں کے مذہبی ملاؤں کی جنہیں سیاسی و مذہبی اقتدار حاصل ہے) اور زمینداروں کی (جو ایسے معاملات میں دہقانوں کو اپنے قابو میں رکھتے ہیں اور جنہیں زمینداروں کی اکثریت والی پارلیمنٹ میں لبا اوقات قانون سازی میں دخل دینے کا حق حاصل ہوتا ہے) مخالفت کا سامنا کرنا پڑیگا۔ علاوہ ازیں دہقانوں کے معاملہ میں ان کے مقررہ رسم و رواج، اور طریق عمل میں کوئی تبدیلی کرتے ہوئے گورنمنٹ کو اندیشہ رہے گا۔ اسی طرح افیون کی تجارت کے انسداد کے بعد امداد کے وعدوں کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ کیونکہ گذشتہ ایام میں ایرانیوں کو بڑی بے رحمی سے لوٹا گیا ہے اس لئے وہ اس قسم کے وعدوں کو خواہ وہ کسی کی جانب سے ہوں، مشتبہ نظروں سے دیکھنے میں حق بجانب ہیں۔

گورنمنٹ کے ضابطہ کو وسیع کرنے والے چند فوری تدابیر اختیار کیجاسکتی ہیں پھر بعد میں دیگر قوانین کا اجراء بھی عمل میں آسکتا ہے، بشرطیکہ پہلے تجارت افیون کی محنت اور سرمایہ کی جگہ، نیز گورنمنٹ کی آمدنی میں جو نقصانات ہونگے انکی تلافی کے لئے نئے ذرائع بہم پہونچائے جائیں۔ فوری تدابیر مثلاً افیون کی کاشت حمل ونقل، تیاری مقامی کھپت اور برآمد پر سخت نگرانی اور ضابطہ قائم کرنے کی کوشش کی جائے بلا اس کے کہ گورنمنٹ یا تجارت کے خانگی مفاد پر نامناسب مشکلات عائد کی جائیں۔

افیون کی جگہ اور چیزوں کی کاشت کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ افیون کا چھوٹا سا رقبہ بھی

بڑا منفعت بخش ہوتا ہے، حمل ونقل کے لئے اچھے راستوں اور ریلوں کی اسے ضرورت نہیں ہوتی۔ خرید فروخت کا طریقہ بھی سیدھا سادہ ہوتا ہے، اور افیون و عرق دونوں کی بڑی قیمت پر باہر سے ہمیشہ مانگ رہتی ہے۔ ایران کی دوسری فصل کی بہ نسبت فی ایکڑ کثیر معاوضہ دینے کے علاوہ افیون کو پانی کی ضرورت نہیں ہوتی، پھر افیون کی فصل اکٹھی کر لینے کے بعد دوسری فصل اسی زمین میں لگائی جا سکتی ہے۔ لہٰذا قائم مقام فصلوں سے وہی مقررہ آمدنی حاصل کرنے کے لئے کسانوں کو زیادہ رقبہ کی کاشت کرنے کے علاوہ پانی کا استعمال بھی زیادہ کرنا پڑے گا۔ نیز ان قائم مقام فصلوں کے لئے خرید و فروخت کا بازار بھی قائم کرنا ضروری ہوگا۔

افیون پیدا کرنے والے رقبے زیادہ تر انہی صوبوں میں واقع ہوئے ہیں جہاں اچھی سڑکیں نہیں ہیں، اور جہاں باربرداری گدھوں کے کاروانوں تک محدود ہے۔ اس طریقہ سے باربرداری کی لاگت وزنی اشیاء کی برآمد کو، بمقابلہ اس کی قیمت کے، روک دیتی ہے۔ اسلئے قائم مقام فصلوں کی کاشت کے لئے کم قیمت پر زائد پانی مہیا کرنا، حمل ونقل کے اقتصادی (کم خرچ) ذرائع معلوم کرنا، اور زراعت سے متعلق ایسی فنی امداد حاصل کرنا ضروری ہے جن سے بحالت موجودہ جو کاشت ممکن ہو اس سے نسبتاً زیادہ ہونے لگے۔

ایران میں کاشت کے لئے افیون کی قائم مقام مناسب اجناس ریشم، تمباکو، روئی، چقندر، چارہ، سن، جوٹ، اور خشک میوہ جات ہیں۔ یہ قائم مقام فصلیں قدرتی طور پر صرف افیون پیدا کرنے والے قطعات تک محدود نہیں ہیں، اسلئے ان قطعات کا خیال مقدم ہونا چاہیے، تاکہ افیون کی تجارت کے خانگی مفاد کی حفاظت ہو سکے۔ لیکن ایسے قطعات میں صرف قائم مقام فصلیں، اور کاشت کی وسعت گورنمنٹ کو اتنی کافی آمدنی نہیں دے سکتیں جس سے کاشت افیون کی تخفیف کے باعث پیدا ہونے والے خسارہ کی تلافی ہو جائے۔ لہٰذا غیر افیونی رقبہ میں جدید یا مزید ذرائع آمدنی مہیا کرنے کے لئے زراعتی اسباب و وسائل کی اصلاح ضروری ہے۔

موجودہ حالات کے ماتحت ایران میں افیون سازی کے اس نازک و سیاسی تار و پود کو ایسے اقتصادی فتنہ، یعنی صنعت افیون کے انسداد سے، بکھیر دینا ابتداءً ہلاکت آفریں ثابت ہوگا، تاوقتیکہ ابتدائی تدابیر اختیار نہ کی جائیں، اور احتیاط سے تجویز کردہ طریقہ عمل میں نہ لایا جائے، بدگمان کسان اس سے کم

کسی بات پر راضی نہ ہوں گے۔ نیز فنی امداد اور مطلوبہ سرمایہ کا بھی اس موقع پر موجود ہونا ضروری ہے۔

ٹکنیکل (فنی) امداد یورپ بڑے بڑے ممالک، خصوصاً اٹلی سے، حاصل کی جاسکتی ہے، اور سڑکوں کی درستی، ریلوں کی تیاری، آب پاشی، بیج خریدنے کے لئے قرض، اور زراعتی مشینوں کے لئے سرمایہ اُن ممالک سے آنا ضروری ہے جو افیون کے انسداد میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ کم مقدار میں افیون پیدا کرنے والے غریب ممالک سے اس تمام نقصان کو برداشت کرنے کی کس طرح توقع کی جاسکتی ہے جب کہ بکثرت استعمال کرنے والے مالدار ممالک (جو خاص نفع حاصل کرتے ہیں) امداد نہ کریں۔ امریکہ کو چاہئے کہ وہ ہر چیز کے فوری انسداد کا شاعرانہ خیال ترک کردے کہ یہ کلیتہً ناقابل عمل ہے۔ مہمات امور میں طریقہ کار بتدریج ہونا چاہئے اور موقت مشکلات کو نہایت احتیاط سے حل کرنا چاہئے۔

مسئلہ افیون کا مرض کی طرح علاج کرنا مناسب ہوگا، جس پر پوشیدہ جرات کے ساتھ حملہ کرنا بہتر ہوگا۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ تقریباً ۲۵ لاکھ پونڈ افیون کو قطعی نیست و نابود کرنے کے لئے درکار ہوں گے۔ چونکہ قائم مقام فصلوں کو رواج دیکر ملک کو وسیع بنانے پر ایران کی اقتصادی ترقی کا بہت کچھ انحصار ہے۔ اس لئے اس طریقہ سے لگایا ہوا سرمایہ ملک کی بڑھتی ہوئی مرفہ الحالی کے موقع پر وصول کیا جاسکتا ہے۔ اس مسئلہ کا غیر حکومتوں سے کوئی واسطہ نہیں ہے، بلکہ کسی خارجی حکومت کی مداخلت کو اہل ایران نہایت ناپسند کریں گے۔ اس کے ساتھ ہی کوئی وجہ نہیں ہے کہ غیر ملکی حکومتیں ایک منظم اور باقاعدہ خانگی مہم کے لئے مالی امداد نہ دیں۔

اگر میں نے افیون کے مسئلہ کا طوالت کے ساتھ ذکر کیا ہے تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ایران کی موجودہ حالت کا اس سے بہت گہرا تعلق ہے۔

یہ میرا پختہ خیال ہے کہ ایران کا مستقبل اس کی آزادی کی سیاسی ترقی پر منحصر ہے، جس میں کسی کی مداخلت کا شائبہ تک نہ ہو۔ تاکہ ملک میں قومی اتحاد کی روح پھیل جائے۔ لیکن اس جذبہ اتحاد کو پیدا کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ آمد و رفت اور حمل و نقل کے لئے سریع السیر ذرائع مہیا کئے جائیں، صحیح اقتصادی مہم کے لئے جہاں ضرورت ہو غیر ملکی آزمودہ کار ماہرین فن کی ہدایت حاصل کیجائے، زراعت کو ملک کی بنیادی صنعت سمجھ کر اسکو ترقی دیکائے، اور افیون کی بجائے اسی کے برابر نفع والی فصل لگانے کے لئے بتدریج اور متواتر کوشش کیجائے جو پوست افیون کے پوشیدہ خطرات سے مُبرا ہو۔

ہندوستان اور اُس کی زبانیں

(مترجمہ جناب مولوی عبدالستار صاحب رضا فاروقی)

(گذشتہ سے پیوستہ)

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تبتی چینی زبانوں کے بولنے والوں کا اصلی مسکن یانگ ٹسی کیانگ اور ہوانگ ہو کے بالائی میدانوں میں تھا جہاں سے ہجرت کر کے وہ ہر چہار طرف پھیل گئے تھے۔ اس ہجرت کا جہاں تک ہندوستان سے تعلق ہے یہاں تین گروہ یکے بعد دیگرے دریائی میدانوں میں سے ہوتے ہوئے دریائے ایراوڈی اور سالون کے نشیب میں برما اور برہم پترا سے آسام میں سالوین کے فراز سے تبت میں اُتر آئے ان میں سے ہر گروہ نے اپنے پیشروؤں کو نیچے کی طرف ڈھکیل کر یا تو ساحل مقامات تک پہونچا دیا، یا کوہستانی علاقوں میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ برما اور آسام کے قدیم ترین آسٹرو- ایشیائی زبانوں کے بولنے والے یا تو پیگو کی آخری جنوبی سرحد کے ساحلی مقام میں پائے جاتے یا کوہستانی علاقوں میں منتشر تھے جہاں وہ حملہ آوروں کی زد سے محفوظ ہو گئے تھے۔

تبتی چینی شعبہ کی دو بڑی شاخیں سیامی چینی اور تبتی برمی زبانیں ہیں۔ ان میں سے جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، اول الذکر صرف برما میں رائج ہے جہاں کے دس لاکھ باشندے اسکو استعمال کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ شن قوم جسکی زبان سیامی اور اس کے ذریعہ چینی زبان سے بہت کچھ مخلوط ہو گئی ہے، یوننان سے آکر یہاں آباد ہو گئی تھی، اور اب وہ ایک اہم قوم بن گئی ہے ہمارے نزدیک موخر الذکر یعنی تبتی برمی کی دو بولیاں بڑی اہمیت رکھتی ہیں جو تبت، برما اور آسام کے بڑے حصوں اور مشرقی بنگال میں مروج ہیں۔ تمام ملک تبت اور اسکی مغربی سمت میں کشمیر تک اس کے بولنے والے پائے جاتے ہیں۔ اس کے جنوب میں کوہستان ہمالیہ واقع ہے اور اس سلسلۂ کوہ پر متعدد نوآبادکاروں نے تاخت و تاراج کر کے نیپال اور اس کے تمام جنوبی رُخ پر پنجاب تک قبضہ کر لیا ہے اگرچہ ہمیں اس قدیم ترین زمانہ کا علم نہیں ہے جبکہ ہندوستان پر پہلی مرتبہ حملہ آوری ہوئی تھی تاہم کئی صدیوں تک لوگ ہجرت کر کے یہاں آنے لگے تھے، اور ہم اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ آسام میں ایک زبردست تبتی برمی حکومت قائم ہو چکی تھی، اور تیرہویں صدی عیسوی میں سیامی چینی قبیلۂ آہوم نے آسام کو فتح کر لیا تھا۔ اس وقت سے

کئی ایک حملہ آور یکے بعد دیگرے یہاں ہمیشہ آتے رہے۔ آخری حملہ قوم کچن نے کیا تھا جس کو انگریزوں کی فتح بالائی برما نے ۱۸۸۶ء میں روک دیا تھا۔

تبتی چینی زبانیں مذکورہ بالا اسٹنائی سے بالکل برعکس واقع ہوئی ہیں۔ ان کی لغت میں تمام الفاظ واحد الہجا ہیں، یا وہ ایسے قواعد اور حروف صوتی پر مبنی ہیں کہ بعض زبانوں میں تو ایسے واحد الہجا کلمات کی تعداد ۵۰۰ یا ۶۰۰ سے زیادہ ممکن ہی نہیں ہے۔ باایںہمہ ان مفرد کلمات سے مرکب الفاظ بنانے کا ایسا عجیب طریقہ ہے جس کے ذریعہ اسمائے ذات بآسانی ادا ہو سکتے ہیں۔

اگر ہم برمی اور تبتی ان دو بڑی لٹریری زبانوں کو مستثنیٰ کردیں تو تبتی برمی شعبہ کی تمام بولیاں کوہستانی اضلاع تک محدود ہو جاتی ہیں۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ ایسے دشوار گذار ملک میں ہر قبیلہ اپنے ہمسایہ قبائل سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ اور اگر ایک دوسرے قبائل آپس میں ملتے جلتے بھی ہیں تو جنگ جویانہ طور پر کسی قطعۂ زمین پر بزور قوت سکونت پذیر ہونے کے خیال سے، یا جاڑے راستوں پر اپنے وحشیانہ جذبۂ خونریزی کو فرو کرنے کے لئے، یا پھر دوسرے قبائل کے آدمیوں کو انسانی قربانی کے لئے پکڑے جانے کی غرض سے۔ غرضکہ ان مختلف قبائل میں اختلاط اور میل جول کا وجود شاذونادر اور بہت مشکل سے ہوتا ہے علاوہ بریں ایک ایسی واحد الہجا کلمات والی غیر مرتب زبان، جس کے الفاظ مختلف حالات و اسباب مثلاً مذہبی اور سختی وغیرہ کے ماتحت بدل جایا کرتے ہیں، ہمیشہ تغیر پذیر رہتی ہے۔ تاریخ میں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ چند افراد اپنے قبیلہ سے جدا ہو کر ایک دور دراز پہاڑی پر آباد ہو گئے اور ایک یا دو نسلیں گذرنے کے بعد ہی ان دونوں کی زبانوں میں اسقدر تفاوت ہو گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کی زبان سمجھنے سے قاصر ہو گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قبائل کی زبانیں مختلف بولیوں، اور بولیوں سے مختلف زبانوں میں منقسم ہو جایا کرتی ہیں۔ ٹھیک یہی حال تبتی برمی زبانوں کا رہا ہے جو تعداد میں تو ۱۲۰ ہیں مگر ان میں سے تبتی اور برمی زبانوں کو چھوڑ کر ہر ایک زبان کے بولنے والوں کی تعداد کا اوسط صرف ۱۷۰۰۰ ہے جو بہت مختصر ہے۔

ان زبانوں کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں اسم اور فعل کا خیر سے وجود ہی نہیں ہے۔ مثلاً اگر ہم انگریزی میں یہ کہیں کہ "My hand is strong" (میرا ہاتھ مضبوط ہے) تو یہاں لفظ Hand اسم ہوگا۔ اور اگر ہم یوں کہیں کہ "Hand me this"

(مجھے یہ دیدو) تو یہاں وہی لفظ فعل ہو جاتا ہے۔ اس قسم کی مثالیں انگریزی میں بہت شاذ ہیں۔ لیکن تبتی برمی زبانوں کا یہ حال ہے کہ ان کا ہر لفظ اسم اور فعل ہوتا ہے۔ مثلاً اگر ہم کو یہ کہنا ہے کہ "میں گیا" تو اسکو اس طرح کہیں گے کہ "میرا جانا ختم ہوا"، جس میں جانا اور ختم دونوں مستقل لفظ ہیں جو نہ اسم ہیں نہ فعل مگر موقع و محل کے لحاظ سے دونوں ہو سکتے ہیں۔

تبتی برمی شعبہ کی بعض زبانوں میں اسم اور فعل کا امتیاز نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ اسمائے عام کی ادائگی سے قاصر ہو گئی ہیں۔ تبتی اور برمی زبانیں جن میں ادبی ذخیرہ موجود ہے بعض طریقوں (اشارات و اصوات) سے ایک حد تک اس نقص سے پاک ہو گئی ہیں، مگر ابھی چین اور بنگال کے درمیان پہاڑی ملک میں قبائل کی غیر ترقی یافتہ بولیوں میں یہ نقص ابتک موجود ہے۔ بلکہ ہمیں یہاں ایسے قبائل بھی ملتے ہیں جن کی زبانیں عام اصطلاحات کو ادا کرنے سے قاصر ہیں، اور اُن کا ذخیرۂ الفاظ صرف اسمائے ذات تک محدود ہے۔ ان میں اکثر زبانیں ایسی بھی ہیں، جن میں آدمی ایسے معمولی اسم عام کا مترادف لفظ بھی نہیں ہے۔ انگریز، سنگ فو، میکز، گارو کے لئے ان میں الفاظ مل جائیں گے، لیکن آدمی کے لئے کوئی لفظ نہ ملیگا۔ اسی طرح ان میں ایک لوشئی (Lushai) زبان ہے جس میں نو قسم کی چیونٹیوں کے نام تو پائے جاتے ہیں لیکن عام "چیونٹی" کے لئے کوئی لفظ نہیں ہے۔

ایسے الفاظ جن سے رشتہ داری یا اعضائے جسمانی کا اظہار ہوتا ہے ان کا شمار اسمائے عام میں ہے، عام طور پر لفظ "باپ" (جو کسی خاص شخص کا باپ نہیں ہے) ایک خیال ہے جو کسی قدر غور و خوض چاہتا ہے ایسے مفرد کلمات کا استعمال تبتی برمی زبانوں میں نہیں پایا جاتا۔ مگر باستثنائے چند ہمیشہ کسی نہ کسی شخص کے ساتھ منسوب ہو کر استعمال ہوتا ہے۔ ان زبانوں میں "میرا باپ"، "تیری ماں"، "اُس کا ہاتھ" وغیرہ فقرے آپ کو ملیں گے، مگر صرف ماں، باپ، یا ہاتھ کہیں استعمال ہوتا نظر نہ آئیگا۔ اکثر تبتی برمی زبانوں میں ہم ان فقروں کا لفظی ترجمہ کرنے سے قاصر ہیں۔ مثلاً:-

"باپ فطرتاً مہربان ہوتا ہے"۔ ایک ہاتھ میں پانچ انگلیاں ہوتی ہیں۔

(باقی دارد)

مترجمات

لاسلکی کا اصلی موجد

مشہور پندرہ روزہ رسالہ (Woman Engineer) میں "تلغراف النّاسخہ" (Type Printing Telegraphy) کے موجد ڈیوڈ ایڈورڈ ہیوجز پر ایک دلچسپ مضمون پروفیسر اسپونر (Spooner) کے قلم سے نکلا ہے، ہیوجز دراصل خاندانِ ویلیش کا ایک نوجوان تھا جو ۱۸۳۱ء میں لندن میں پیدا ہوا تھا - حالت نوعمری میں اس کے والدین اُسے ممالک متحدہ (امریکہ) میں لیگئے - وہاں اس نے سائنس اور موسیقی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی، اور ایک روز جبکہ وہ پیانو بجا رہا تھا اس کے دل میں تلغراف النّاسخہ کی ایجاد کا خیال پیدا ہوا - چنانچہ اُس نے مائیکروفون[1] (Microphone) ایجاد کیا اور اس کے ذریعہ سے وہ ٹیلیفون کی تکمیل میں کامیاب ہوگیا - پروفیسر اسپونر رقمطراز ہیں کہ :-

"مائیکروفون کی ایجاد نے اس کو بعض قیمتی اور اہم تحقیقات کی طرف متوجہ کردیا اور ۱۸۷۹ء میں اس نے اپنی دو بیش بہا ایجادوں "میزان امالۂ برقی" (Induction Balance) اور آلۂ آوازپیما (Sonometer) کا اعلان کیا - اور اسی سال کے آخر میں اس نے امواج برقی منسوب بہ ہرٹز (Hertz) کو ہرٹز سے پہلے، آلۂ کوہیرر[2] (Coherer) کو برانلی (Branly) سے پہلے (جیسا کہ ہیوجز نے اپنے ایک مضمون میں بیان کیا ہے، جو اُس نے بتاریخ ۸ رمئی ۱۸۷۸ء میں رائل سوسائٹی کے سامنے پیش کیا تھا) اور لاسلکی کو لاج (Lodge) اور مارکونی (Marconi) وغیرہ سے قبل دریافت کرلیا تھا - مگر بدقسمتی سے کیمبرج کے مشہور ریاضی داں اور اعزازی ناظم رائل سوسائٹی سرجارج اسٹوک سے "دماغ پر برقی رَو پیدا کرنے" کے نظریہ میں اختلاف رائے ہوجانے کے باعث یہ عظیم الشان انکشافات غیر معروف رہے - ہیوجز اس بات کو اپنی شکست خیال کرکے اسقدر پست ہمت ہوگیا کہ اُس نے مسائل مذکورہ پر جو مضمون رائل سوسائٹی

---

۱ وہ آلہ جس کے ذریعہ سے باریک سے باریک آواز سُن لیجائے - ۲ یہ آلہ ایک ٹیوب کی شکل کا ہوتا ہے اور دھات کی پتیوں سے بنایا جاتا ہے جسمیں امواج کہربائی گذرتے ہیں تو اس ٹیوب کی برقی مقاومت کو بہت کچھ گھٹا دیتے ہیں ۱۲

کے لئے تیار کیا تھا اس کے پیش کرنے سے صاف انکار کردیا۔ چنانچہ اس ہوائی تلغراف لاسلکی (Aerial Wireless Telegraphy) کا مہتم بالشان انکشاف تقریباً ۲۰ سال تک معرض خفا میں رہا۔ مگر ہیوجز نے ان مسائل سے متعلق اپنی تحقیقات کا سلسلہ ۱۸۸۶ء تک برابر جاری رکھا۔"

"یہاں یہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ رسالہ الکٹریشین (Electrician) کے اڈیٹر کی استدعا پر ہیوجز نے تحقیقاتِ لاسلکی کے متعلق اپنی کامیابیوں کی روداد قلمبند کردی جو خوش قسمتی سے تاریخی اغراض کے لئے رسالہ مذکور مورخہ ۵ رمئی ۱۸۹۹ء میں شائع ہوگئی ہے۔ اسی طرح رسالہ الیکٹریکل ریویو مورخہ ۱۲ر جون ۱۸۹۹ء میں ایک مضمون ہیوجز کی تحقیقات و اختبارات لاسلکی کی تعریف میں شائع ہوا تھا۔

۱۸۷۷ء سے ہیوجز کا سلسلۂ تحقیقات ایک طویل داستان ہے۔ جن کی بدولت اس کو "ہوائی امواج کہربائی" (Aerial Electric Waves) یا "لاسلکی" کے ذریعہ پیغام رسانی میں کامیابی ہوئی۔ المختصر ہیوجز ۵۰۰ گز کے فاصلہ تک پیغام رسانی میں کامیاب ہوگیا۔ مگر ایک میل کے بعید فاصلہ تک اس کے اشارات صاف طور پر معلوم نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ کثرت غاز (گیس) اور متعدد پانی کے نل بیچ میں مزاحم ہوکر اس کی لہروں کو جذب کرلیتے یا کمزور بنا دیتے تھے۔ خوش قسمتی سے ہمارے پاس ناقابل تردید شہادت اس بات کے ثابت کرنے کے لئے موجود ہے کہ ہیوجز، اور صرف وہی اس "ہوائی برقی تلغراف" کا موجد اور بانی تھا۔"

"اگرچہ یہ عالی دماغ شخص اپنی تحقیقات کی اوّلیت جتانے میں ہمیشہ کسر نفسی کیا کرتا تھا تاہم وہ دوسروں کے کارناموں کی بڑی فیاضی سے داد دیتا تھا۔ چنانچہ مارکونی کی دماغی قابلیت کا وہ بڑا مداح اور معترف تھا۔

(ریویو آف ریویوز)

حروف تہجّی کی اصلیت

جدید عہدِ حجری کے کتبات

لیون یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر اے۔ موریل نے وہاں کی "انجمن کتبات" کو مندرجۂ ذیل سوالات لکھ کر بھیجے ہیں:-

(۱) کیا زمانۂ قبل التاریخ کا انسان پڑھ لکھ سکتا تھا؟

(۲) کیا اسی نے موجودہ حروف تہجی ایجاد کئے ہیں؟

(۳) ہمیں معلوم ہے کہ عہد حجری کے لوگ صناع اور کاریگر تھے، انکی بنائی ہوئی فیل شعرانی (mammoth) اور برفانی بارہ سنگھے (Reindeer) کی رنگین اور منقش تصاویر آج بھی غاروں اور تہ خانوں میں محفوظ ہیں۔ مگر کیا وہ علمی وادبی مذاق بھی رکھتے تھے؟"

حال ہی میں مقام گلوزل (Glozel) کے آثار قدیمہ کھودے گئے ہیں جن میں سے آلات، اسلحہ اور ظروف برآمد ہوئے ہیں، نیز پتھر کے بعض کتبات سے (جن کی نسبت ڈاکٹر موصوف کا دعویٰ ہے) یہ ثابت ہوتا ہے کہ عہد حجری کے انسانوں نے حروف تہجی کا استعمال کیا تھا۔

اُن دنوں، جبکہ برفانی بارہ سنگھے ملک فرانس میں پھرا کرتے تھے، عہد قبل التاریخ کے انسان اپنے خیالات کا اظہار "حروف لفظی" سے کیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر موریل نے تقریباً نوّے حروف اس قسم کے دریافت کرلئے ہیں۔ اُن کی دلیل یہ ہے کہ فینیقیا والوں نے درحقیقت اپنے حروف جدید عہد حجری (Neolithic) کے قبائل سے مستعار لئے تھے جیسا کہ ان دونوں کی قریبی مماثلت سے معلوم ہوتا ہے موسیو شالومان لیناش ڈاکٹر موریل کے اس نظریہ کی تائید کرتے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف نے خاص طور پر مقام گلوزل کا سفر کیا اور مٹی کے ایک طبقہ سے برآمد شدہ ایک لوح کا بچشم خود معائنہ کیا۔ انکا بیان ہے کہ ان آثار قدیمہ میں کسی رومی یا گالی ظروف فلزی کا نشان تک نہیں پایا گیا۔ تقریباً پچاس تختیوں پر تحریر کی باقاعدہ سطریں منقوش ہیں جن میں سے بعض فینیقی اور قدیم ترین یونانی حروف سے حیرت انگیز مشابہت رکھتی ہیں اگرچہ ان کے متن کو پڑھنا ناممکن ہے۔ آجکل اس نظریہ پر گرمجوشی سے علمی بحث چھڑی ہوئی ہے۔

گاؤکشی

شدھی اور سنگھٹن کے علمبردار سوامی شردھانند نے اپنے رسالہ (Liberator) (الناجی) میں گاؤکشی پر ایک مضمون تحریر کیا ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:-

"گاؤکشی کے متعلق ہندوں کا طرز عمل مجھے ہرگز پسند نہیں آیا۔ میرا خیال ہے کہ ہندوستان

میں سال بھر میں تیس ہزار سے زیادہ گایوں کی قربانی نہیں کیجاتی۔ ایک مُسلمان مذہبًا یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ ایک گائے کی قربانی سات مُسلمانوں کو بہشت میں لیجائے گی۔ مگر تقریبًا دس لاکھ گائیں اور بیل ہر سال فوجی چھاؤنیوں میں برطانی افواج کے لئے ذبح کیجاتی ہیں۔ تقریبًا ۱۵ لاکھ ہندوستان کے عیسائیوں اور مُسلمانوں کے لئے اور چالیس لاکھ کے قریب بیف (گائے کا گوشت) اور چمڑے کی تجارت کے لئے ذبح ہوتی ہیں۔ پھر ان سب گاؤکشیوں پر ایک ہندو کو کیوں اذیت نہیں پہونچتی؟ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ مُسلمان قربانی کے جانوروں کی ایسی نمائش کرتے ہیں جو طیش انگیز ہوتی ہے اور اس لئے ہندو چراغ پا ہوتے ہیں لیکن پچیس لاکھ گائیں اور بیل کھلے راستوں پر سے مذبح میں ہنکا لیجاتے ہیں۔ پھر ان ہزارہا گایوں کی نمائش سے وہ کیوں برانگیختہ نہیں ہوتے؟ مُسلمان (ہندوؤں کے خیال میں) اپنی نادانی سے یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایک مذہبی ثواب کا کام کر رہے - لیکن ہمارے ایک نادان بھائی کے کسی فعلِ نادانی پر ہمیں برانگیختہ ہونے کا کونسا موقع ہے؟ ہندوؤں کو اپنے بھائیوں کے لئے خدا سے دُعا کرنی چاہئے اور اون کو سمجھانا چاہئے کہ انسانی جذبات اور نفسانی خواہشات کی قربانی۔ نہ کہ خون اور گوشت کی قربانی۔ صرف خدا کے نزدیک مقبول ہوسکتی ہے - اور نفرت کی بجائے ہمیں ان کے ساتھ محبت اور ہمدردی سے پیش آنا چاہئے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ روش اختیار کی گئی تو نہ صرف ہندوؤں کو چڑھانے کا یہ طرزِ عمل ہمارے مسلمان بھائیوں کے دلوں سے نکل جائیگا بلکہ وہ سنجیدگی سے اس امر پر غور کریں گے کہ آیا گائے کی قربانی مذہبی حیثیت سے ضروری بھی ہے یا نہیں۔ تین چار سال سے یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ ایک بکرا دس روپیہ سے کم پر نہیں خریدا جاسکتا۔ مگر ایک گائے جو بیس روپیہ کو خریدی جائے سات آدمیوں کی طرف سے قربانی کے لئے کافی ہوتی ہے - اس کے لئے میری تجویز یہ ہے کہ تمام ہندو قطعًا گوشت کھانا چھوڑ دیں۔ تب بکرے وغیرہ ارزاں ہوجائیں گے۔ اور مُسلمان اپنے بوڑھوں اور بچوں کو گائے کے دودھ سے (جو ماں کے دودھ سے بڑھ کر ہے) محروم نہ رکھ سکیں گے۔"

سوامی جی کی اس تجویز سے ان کے ہم مذہبوں کو اتفاق ہو یا نہو مگر ہمیں ان سے کلی اتفاق ہے۔ لیکن کیا سوامی جی نے اس کے امکان وعدم امکان پر بھی غور فرمایا ہے؟ ہمیں امید ہے کہ برادرانِ وطن ہمارے لئے ضرور خدا سے دُعا کریں گے لیکن دعا کی استجابت کے لئے بھی سوامی جی نے کوئی عمل بتلا دیا ہوتا تو بہتر ہوتا!

حضرت مسیح ہندوستان میں

بمبئی کی بدھ سوسائٹی کے ناظم اعزازی کو مندرجۂ ذیل اطلاع امریکہ سے بذریعۂ تار موصول ہوئی ہے :-

امریکہ کے ایک نامور ماہر اثریات پروفیسر لاورِیچ (Roerich) جو امریکہ کی ایک جماعت کے ساتھ وسط ہند میں علمی و اثری تحقیقات میں مصروف ہیں، اطلاع دیتے ہیں کہ ان کو تبت کی کسی خانقاہ میں ایک قلمی کتاب دستیاب ہوئی ہے، جس میں حضرت یسوع مسیح کا بودھ مذہب سے واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے ہندوستان میں تشریف لانا بیان کیا گیا ہے۔ آپ نے ہندوستان کی سیاحت کی اور تبلیغ کرتے رہے پھر یروشلم (بیت المقدس) واپس تشریف لے گئے۔

یہ تھیوری صحیح ہو یا نہ ہو مگر ہے ضرور دلچسپ۔ دیکھیں پروفیسر موصوف اس کے ثبوت میں کونسی واضح اور مفصل دلائل پیش کرتے ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک ان ہر دو مذاہب میں بعض وجوہ اشتراک کی بنا پر بودھ مذہب عیسائیت کا ماخذ اور اصل ہے۔ اگر صرف یہی وجہ اشتراک ایک مذہب کے دوسرے مذہب سے ماخوذ ہونے کے لئے کافی خیال کرلی جائے تو بنیادی اصول مذہبی کے لحاظ سے دنیا کے تمام بڑے مذاہب کے ایکدوسرے سے ماخوذ ہونیکا دعویٰ کیا جاسکتا ہے۔

اکبر کا مذہب

(عہد مغلیہ کی تصاویر سے)

ریورنڈ پادری ہیراس نے جو سینٹ زیویر کالج (بمبئی) میں تاریخ کے پروفیسر ہیں مغلیہ تصاویر اکبر کے مذہبی مباحثات پر " کے عنوان سے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے ایک جلسہ میں بزیر صدارت سر للّو بھائی شاہ نے ایک دلچسپ لکچر دیا تھا۔ جسکا ملخص حسب ذیل ہے :-

ابتدا میں مقرر نے کہا کہ وہ صناعی نقطۂ خیال سے اس موضوع پر کچھ نہیں کہے گا۔ بلکہ وہ صرف ان تصاویر پر سے اکبر کے مذہبی مباحثات پر ایک تاریخی تبصرہ پیش کرنا چاہتا ہے۔ مقرر نے کہا کہ یوں تو تمام تاریخ دستاویزی سندات پر مبنی ہوا کرتی ہے مگر نقوش و تصاویر بھی مستند دستاویزیں ہونیکے

لحاظ سے استناد کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے بعد اس نے بیان کیا کہ :۔

اکبر ایک صوفی مزاج بادشاہ تہا۔ اس نے دیکھا کہ ہندوستان کا اتحاد تمام تر مذہبی اتفاق پر منحصر ہے لہذا اس لئے مذہبی مباحثوں کو ترقی دی متعدد تواریخ سے اس واقعہ کی تائید ہوتی ہے۔ اس کا مزید ثبوت اس "عبادتخانہ" سے ملتا ہے جسکو اکبر نے ان مباحثات کے لئے تعمیر کرایا تھا۔ وہاں تمام مذہب کے نمائندے ہندو، پارسی، عیسائی، مسلمان، جینی اکبر کی سرپرستی میں جمع ہوتے تھے۔ سنہ ۱۵۷۳ء سے سنہ ۱۵۷۹ء تک اکبر ہندو مذہب کے زیر اثر تھا جس کی وجہ راجپوت کماریوں کے ساتھ اس کا عقد اور بیربل کی مصاحبت تھی اور دستور مہرجی رانا کے دربار اکبری میں شامل ہونیکی وجہ سے زردشتی مذہب کا اثر اکبر پر پڑا چنانچہ یہ کہا جاتا تھا کہ اگرچہ اکبر اپنے دل سے ایک صوفی ہے مگر وہ رسوم مذہبی کے لحاظ سے پارسی ہو گیا ہے یہ اثر سنہ ۱۵۸۰ء سے سنہ ۱۵۸۳ء تک قائم رہا۔ پھر اکبر نے اپنے دربار میں تین یسوعی پادریوں کو بلایا۔ چنانچہ سنہ ۱۵۸۳ سے سنہ ۱۵۸۷ء تک اس کا میلان عیسائیت کیجانب رہا۔ فادر مونسٹراٹ اور فادر اکوادیوا مشہور عیسائی تھے جنہوں نے اکبر پر یہ اثر ڈالا تھا۔

اس کے بعد مقرر نے ان تین تصویروں کو جو عبادتخانہ کی تھیں پیش کیا۔ یہ تصاویر پونا سے ہاتھ لگی تھیں جہاں غالباً عہد پیشوا میں آگرہ سے لائی گئی تھیں۔ ان تصاویر میں ایک درختوں سے گھری ہوئی چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں اکبر مختلف مذاہب کے علماء کے بیچ میں بیٹھا ہوا ان کے مباحثہ میں سرگرم نظر آتا ہے۔ مقرر کا قیاس ہے کہ یہ پہاڑی کہیں فتحپور کے قریب ہوگی۔

قطعہ

سر کے ہمراہ ہے ساماں کی گرانباری بھی
تام کے ساتھ دیا مجھکو نشاں بھی تو نے
جان ہی آفت جاں تھی کہ ملی غرت بھی
پیٹ کیا کم تھا، کہ دی اس پہ زباں بھی تو نے

امجد (از حیدر آباد)

ادبیات

حقیقت مجاز

(از جناب ابوالخیال قاضی امانت علی صاحب تسکین بٹالوی)

(۱)

ریل گاڑی آہستہ سے چلدی۔ کسی کی حسرت بھری نگاہیں پلیٹ فارم کے ایک کونہ سے اُچٹ اُچٹ کر پہلے ایک گاڑی۔ پھر دوسری، تیسری۔ چوتھی اور پھر گارڈ صاحب کی گاڑی سے ٹکراتی ہوئیں اپنے ہاتھ کی ہتھیلیوں سے رُک گئیں۔ ہاتھ اک لمحہ کے لئے آنکھوں سے پھر جُدا ہوئے۔ نگاہیں ایک دفعہ پھر اُٹھیں۔ گاڑی بہت دُور نکل چکی تھی۔ انجن کے سیاہ دہوئیں کے خفیف سے نشان آسمان پر کہیں کہیں نظر آرہے تھے اور بس۔ محویت کا یہ عالم کہ ایک منٹ، دس منٹ، بیس منٹ گذر گئے پلیٹ فارم کا کونہ نہیں چھوڑا۔ کانپتا ہوا ہاتھ کوٹ کے اندر کیطرف گیا۔ جیب سے ایک چھوٹی سی تصویر نکالی۔ آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آنکھوں نے اُسے غور سے دیکھا گویا تصویر کا چہرہ دُھندلا تھا دوسرے ہاتھ کے رومال سے تصویر کو مصفا کیا مگر تصویر ویسی کی ویسی بلکہ کچھ اور زیادہ دہندلی تھی۔ اتنے میں خاکروب نے جو اپنے جھاڑو کے پلیٹ فارم سے مسافروں کے پھینکے ہوئے پتے۔ کاغذ۔ سگریٹ کی خالی ڈبیاں صاف کررہا تھا۔ محمود کو ایک طرف ہٹ جانیکو کہا، اُس کے لبوں سے کچھ بڑبڑاہٹ کی آواز آئی۔ خاکروب مُسکرایا۔ اور میاں محمود اپنا پلیٹ فارم ٹکٹ۔ گیٹ بابو کو دیکر لاہور اسٹیشن کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے باہر نکل آئے۔

(۲)

دہلی ابھی دور تھی۔ ہر ٹھہرنے والے سٹیشن پر جہاں میل گاڑی ٹہرتی۔ عذرا کی نگاہیں اپنے برقعہ کی جالیوں سے چھن چھن کر اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر ہر پہنچنے والے نوجوان پر پڑتیں اُسے خیال تھا کہ شاید محمود چلتی گاڑی میں سوار ہوکر اُس کے ساتھ ساتھ آرہا ہوگا۔ کیونکہ عذرا کو ایک شریف جنٹلمین بلا تنخواہ کے نوکر کی ضرورت تھی جو اُسکے لئے ہر موقعہ ہر جگہ پر اشتہار کا کام دیتا اور وہ فقط محمود ہی اُس کی اس خاص ضرورت کو پورا کرسکتا تھا اور ساتھ

ہی اس کے وہ ہر اسٹیشن پر اترتا۔ اچھی اچھی مٹھائی۔ عمدہ عمدہ پھل سگرٹ وغیرہ عذرا کے کمپارٹمنٹ تک پہنچاتا۔ عذرا خوش ہوتی..... مگر افسوس محمود گاڑی میں موجود نہ تھا۔ شاید وہ اس کے ہمراہ دہلی چلتا اگر عذرا اُسے ایک مرتبہ بھی اپنے ساتھ لے جانے کو کہتی۔

عذرا علم موسیقی میں کمال رکھتی تھی۔ چہرہ پر وہ نکھار موجود تھا جو دیگر بازاری حُسن سے بدرجہا بہتر سیرت صورت دونوں دلفریب تھیں۔ لاہور ہی میں نہیں دور دور تک شہرت پھیلی ہوئی تھی نواب اکرم بیگ کی شادی کی تقریب پرخاص طور سے بلائی گئی تھی۔ قدرت نے اچھا کیا کہ محمود اس وقت عذرا کے ہمراہ نہ تھا ورنہ کوئی اُسے اوباش، کوئی ناٹک کا دل فریفتہ ایکٹر اور کوئی رنڈی کی اداؤں کا کشتہ کہتا۔

(۳)

محمود سر ڈالے رواں رواں سیدھا گھر پہنچا۔ وہ گھر جہاں اُس نے گذشتہ چھ ماہ کے عرصہ میں قدم تک نہ رکھا تھا بہنوں نے سلام کیا۔ ماں دیکھتے ہی بسم اللہ کہہ کر اُٹھی۔ دوڑی گلے چمٹ گئی۔ بلائیں لیں۔ منہ۔ سر چوما۔ پیار کیا۔ ماں کے لئے ہزار لاکھ خوشی کی یہ ایک گھڑی تھی کہ بیٹا خود بخود گھر آیا مگر...... اُس کو ان باتوں سے کیا سروکار تھا۔ ماں کے متبرک ہاتھ گلے سے جھٹکے۔ نفرت کی نگاہ سے دیکھا اور اُسے وہیں دالان میں چھوڑ اپنے اُس اوپر والے کمرہ میں آیا جو کبھی اُس کی آرامگاہ تھی۔ دم پھولا ہوا تھا۔ سر چکرا رہا تھا۔ اوسان خطا تھے۔ دھم سے ایک خاک آلودہ پلنگ پر اوندھا گر پڑا۔ ماں کو اتنی طاقت کہاں تھی کہ دوبارہ بیٹے کے پاس آتی۔ جھڑکیاں سنتی حال پوچھتی۔ دل کی آگ کو ٹھنڈا کرتی۔ بیچاری اتنی ہی خوشی میں کہ بیٹا خیر وعافیت سے گھر آگیا ایک خط اپنے بھائی کے نام جو سیالکوٹ میں آنریری مجسٹریٹ تھا لکھ بھیجا کہ محمود اب تندرست اور روبصحت ہے۔ بڑے ہسپتال سے ڈاکٹر نے گھر آنے کی اجازت دیدی ہے۔ کالج کی تعلیم بھی بدستور جاری کر دیگا۔ ماں تھی شاید اتنا جھوٹ لکھنا گوارا کرتی آخر کیوں نہ لکھتی ان تمام موہوم کے ساتھ ایک اُمید منسلک تھی کہ بھائی کی رضامندی کی نظر اس کے رشتۂ حیات کو اور زیادہ کچھ مدت زندہ رہنے دے گی۔

ادھر محمود حالت اضطراب میں پڑا کروٹ پر کروٹ لے رہا تھا۔ سینہ میں ایک ہوک اُٹھتی تھی اور ساتھ ہی جسم کو ٹھنڈا کر دیتی تھی۔ آنکھوں کے سامنے گذشتہ خیالات اُمنڈ اُمنڈ کر آرہے تھے۔ عذرا کے ساتھ دریا کی سیر کو نکلنا۔ سینما کی تصویریں دیکھنا۔ تھیٹر میں ریزرو صوفہ پر بیٹھنا گویا یہ سب مناظر ایک ایک کرکے دل پر چوٹ لگا رہے تھے۔ ابھی خیالات میں نہ معلوم کئی گھنٹے عالم سکوت میں پڑا رہا۔ آخر ایک سرد آہ بھری اور پلنگ سے اُٹھکر

ادہراُدہر کچھ تلاش کرنے کے بعد ایک بکس کو کھولا۔ چند خطوط نکالے جو اُسے عذرا نے عالم ابتدا میں اپنی محبت کا اظہار کرتے ہوئے اور اُسے بیوفا کے نام سے موسوم کرتے ہوئے قلمبند کئے تھے۔ یہ سب عذرا کا داؤ پیچ تھا جس کو محمود بالکل نہ سمجھا خط آنکھوں کے سامنے آتے ہی ایک غبار سا اوٹھا۔ دونو انگلیوں سے آنکھوں کو دبایا۔ دو موٹے موٹے پانی کے قطرے آنکھوں سے نکل کر اخساروں سے ہوتے ہوئے قمیص پر جذب ہو گئے۔ اور خط کا پرچہ الٹا سینہ پر چسپاں کر دیا۔ گویا وہ مجسم عذرا ہے جسے وہ سمٹ سمٹ کر تنہائی میں پیار کر رہا ہے یہ موہوم تھا اور سراسر اتہام۔ نوجوانی کی غلط کاریاں تھیں اور بداعمالیوں کی روش۔

چاہئے تھا کہ عذرا کے ان مختلف پرچوں سے محمود کچھ سبق حاصل کرتا مگر اُسے اور بھی صداقت ہوگئی کہ اُس کی محبت کے جواب میں عذرا بہت حد تک صداقت رکھتی ہے۔ محمود۔ عذرا کا فریفتہ جمال اور شکار محبت ہو چکا تھا اور حق تو یہ ہے کہ بغیر اس کے اب صبر و سکون دشوار اور محال تھا۔

(۴)

عذرا کو دہلی کے اسٹیشن پر آؤ بھگت سے اُتار اگیا۔ علیحدہ ایک وسیع کوٹھی میں رہنے کو جگہ تھی۔ عذرا اکیلی نہ تھی۔ ساتھ بوڑھی اماں۔ ایک چھوکرا اور دو دو لالہ۔ اوستاد طبلچی بیسیوں کی تعداد میں ہمراہ تھے۔

شام کے وقت خود نواب صاحب عذرا کی مزاج پُرسی کو حاضر ہوئے اور باتوں باتوں میں اس امر کا اظہار کر دیا کہ دہلی اہل زبان ہونے کے باعث مشہور ہے گانے میں کہیں ایسی بات نہ رہجائے جو ہر موقعہ یا بعد از وقت پشیمانی نصیب ہو۔

مگر عذرا کوئی نادان گانے والی رنڈی نہ تھی باسمجھ تھی۔ ذہین تھی۔ خوبصورت تھی حسن کو سنوارنا خوب آتا تھا۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ پڑھی لکھی تھی۔ ایک شریف مالدار نوجوان کو اپنے دامن محبت میں گرفتار کرنیکو اس میں سب سامان موجود تھے۔ دہلی کے گلی کوچہ میں عذرا کے گانے کی شہرت اور دہوم تھی۔ نواب صاحب اور بھی خوش تھے کہ آج سے بعد اُن کے احباب کے حسب منشا گانا ہوا تھا۔ عذرا نے علاوہ مزدوری اور انعام و اکرام کے اور بہت کچھ اس قلیل عرصہ میں کما لیا تھا۔ یعنی نواب اکرم بیگ کے چھوٹے بھائی نواب اکمل بیگ کو اپنی چال اور دلفریب اداؤں میں اسقدر پھنسا لیا تھا کہ ان دو چار دنوں میں وہ ہر سانس کے ساتھ عذرا کا نام لیتا۔ اوٹھتا بیٹھتا۔ عذرا کی تعریف کرتا۔ گانے کی محفل ختم ہو جانے کے بعد جب عذرا اپنی کوٹھی میں جاتی

تو نواب اکمل بیگ لوگوں کی نظریں بچا کر وہاں پہنچتا مگر کسی غیر معمولی حس و حرکت کی وجہ سے کوٹھی کے اندر داخل نہ ہو سکتا۔ اِدہر اُدہر ٹہلتا اور واپس ہو جاتا۔ مگر عذرا ان تمام باتوں سے بیخبر نہ تھی وہ اپنے کمرے کے جھروکوں سے یہ سب کچھ دیکھتی اور دیکھہ دیکھہ کر خوش ہوتی۔

عذرا کو واپس جانے کو کہا گیا۔ شام کے وقت جب عذرا معہ اپنے آدمیوں کے دہلی اسٹیشن پر پہنچی اور گاڑی میں سوار ہوئی تو اپنی مجسّم کامیابی کو دیکھہ کر فرطِ انبساط سے باچھیں کھل گئیں اور "آیئے نواب صاحب" کہہ کر کمپارٹمنٹ سے نیچے اتر آئی نواب صاحب نے اِدہر اُدہر دیکھہ کر عذرا کو الگ ہونے کے لئے کہا۔ ان دو چار منٹ کی ملاقات کی گفتگو کا یہ خلاصہ تھا کہ وہ اب عذرا سے کمال عشق اور محبّت رکھتا ہے اور بغیر اس کے اب اس کی زندگی یقینی طور پر بیکار اور بدمزہ رہے گی۔ عذرا نے بھی حسب ضرورت محبت کا معاہدہ کر لیا۔

مکّار عذرا نے اس بھولے ناتجربہ کار اکمل کی ہستی کو اپنے ڈوپٹے کے جھومتے ہوئے آنچل سے آخری الوداع کہی اور گاڑی ایک آن کی آن میں دہلی سے کئی منزل دور تھی۔

(۵)

"مجھے حجاب ادرا دب دونوں مانع ہیں کہ راز سربستہ اسطرح افشا کر دوں۔ مگر کیا کرتی مجبور تھی۔ تمہاری والدہ کے اس خط کی نقل جو چند یوم ہوئے میرے والد مکرم کے نام موصول ہوا اس پرچہ کے ہمراہ تمہاری اطلاع کے لئے بھیج رہی ہوں۔ یہ خط گو ادن کی بہن کا تھا مگر آجتک مضحکہ انگیز بنا رہا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان کو تمہارے متعلق ایک ایک بات کی خبر ہے اور جب سے تمہارا رشتہ اتحاد کسی بازاری رقاصہ کے ساتھہ ہوا ہے میرے والد نے میری شادی کا بندوبست کہیں اور جگہ کر رکھا ہے۔

مجھے سخت رنج ہے کہ میری وہ خواہشات جن کے پورا ہونے کی امیدیں محض تمہارے ہی ساتھہ منسلک تھیں یوں برباد ہو رہی ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ تم اپنی عقل سے کام لیتے اور جیسا کہ تمہاری باتوں سے ظاہر ہوا کرتا تھا میرے حاصل کرنے کے لئے ہر چند سعی کرتے۔ کالج کی تعلیم کو یوں نامکمل اور ادھورا چھوڑ دیا کہ فی زمانہ چار پیسہ بھی تمہاری قیمت نہیں ہو سکتی۔ میں حیران ہوں کہ اس رقاصہ کو ایک شریف نوجوان جس کے ساتھہ کسی غریب بے بس لڑکی کی امیدیں وابستہ تھیں تباہ کرنے سے کیا ملا۔ کیا وہ تمہارا ساتھہ دیگی؟ یہ ہو نہیں سکتا۔ اس کے لئے ایک چھوڑ سینکڑوں تم جیسے موجود ہیں۔

کسقدر تعجب انگیز ہے یہ منظر کہ تمہارے پاس اتنا اثاثہ بھی نہیں رہا کہ دو چار دن کے کھانے پینے کا

سامان بھی ہو سکے - اپنی بوڑھی اماں کو دیکھو اور اُس کے وہ دن بھی آنکھوں کے سامنے لاؤ جب اُس کا خاوند زندہ تھا - دیکھو اب کیا حال ہے - نصیباً سے پچھلی دفعہ معلوم ہوا تھا کہ بیچاری اس غم میں مردہ ہو رہی ہے -

غور کرو - تمہارے والد کو مرے ہوئے آج ایک سال مشکل سے ہوا ہوگا - وہ گھر جہاں دن رات ریل پیل ہاتھی گھوڑے ہنہناتے تھے آج وہاں خاک اُڑ رہی ہے - چالیس ہزار کی مالیت کا مکان ان دنوں میں جب بنکر تیار ہوا تھا اور آج جس کی قیمت کچھ نہیں ستر اسی ہزار ہو سکتی ہے صرف پندرہ ہزار پر نیلام کر کے اُس کمبخت رقاصہ کے گھر ڈال دیا، افسوس - تم نے اپنی والدہ کا کوئی زیور ایسا باقی نہیں چھوڑا جو اس وقت اُن بیچاری کے کام آسکے - جاؤ، اب بھی وقت ہے اپنی والدہ کے قدموں کو پکڑ لو اور اپنے قصوروں کی معافی مانگو - کالج کی تعلیم کو از سر نو پھر جاری کر دو -

تمہاری تعلیم کے لئے میرے والد تمکو کچھ نہ کچھ بھیج دیا کرتے تھے مگر جب سے اُنہیں تمہارے کارناموں کی خبر ہوئی ہے گھر میں حکم دے رکھا ہے کہ میری بہن کے گھر ایک کوڑی تک نہ جائے گذشتہ دو چار ماہ جو روپیہ تمہیں پہنچتا رہا وہ سراسر میری کوششوں کا نتیجہ تھا -

اغلب ہے اور تمہیں معلوم بھی ہو گیا ہوگا کہ میری شادی اسی ماہ کی آخری تاریخوں میں ہے اور جس سے میرا رشتہ زندگی منسلک ہونے والا ہے وہ بھی کوئی غیر نہیں -

اس خط کے جواب لکھنے کی فضول کوشش نہ کرنا ورنہ میری بے حرمتی ہوگی اگر ہو سکا تو میں کبھی کبھی بڑی اماں کو کچھ نذر بھیج دیا کروں گی -

اب آیندہ سے تمہاری ماموں زاد ہمشیر "صغرا"

(باقی دارد)

(تصحیح کی تصحیح)

ماہ اگست کے زبان میں حضرت شاہ عالم صاحب قدس اللہ کی سنہ ولادت و وفات غلط چھپ گئی تھی جس کی ستمبر نمبر کی "غلط آمیز تصحیح" کاتب صاحب کے خامۂ اعجاز رقم کی مرہون منت ہے لہذا ناظرین اس طرح درست فرمالیں سنہ ولادت ۸۱۷ھ سنہ وفات ۸۸۰ھ اور اس غلط نامہ میں جہاں "قوسین میں" لکھا ہے وہاں قوسین میں (خلیفہ جہانیان جہاں گشت) بنا لیجئے -

لطفِ نظّارہ

بہارِ باغ سے گو دل کو ہو جاتی ہے کچھ تسکیں — مگر جو بات دل میں ہے وہ گلشن میں نہیں ملتی
نگاہِ لطف فرما لاکھ ہو ممنونِ شادابی — نشاطِ روح کی لیکن کلی اس سے نہیں کھلتی

کسی معشوق صورت کو اگر میں دیکھ لیتا ہوں — تو آجاتی ہے دلمیں خو دبخود اک شانِ استغنا
اثر انداز اسکا حسن ہوگا کس طرح دل پر — کہ جس انداز کو دل چاہتا ہے وہ نہیں ملتا

نظر کے سامنے ہو ایک ایسا خوشنما منظر — کہ جسکی نزہت آگیں دلکشی پہ جان ہو شیدا
کہ جس کی روح پرور تازگی پر دل تڑپ جائے — بھرا ہو سبزۂ خود رو سے ایسا دامنِ صحرا

وہ صحرا جسکی وسعت - وسعتِ دل سے بھی بڑھ کر ہو — نہ پہنچے جس کی مضبوطی کو استقلالِ انسانی
چلی جائیں ہزاروں پیچ و خم سے گھاٹیاں جسکی — زیادہ زلف سے ہو راستہ میں جس کے حیرانی

وہ صحرا جس کے ہوں آغوش میں بہتے ہوئے چشمے — وہ چشمے جس سے ہو جنگل کی آبادی کو سیرابی
پڑی ہو اسطرح پھولوں کی چادر جس سے ظاہر ہو — کہ ان کے بارِ احساں سے جھکی جاتی ہو شادابی

نمایاں ہو سحر سے جب شفق گوں نور کا عالم — تو ہر اک چیز میں صحرا کے ہو انداز معصومی
بہارِ خورمی کیفیتِ قلبی پہ چھا جائے — مٹا دی خاطرِ آشفتہ سے اسباب محرومی

نشاطِ روح کے ہیں مرکزِ اصلی یہی جلوے — نہیں ہے دل کے بہلانے کا کچھ انکے سوا چارہ
یہی جلوے ہیں، جو کرتے ہیں پیدا ذوقِ روحانی — حقیقی طور پر حاصل ہے اُن سے لطف نظارہ

قیصر (بھوپال)

تضمین

نا اُمیدی کی ہزاروں ٹھوکریں کھاتا ہوا اُن کے کوچے سے چلا میں دل کو سمجھاتا ہوا
مشعل دانش سے دکھلاتا طریق نیک و بد

اس گلی سے جا چکا ہے بارہا ناکام تو، پھر بھی ہے محوِ فریب گردش ایام تو
ہو چکی رسوائیوں، ناکامیوں کی اب تو حد

ہو چکیں کتنی جفائیں تجھ پہ اے ناکامِ عشق مصلحت سے کام لے اور اب نہ لے تو نام عشق
دامِ اُلفت سے رہائی کے لئے کر "جہد جد"

دل نے برافروختہ ہو کر دیا ایسا جواب بن نہ آیا مجھ سے کوئی اُسکی باتوں کا جواب
مصرع اوّل پہ چمپت ہو گیا پیرِ خرد

مجھ کو مقتل بھی ہے، دامن بھی ہے نادان کوئے دوست میگریزم از جفائے دوست لیکن سوئے دوست
چوں شرر خونم نہاں در تیغ قاتل می شود

تلوک چند محروم

رباعیات

(زبان)

بک بک کی ہر اک شخص کی بیماری ہے کیا کیجئے مجبوری ہے لاچاری ہے
جاری رہتا تھا پہلے، دل عارف کا، اب دل کی جگہ، زبان ہی جاری ہے

ایضاً

چھوٹا سا یہ خنجر دل آزاری ہے زخم اس کا ہزار تیغ سے بھاری ہے
وہ نار سقر، کہ جس سے سب ڈرتے ہیں یہ سُرخ زباں اسی کی چنگاری ہے

ایضاً

صورت کی طرح طرز بیان اچھی ہے تاثیر نہیں، نہو، فغاں اچھی ہے
الفاظ بڑھے چڑھے مگر بے معنی دل چاہے خراب ہو زبان اچھی ہے

ایضاً

میرے لئے ہے خدا، جہاں تیرے لئے میرے لئے ہے مکیں، مکاں تیرے لئے
اے اپنی زباں پہ ناز کرنے والے دل میرے لئے ہے اور زباں تیرے لئے

امجد (حیدرآباد)

عاشق مجاز سے

عشق میں کس کے عاشق جانباز
رنگ چہرہ کا ہوگیا ہے زرد؟
کیوں ہے مغموم، کیوں ہے پژمردہ
ہر گھڑی کیوں ہے لب پر آہ سرد؟

سوکھ کر ہوگیا ہے کیوں کانٹا
کون سے گل سے تجھکو الفت ہے؟
کونسا ہے وہ لالہ رخ جس نے
کر دیا داغدار دل کو ترے؟

کون ایسی وہ چشم فتّان ہے
اتنا جس کے لئے تو حیراں ہے؟
کس کی کاکل میں تو ہوا ہے اسیر
کس کی زلفوں میں پا بجولاں ہے؟

کس کے رخسار پر تو ہے شیدا
کس زنخداں کی چاہ میں ڈوبا؟
کون ایسا ہے وہ پری تمثال
تیرے دل کو ہے جس نے موہ لیا؟

کیوں حسینوں پہ مر رہا ہے تو
کیوں پرستش تو اُن کی کرتا ہے؟
کس لئے سر کو اُن کے آگے جھکا
تیرگی اپنے دل میں بھرتا ہے؟

چھوڑ دے عشق یہ مجازی ہے
اسمیں ہے جان و مال کا خطرہ
نہیں حاصل بجز فضیحت کے
اسمیں ہوتا ہے آدمی رسوا

عشق صادق کی ہے اگر خواہش
اُس صنم سے تو لَو لگا اپنی
جس نے پیدا کیا تجھے انسان
اور مخلوق پر فضیلت دی

اختر جوناگڑھی

غزلیات

از جناب سید عابد علی صاحب عابد بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی
پلیڈر۔ لاہور

دل غیور شہید نیاز ہو نہ سکا — یہ آبگینۂ رنگیں گداز ہو نہ سکا
بہت بلند رہا رتبۂ وقار حرم — مگر صنمکدۂ گل طراز ہو نہ سکا
بھڑک رہا تھا مرے دل میں اک شعلۂ عشق — جو نذر ضبط ہوا۔ سرفراز ہو نہ سکا
دل نیاز کی تکمیل آرزو نہ ہوئی — شرار عشق بنا برق ناز ہو نہ سکا
سما گیا مری آنکھوں میں اشک خوں بنکر — جنون غم کا فسانہ دراز ہو نہ سکا
وقار حسن میں قایم رہی ادائے غرور — نظر فروز بنا دلنواز ہو نہ سکا
مری طرح سے غزل نغمہ ریز ہو نہ سکی — مری طرح سے کوئی گل طراز ہو نہ سکا
حرم کے گوشہ نشینوں میں جا رہا زاہد — حریف شوخی حسن مجاز ہو نہ سکا

کچھ اسطرح سے پلائی کسی نے عابد کو
نہیں کہی نہ گئی۔ احتراز ہو نہ سکا

(از جناب ابو الخیال قاضی امانت علی صاحب تسکین بٹالوی)

ضبطِ غم نے مضطرب کو اور مضطر کر دیا
لا دوا تھا جو مرض قلب و جگر میں بھر دیا

حُسن بخشا ناز بخشا حق نے مال و زر دیا
دل حسینوں کو دیا تو ظلم کا خوگر دیا

جان و دل میں راز غم کا آبلہ سا بھر دیا
ضبط کی تاثیر میں اک رنگ پیدا کر دیا

آؤ راہِ چشم سے آکر تم، دل میں رہو
پردہ داروں کے لئے اللہ نے یہ گھر دیا

خاک ہوتا اُن پہ میری آہِ سوزاں کا اثر
جب خدا نے ہی انہیں دل کی جگہ پتھر دیا

ہجر کی آتش میں جلنا دل کو بخشا عشق نے
جس سے جل جائے فلک وہ آہ میں اخگر دیا

حشر تک ساجد رہیگا آستانِ یار پر
اللہ، اللہ، باوفا، اللہ نے کیا سر دیا!!!

جانتے تھے راہِ الفت میں بھٹکنا ہے ہمیں
پھر بھلا کیوں اس کٹھن منزل میں ہمنے سر دیا

لے اُڑے عرشِ معلیٰ پر نہ کیوں شوقِ سخن
حق نے پروازِ تخیل کے لئے ہمسر پر دیا

از ناظم الاخلاق حضرت ذہین (حیدرآباد)

عشق تو نے مشکلوں کو مجھ پہ آساں کر دیا
میری ہر اک آرزو کو وقفِ حرماں کر دیا

آتشِ الفت کی حدت بن گیا یہ دودِ آہ
رازِ پنہاں تو نے سوزِ دل نمایاں کر دیا

خود کو بیگانہ سمجھ کر کہہ دیا یکتا اُسے
جلوۂ حُسنِ ازل نے مجھ کو حیراں کر دیا

زیست کی اُمید کب تھی کشتۂ انداز کو
اور کچھ دن عشق نے جینے کا ساماں کر دیا

دیکھتا تھا آنکھ اُٹھا کر حور کی جانب نہ میں
زالِ دنیا تو نے کیوں مجھ کو پریشاں کر دیا

رحمتِ باری کو دیکھا جوش پر میں نے ذہین
کثرتِ عصیاں نے جب مجھ کو پشیماں کر دیا

جناب منشی لشیشر پرشاد صاحب منور خلف حضرت آفق مرحوم لکھنوی

دل سے ایک آہ کی درد کا مزا لیا
صبر یوں ہزار بار ہمنے آزما لیا

صدقے اُس حبیب کے جو ہو درد آشنا
گر پڑا اگر کوئی دوڑ کر اُٹھا لیا

سوز و ساز عاشقی کچھ ازل سے تھا پسند
ہمنے خود ہی مانگ کر دل غم آشنا لیا

اسقدر ہے دہر میں بے وفائیوں کا زور
جل اسی نے دی ہمیں جسکا آسرا لیا

ذرہ ذرہ خاک کا مظہر جمال ہے
جس کی جستجو میں تھے اُسکو ہمنے پا لیا

آنکھ بند جب ہوئی عالم خیال میں
آستان یار کا دل نے راستہ لیا

خواہ رہکے آڑ میں خواہ آکے سامنے
کام اپنا آپنے ہر طرح بنا لیا

خون ہے خموش کیوں کشتگان ناز کا
کس نے اپنے ہاتھ میں خنجر جفا لیا

پاؤں ہے رکاب میں یہ بھی تو بتا ئے جا
تمنے رخت آخرت اپنے ساتھ کیا لیا

حسن بے نیاز نے دہمکیاں قضا کی دیں
جس نے انکے سامنے نام عشق کا لیا

بچ گیا منور آج ورنہ خیریت نہ تھی
درد اُٹھا تھا مگر ضبط نے دبا لیا

از خاکسار عبد الرحمن خوشتر منگرولی مدیر رسالہ ہذا

فلک ہے دیر سے تجویز میں بجلی گرانے کی
الٰہی خیر ہو آفت زدوں کے آشیانے کی

یہ مانا ہمنے حوران جناں بھی خوبصورت ہیں
مگر اُن میں کہاں ایسی ادائیں دل لبھانے کی

چھڑا دُ لاکھ لیکن چھٹ نہیں سکتی ہے ای زاہد
بری ہوتی ہے عادت دخت رز کو منہ لگانے کی

ہمیں بھی مہرباں ہو کر کبھی جلوہ دکھا دینا
نکل آئے اگر صورت کوئی صورت دکھانے کی

مری عرض تمنا پر بگڑ کر وہ یہ کہتے ہیں
کہاں ہو ہوش میں آؤ کرو باتیں ٹھکانے کی

صبا نے چال، پھولوں نے چرایا رنگ گلشن میں
اُڑائی طرز غنچوں نے تمہارے مسکرانے کی

وہ مجھسے میرا حال درد دل سنکر یہ کہتے ہیں
مناسب ہی یہ عادت چھوڑ دو باتیں بنانے کی

دہان زخم دل پر بھی تبسم آہی جاتا ہے
ادا جب یاد آتی ہے تمہارے مسکرانے کی

نہیں اپنے بھی جب اپنے تو پھر کیا ذکر غیروں کا
بہت نازک ہے خوشتر آجکل حالت زمانے کی

اخبار علمیہ

جنین کی جنسیت حسب خواہش والدین

ایک حاملہ عورت کی تشخیص کا مسٔلہ کہ وہ لڑکا جنے گی یا لڑکی، عرصہ دراز سے سائنسدانوں کا مرکز توجہ ہے مگر اب تک بقول مسٹر وِسخر (Vischer) اس کے لئے کوئی ایسا طریقہ دریافت نہیں ہوسکا جسکو سائنٹفک اصول پر تسلیم کیا جاسکے۔

آجکل اس سے بھی زیادہ اہم اور پیچیدہ مسٔلہ کو حل کرنے میں سائنسدانوں کی ایک جماعت منہمک ہے۔ یعنی کہ جنین کی جنسیت والدین کی خواہش کے مطابق ہوسکتی ہے۔ اگرچہ نباتات اور حیوانات پر اس کے تجربات عمل میں آرہے ہیں اور ان سے بعض اہم نتائج کا انکشاف ہوا ہے تاہم ماہرین علم الانسان اور اطبا کے مابین اس امر میں بہت کچھ اختلاف رائے ہے کہ ان تجربات کا عمل انسانوں پر بھی چسپاں کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

زلزلوں کی پیشین گوئی کرنیوالا آلہ

سائنس کی عجیب و غریب اختراعات میں سب سے اہم وہ ایجاد ہے جس کے ذریعہ سے زلزلہ زمین کی خبر فوراً معلوم ہوسکتی ہے۔ یہ آلہ معمولی تھرمامیٹر کا سا ہوتا ہے۔ اس کا موجد ڈاکٹر طامس۔ اے جیگر ہے جو علم زلزلۂ ارضی کا ماہر ہے۔ بقول اس کے یہ آلہ زلزلۂ زمین کی خبر منٹ اور سکنڈ کے حساب سے ایسی ہی صحیح طور پر دے سکتا ہے جیسی کہ جزائر فلپائن میں طوفان کی آمد کے وقت وہاں کا ایجاد شدہ آلہ صحیح طور پر بتا دیتا ہے۔ اس آلہ کے دو حصے ہیں۔ اس کا ایک حصہ زمین پر ایک پیندے میں جما دیا جاتا ہے اور دوسرا حصہ عمارت کے کسی مناسب حصہ میں لگا دیا جاتا ہے۔

تصحیح رسالہ زبان بابت ماہ ستمبر ۱۹۲۶ء

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
سرورق	۳	وَجَدُتُ	وَجَدُت
〃	〃	فَانَّ	فَان
〃	〃	نَقَلُ	نَقلُ
۱	فہرست مضامین	ترجمات ۱۰	ترجمات.. از قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی
۱	〃	اخبار علیہ..."ف"	اخبار علیہ.. از قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی
[illegible]	〃	کونل سے...	کونل سے.. از قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی
۲	۹	مطالبات	مطالبات
〃	〃	المونوح فی الکلام الملیح فی الطعام	المزاح فی الکلام کالملح فی الطعام
〃	۱۰	دلبتگی	دلبستگی
۵	۴	مقابلہ افتتاحی	مقالہ افتتاحی
۷	۱	سرودیں پناہ	سرپرست دیں پناہ
〃	۲	والی ریاست منگرول	والی ریاست منگرول نے
〃	۵	اہل نہیں ہوئے	اہل نہیں ہوتے
۸	۶	پوراہ	پورہ
۱۱	۱۰	علم لفلک	علم الفلک
۱۲	۹	کوئی بھی	(ذرا مدہے)
〃	۱۵	فلاسفر	فلاسفہ
۱۳	۵	علما سے	علما نے
۱۴	۱۳	بدور اسلام سے	بدو اسلام سے
۱۵	۹	اعلی الرغم	علی الرغم
〃	۱۲	رطب اللسان ہیں	رطب اللسان ہے
۱۶	۱۰	اسلام جو نام ہے	اسلام نام ہے
〃	۱۲	مقصد صرف ہے	مقصد صرف یہ ہے
۱۷	۲	ان اموز	ان امور
〃	۲۱	مبارہو	مبارک ہو
۱۸	۸	جس کی عقلیں	جن کی عقلیں
۱۸	۱۸	کردی ہے یہ	کردی ہے کہ
۱۹	۸	چار مسلمہ خاندان سے	چار مسلمہ خاندانوں سے
۱۹	۱	آزی	آزادی
۲۱	۸	بحر الکاہل کے پاس	بحر الکاہل کے پار
〃	۱۹	ڈاوچا اکنتا ایتنائی	ڈاوچا اکنتا خنتا ایتنائی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۲	۱۲	داردیدون کو	دار ویدیوں کو
۲۴	۲	شراب ملانے والوں	شراب پلانے والوں
〃	۵	طلب وبیطاری	طب و بیطاری
〃	۹	تعقید تکلیف	تعقید و تکلیف
۲۵	۱۴	یاقوت ہموی	یاقوت حموی
۲۶	۲	پچاس برس کر دئے	پچاس برس صرف کر دئے
۲۸	۱۶	تیری زبان کو کیا گوئی کی ضرورت	تیری زبان کو کیا گویائی کی ضرورت
۲۹	۳۰	نی سنڈرین	نی سنڈر لینڈ
〃	۱۸	تعلیمی مطالبہ کا اس ودر	تعلیمی مطالبہ کا اس قدر
۳۰	۲	رفتہ	رفتہ رفتہ
۳۰	۱۵	فرد کاری	مزدکاری
〃	۱۵	کہیں سے زیادہ	کہیں زیادہ
۳۲	۱۴	دریافت کرلیا	دریافت کرلیا تھا
۳۳	۳	ازدواورایا	ازداورمایہ
۳۴	۱۲	چاپی رہی تھی	چائے پی رہی تھی
۳۵	۵	جرم اقرار دیا	جرم قرار دیا
〃	۸	مبتلا ہولیگیں	مبتلا ہوئیں
〃	۲۱	محبت کیوں کریں	محبت کیونکر کریں
۳۹	۲	اہلیہ مغرمہ	اہلیہ محترمہ
〃	۱۹	کیا تھا کیا ہوگا اس سے کیا حاصل	کیا تھا کیا ہوگا اس سے کیا حاصل ہے
۴۰	۱۲	صرف اک نظر	صرف ایک نظر
۴۱	۱	پجھلنے	پچھنے
〃	۶	پتہ دیتا ہے	پتہ دیتا ہے۔
〃	۸	ہوا کا جھوں کا	ہوا کا جھونکا
۴۲	۳	نشین	بینشیں
〃	۶	رحمت	زحمت
۴۵	۲	محکمہ سنعت وحرفت کے	محکمہ صنعت وحرفت سے
۴۵	۹	کلیسائے پریش	کلیسائے پیرش
۴۵	۱۰	نشو ونما کی اور حفاظت	نشو ونما اور حفاظت
		کھیل کھیلئے	کھل کھیلے

زبان

جلد ۱ — فہرست مضامین ماہ نومبر ۱۹۲۶ء — نمبر ۵

زبانِ خلق

ازجناب منشی پیارے لال صاحب رونق دھلوی:۔

رسالہ زبان کا پہلا نمبر پہنچا آپ نے اس کو کامیاب بنانے میں جس قابلیت و عرق ریزی سے کام لیا ہے وہ ہر طرح سے قابل تحسین ہے کاٹھیاواڑ جیسے مقام کو اردو علم و ادب کے جیسے قابل قدر پرچہ کی ضرورت تھی اسکو آپنے بہ احسن الوجوہ اپنی اولوالعزمی سے پورا کر دکھایا دعا ہی کہ خداوند تعالیٰ آپکے ارادہ میں برکت دے اور اسکو ترقی روزافزوں نصیب کرے بالفعل دو نظمیں ارسال خدمت ہیں اور آیندہ بھی انشاءاللہ قلمی معاونت میں تہ دل سے آپکا [illegible]

ازجناب مولینا سید اولاد حسین صاحب شاداں بلگرامی، پروفیسر

آپ کی ہمت مردانہ اور ذوق علمی کی مدح کرتا ہوں کہ باوجود رسالوں کے ناکامیاب ہونے کے آپ نے کاٹھیاواڑ ایسے ملک سے ایک ادبی اردو کا رسالہ جاری فرمایا۔ خدا اُسے مقبول کرے اور آپ کی تمنا برآئے۔

ازجناب محمد ایوب صاحب شمیم بی۔اے۔بی ٹی۔ایم۔آر۔ایس۔اے

آپ کا رسالہ نمبر ۲ نظر سے گذرا ماشاءاللہ خوب پرچہ ہے۔ میں آپ کی اس کامیابی پر مبارک باد پیش کرتا ہوں.... میری رائے ہے کہ حتی الوسع اعلیٰ مضامین کی فراہمی کا زیادہ خیال رکھا جائے تاکہ ناظرین کو رسالہ سے کافی دلچسپی رہے۔ اس کا خیال انشاءاللہ میں بھی رکھوں گا۔

ازجناب سعید رزمی صاحب (بھوپال)

رسالہ زبان معہ گرامی نامہ کے پہنچا۔ آپ کی کامیابی مستحق مبارکباد ہے خدا آپ کی کوششوں کو بارآور کرے ...... آپ نے ایک ایسے مقام سے رسالہ جاری کیا ہے جہاں اُردو پر کس مپرسی کا عالم ہے اُس کی امداد ضروری ہے۔

ازمولینا رشید احمد صاحب صدیقی (مرتب سہیل علیگڈھ)

زبان کی قلمی اعانت، ہمارا فرض ہے آپ کے مساعی نہایت مبارک اور قابل ستایش ہیں۔ خدا کرے آپ دقتوں سے جلد نہ گھبرائیں مجھ سے آپ نے قلمی اعانت کے لئے اصرار کیا ہے

مولینا راجکوٹی (پروفیسر عبدالعزیز صاحب) مدظلہ کے ارشادات اس پر مستزاد ہیں میں سوچتا ہوں کہ آخر کیا لکھوں

بہر حال دیکھیے اگر خدا کو منظور ہے تو کچھ نہ کچھ ہو رہے گا۔

مولوی عبدالستار صاحب فاروقی:۔

مکرمی خوشتر صاحب سلام مسنون

زبان پہنچا۔ شکریہ اس کی تدریجی ترقی دیکھکر طبیعت کو ایک گونہ اطمینان وخوشی حاصل ہوئی مجھے اس کے مضامین ان لاہوری پرچوں کے مقابلہ میں بہت پسند ہیں جن کی ظاہری ٹیپ ٹاپ تو بہت ہوتی ہے لیکن مضامین تمامتر بیکار وغیر مفید۔ ان کا بیشتر جزو ادب لطیف جن کو کثیف کہنا زیادہ موزوں ہوگا پر مشتمل ہوتا ہے

"زبان سبھا" میں "ملا رموزی" کی شرکت بہت ضروری تھی خدا کا شکر ہے کہ آپ ان کو ہمیشہ کے لئے کھینچ لائے، خدا نے چاہا تو اب اُردو جرنلیزم کے ایوان میں زبان کو ایک مستقل سیٹ (جگہ) مل جائیگی جیسا کہ لیگ اقوام میں جرمنی کو مل گئی ہے۔ حالانکہ بہت سی حکومتیں اس کے لئے کوشاں تھیں اور ہیں اسی طرح ایوان اُردو جرنلیزم میں جگہ پانے کے لئے بہت سے رسائل ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں لیکن وہ منزل ابھی ان کے لئے بہت دور ہے۔

جناب سعید زرمی صاحب:۔

خوشتر صاحب

رسالہ پہنچ گیا۔ کارڈ بھی ملا زبان کی ترتیب میں آپ محنت وقابلیت صرف فرمارہے ہیں۔ مضامین بھی مفید اور بلند معیار کے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ آپ نے ایک ایسے ناموزوں مقام سے رسالہ جاری کرکے "اردو" سے اپنی محبت اور فرض شناسی کا ثبوت پیش کیا ہے خدا کرے کہ آپ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوں۔ اہل قلم حضرات کو آپ کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔ ہرچند میں اپنے تئیں اس قابل نہیں سمجھتا۔ لیکن آپ کا محبت آمیز ارشاد و اصرار مجبور کن ہے انشاءاللہ جلد کوئی مضمون پیش کرونگا۔

صفحۂ ادارت

ہم اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے یہ ضرور کہیں گے کہ "زبان" جس نکتہ نظر سے جاری کیا گیا ہے اس نے اب تک اس کا کوئی علمی ثبوت نہیں دیا یعنی "زبان" اہل کاٹھیاواڑ کی خدمت میں ایسے سادہ اور سریع الفہم لٹریچر پیش کرنے سے جس کو بوجہ سادگی و روانی ایک بچہ بھی سمجھ سکے عاجز رہا ہے۔ اس کا ہمیں بہت صدمہ ہے لیکن کیا اہل ملک نے بھی (ہمیں بار بار اس کے اعادہ سے ندامت معلوم ہوتی ہے) کبھی اپنی ذمہ داری کا احساس کیا؟

دفتر میں اس قسم کے بہت سے خط موصول ہوئے ہیں کہ "زبان کی زبان بہت مشکل اور ادق ہوتی ہے" اگر یہ شکایت درست مانی جائے تو اس حیثیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ "ایک علمی رسالہ کے لئے بلحاظ نوعیت مضامین اپنی زبان اور استعمال علمی اصطلاحات سے گریز ایک ناگزیر امر ہے۔"

تاہم اگر مضامین نگار حضرات تھوڑی سی توجہ مبذول فرمائیں تو یہ مشکل آسانی سے حل ہوسکتی ہے چنانچہ بقول سروش[1] لکھنوی "کیا اچھا ہو اگر اس پرچہ میں یہ خصوصیت پیدا ہو جائے کہ اس کے سب مضمون چاہے وہ نظم میں ہوں یا نثر میں فارسی عطف و اضافت سے پاک ہوں...... مجھ جیسے اور لکھنے والے، جن سے ایڈیٹر صاحب نے قلمی مدد مانگی ہو، میں ان سے بھی یہی درخواست کرونگا کہ وہ جہانتک ہوسکے، آسان زبان میں لکھنے کی کوشش کریں۔"

اسی طرح عربی و فارسی کے ایسے ادق اور دشوار الفاظ جن کے ہم معنی و مترادف الفاظ ہندی اردو میں موجود ہوں استعمال نہ کریں اور سادہ اور متعارف الفاظ تحریر فرمائیں اور ساتھ ہی ادائے مطالب کا پورا پورا لحاظ رکھیں تو ناظرین زبان کے لئے بہت کچھ سہولت اور آسانیاں پیدا ہوسکتی ہیں۔ امید کہ ہمارے مقالہ نگار آئندہ اس بات کا خیال رکھیں گے۔

ایڈیٹر

---

[1] دیکھو زبان بابت اگست زبان خلق کے آخر بارے - ۱۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زبان

ماہ نومبر ۱۹۲۶ء

مقالات

ناصر الدنیا والدین ملک نائب خسرو خاں گجراتی

(از مولینا ابو ظفر صاحب۔ ندوی پروفیسر گجرات مہاودیالہ احمد آباد)

ذیل کا گراں بہا تاریخی مضمون مولینا ابو ظفر صاحب ندوی نے ہماری استدعا پر توجہ فرما کر زبان کے لئے مرحمت فرمایا جس کے لئے ہم ان کی خدمت نہایت خلوص کے ساتھ ہدیۂ شکریہ پیش کرتے ہوئے امیدوار ہیں کہ آیندہ بھی زبان کے صفحات کو تاریخی معلومات سے مالامال فرمائیں گے۔

موصوف کا نام دنیائے ادب میں ہماری تعریف و توصیف سے مستغنی ہے آپ دار العلوم ندوۃ العلما کے فارغ التحصیل اور اردو کے ایک زبردست انشا پرداز ہیں کچھ عرصے سے آپ احمد آباد کی گجرات مہاودیالے کے پروفیسر ہیں۔ گجرات کی ایک مکمل و مبسوط تاریخ اردو میں تالیف فرما رہے ہیں جس سے امید ہے کہ اردو کے سرمایہ میں ایک نمایاں اضافہ ہو جائے گا۔

ایڈیٹر

خسرو خاں گجراتی کو تاریخ میں لوگوں نے بہت کم وقعت دی ہے۔ جس کا سب سے بڑا سبب ناجائز طریقہ سے حصول حکومت ہے۔ یا یہ کہ بہت ہی نیچ قوم کا آدمی تھا۔ لیکن یہ دونوں جرم کچھ ایسے مہاپاپ نہیں

ہیں۔ جن کا ارتکاب صرف خسرو خاں گجراتی ہی نے کیا ہو۔ بلکہ بنظر غور سے دیکھو تو دنیا کا کوئی حصہ ایسے اولوالعزم فاتح کی تاریخی مثالوں سے خالی نہ ہوگا۔ قیصر، نپولین، سبکتگین، قطب الدین ایبک، چنگیز، نادر شاہ ان میں سے کون اعلیٰ خاندان رکھتا تھا۔ مول راج سولنکی اور علاء الدین خلجی نے تخت و تاج ٹھیک اُسی طرح حاصل کیا۔ جیسا خسرو خاں نے۔ خسرو خاں گجراتی نے قطب الدین کی غفلت سے جو فائدہ اٹھایا وہ یقیناً قابل تعریف ہے۔ ذاتی حیثیت سے اپنی قوم اور ملک کے لئے جس طرح عقل و فراست سے کام لیا۔ اس کے باعث اُس کے فخر میں کسی شبہ کی گنجایش نہیں۔ یہ ایک دوسری بات ہے کہ بعض موانع کے باعث وہ مقدم الذکر اشخاص کی طرح دُنیا کا کامیاب بادشاہ نہ ہوسکا۔

نام و نسب و قوم کی تحقیق

یہ شخص گجرات کا رہنے والا تھا۔ اور قیاس کیا جاتا ہے کہ اس کا وطن اصلی نہروالا پٹن کے پاس تھا۔ اس کے عروج کے زمانہ میں جبکہ بڑے بڑے عہدوں پر سرفراز کیا جارہا تھا۔ اس کے آس پاس تمام رشتہ دار نظر آتے ہیں۔ لیکن قریب ترین رشتہ دار یعنی باپ کہیں نظر نہیں آتا۔ اس سے خیال کیا جاتا ہے کہ ابتدا عمر میں وہ فوت ہوچکا تھا۔ مذہباً یہ ہندو تھا۔ اس کی ذات کے متعلق مورخوں کی رائے مختلف ہے۔ مورخ برنی اور فرشتہ نے "پروار" بہ بار فارسی لکھا ہے۔ اور پرواری قوم گجرات میں ڈھیڑ بھنگی، لوگوں کو کہتے ہیں۔ بدایونی نے "بروار" بہ بار عربی تحریر کیا ہے۔ اور گجرات گزیٹر نے اسی کی تشریح کی ہے۔ کہ بروار، گجرات میں ایک شاخ کاٹھی اور اہیر وغیرہ کی ہے جس کو باریا بھی کہتے ہیں، یہ لوگ عموماً ملازم پیشہ ہوتے ہیں۔ گجرات کی عربی تاریخ ظفر الوالہ نے بھی بروار ہی لکھا ہے بعض لوگوں نے "پرمار" کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ یہ راجپوتوں کی شاخ ہے جو گجرات اور مالوہ میں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن یہ کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ عام مورخین اس پر متفق ہیں کہ خسرو خاں ادنیٰ قوم (ذات) کا آدمی تھا۔ اور راجپوتوں کی ذات ادنیٰ میں شمار نہیں کیجاتی۔ میرے خیال میں لفظ پروار، اور، بروار دونوں کی اصل "بھرواڑ" ہے۔ جو فارسی اور عربی قالب میں ڈھل کر پروار اور بروار ہوگیا ہے۔ گجرات میں "بھرواڑ" قوم بکثرت ہے۔ جن کا پیشہ بھیڑ، بکریاں چرانا ہے۔ اردو میں اس کے لئے لفظ "گڈریا" کا ہے۔ ہندو قوم ان کو نیچ ذات سمجھتی ہے۔ یہ لوگ مالوہ اور مارواڑ سے لے بمبئی تک بکریاں چراتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ میرا ذاتی خیال ایسا ہے کہ خسرو خاں اسی قوم بھرو

میں سے تھا۔ یہ قوم جنگلوں میں زندگی بسر کرنے کے سبب دلیر، بہادر، اور باہمت ہوتی ہے۔

پرورش و تعلیم

خسرو خاں کے باپ کی طرح خود اُس کا بھی اصلی نام پردۂ خفا میں ہے۔ اس کا مذہب کسی طرح تبدیل ہوا۔ تاریخ اس کے متعلق خاموش ہے۔ لیکن قیاس کیا جاتا ہے۔ کہ مسلمانوں کی تربیت اور صحبت سے متاثر ہو کر اس طرف مائل ہوا۔ غالباً بکریاں چرانے کے سلسلہ میں اس کا خاندان مالوہ نکل گیا تھا۔ کہ جنگ مالوہ شروع ہوئی اور اسیر ہو کر دہلی لایا گیا۔ اور ملک شادی حاجب سلطان علاء الدین نے اس کی پرورش کا بار اپنے سر اُٹھا لیا تبدیل مذہب کے بعد اس کا نام "حسن" رکھا گیا۔ مورخوں نے عہد علائی میں متذکرہ بالا بیان کے سوا اور کسی قسم کا تذکرہ نہیں کیا۔ جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عہد علائی میں یہ غیر معروف رہا۔ جس کا سبب یا تو یہ ہو کہ صغیر السن ہونے کے باعث کسی کام میں دخل نہ دے سکا۔ اور یا یہ کہ بڑے بڑے جنرل اور تجربہ کار اشخاص اُس عہد میں موجود تھے۔ جن کے آگے اس کی کچھ پیش نہ گئی۔ غرض ۷۱۶ھ میں جب سلطان قطب الدین تخت دہلی پر قابض ہوا۔ تو حسن قطب الدین کے دربار میں باریاب ہوا۔ ملک شادی کے زیر نگرانی اس نے جو تربیت حاصل کی۔ اب اُس کے اظہار کا وقت آ گیا تھا۔ چنانچہ بہ تفصیل اُس کے کارنامے لکھے جاتے ہیں۔ رسمی علوم و فنون کے متعلق تاریخ کی زبان گنگ ہے۔ لیکن جنگ تعلق اور مدراس کے حملوں میں جو کارنامے تاریخ کے صفحوں پر ہیں۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ فن جنگ میں وہ کافی ماہر تھا۔ اور زمانہ کے عام مذاق کے مطابق اس میں خوب مہارت بہم پہونچائی تھی۔

عام حالات و واقعات

۷۱۸ھ میں قطب الدین خلجی جب دیوگڈھ کی بغاوت فرو کرنے گیا۔ تو خسرو خاں حسن ساتھ ساتھ تھا۔ اس کے حسن لیاقت اور کارہائے نمایاں کو دیکھ کر سلطان قطب الدین نے "خسرو خاں" کا خطاب عنایت فرمایا۔ اور اس کی بڑی عزت افزائی فرمائی۔

اگرچہ مورخ ضیاء برنی نے خسرو خاں گجراتی کے متعلق اکثر مقامات پر متعصبانہ رائے کا اظہار کیا ہے۔ لیکن ادنیٰ فکر و غور سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ زمانہ کے اقتضاء سے جو کچھ خسرو خاں گجراتی نے کیا وہ صحیح کیا۔ سلطان قطب الدین اپنے باپ سلطان علاء الدین کی طرح جو ملک کافور کا بیحد گرویدہ ہو گیا تھا۔ خسرو خاں پر بہت زیادہ مہربان نظر آتا ہے۔ چنانچہ جب دیوگڈھ سے واپس ہوا۔ تو دوسرے تجربہ کار اشخاص کی موجودگی میں خسرو خاں کو چتر اور دورباش دیکر تلنگانہ اور معبر (مدراس)

روانہ کیا۔ علاءالدین نے جس طرح ملک کافور کو با اختیار کرکے ملک دکن پر حاوی کردیا تھا۔ قطب الدین نے بھی خسرو خاں گجراتی کو معبر کا مختار کل بنادیا۔ خسرو خاں گجراتی بڑے ساز و سامان کے ساتھ مع امرار دولت دیوگڈھ سے پہلے تلنگانہ میں آیا۔ اور وہاں کے راجہ سے بعد محاصرہ ایک سو سے زیادہ ہاتھی اور بے شمار مال و دولت وصول کرکے "میتھلی" کے طرف روانہ ہوگیا۔ یہاں سے بھی نوسو بیس[920] ہاتھی اور ایک ٹکڑہ الماس کا جو وزن میں چھ درم تھا لے کر معبر پہونچا۔ موسم[51] برسات آگیا تھا اسلئے اس نے اسی جگہ چند سے قیام کیا۔ اسی مقام پر ایک مسلمان تقی نامی سوداگر بڑا مالدار تھا اس نے صرف یہ سمجھ کر کہ مسلمانوں کا لشکر یہاں آیا ہے۔ جو مسلمانوں کو نہیں ستائے گا۔ اسی جگہ مقیم رہا۔ خسرو خاں گجراتی نے اس کو گرفتار کرلیا۔ اور اس کا تمام مال ضبط کرکے داخل خزانہ شاہی کیا۔ اور افسوس یہ ہے کہ یہ مظلوم مسلمان باوجود ان تمام مصائب کے بھی اپنی زندگی کو محفوظ نہ رکھ سکا۔ خسرو[52] خاں گجراتی بڑا ہوشیار آدمی تھا۔ قطب الدین کی بدمستی اور عیش پرستی کو دیکھ کر ملک کافور کی طرح اس میں خود مختاری کی ہوس پیدا ہوئی۔ اور ایسا ہونا اس عہد کے لحاظ سے ایک قدرتی بات تھی۔ ایک ادنیٰ شخص کو اس قدر جلد بڑے بڑے عہدے اور خطابات دیئے گئے ہوں اور پھر ایک جرار لشکر اس کے ماتحت ہو۔ مال و دولت کا انبار بھی سامنے لگا ہو۔ اور پایہ تخت سے دور ایک خود مختار حاکم کے مثل رہتا ہو۔ تو اسکے دل میں ایسی خواہش کا پیدا ہونا۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ چنانچہ بعض ہندوؤں اور ملک کافور کے بقیہ لوگوں کو ملاکر اس امر کے لئے مشورہ کرنے لگا۔ خسرو خاں گجراتی جب تک معبر میں رہا دن رات اسی دھن میں لگا رہا۔ کہ کس طرح تمام امراء سلطنت کو ملالیا جائے۔ یا خاتمہ کرکے خود مختاری کا اعلان کرے۔ جب یہ مشورہ عام طور پر مشہور ہوگیا۔ اور لوگوں میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ تو فوجی سرداروں میں سے ملک تمر، ملک تلبغہ یغدہ نے خسرو خاں گجراتی کو پیغام بھیجا کہ ہم نے سنا ہے کہ تم بغاوت کا ارادہ رکھتے ہو۔ اور یہاں سے واپسی کی نیت نہیں ہے۔ یاد رکھو کہ ہم ایسا نہیں کرنے دیں گے اور قبل اس کے کہ ہم تم کیجا ہوں۔ بہتر ہے کہ تم واپسی کا ارادہ کرلو۔ اسی طرح ڈرا دھمکا کر خسرو خاں گجراتی کو واپسی پر مجبور کیا۔ بموجب حکم سلطانی خسرو خاں کو دیوگڈھ سے پالکی پر سوار کراکر سات دن میں دہلی پہونچا دیا گیا۔ قطب الدین شاہ

۵۱ بدایونی صفحہ ۲۱۲ جلد ۱۔۱۲

۵۲ یہ تمام کام ایسے ہوئے جیسے نصرت خاں نے کھمبات فتح کرتے وقت تاجر بغدادی کے ساتھ کیا۔۱۲

اس کو دیکھتے ہی نرم ہوگیا۔ اس کے حسن خداداد اور چرب زبانی سے مسحور ہوگیا۔ اس نے بھی میٹھی میٹھی زبان سے اُمرائِ کبار کی سخت شکایت کی۔ اور اپنی سرکشی کے الزام کو اس طرح دور کیا۔ کہ یہ امرا کبار مجھ پر بغاوت کا جھوٹا الزام صرف اس لئے عائد کرتے ہیں کہ وہ فضیلت جو ان پر آپ نے مجھے عنایت فرمائی ہے۔ انھیں پسند نہیں۔ اور اس لئے مجھے آپ کی نظروں سے گرانا چاہتے ہیں اور یہ سب گواہ جھوٹے ہیں۔ بادشاہ نے یہ سب سچ سمجھ کر گواہوں کو مروا ڈالا۔ اور امرار دولت کی سخت توہین کی۔ اور ان میں سے اکثر کی جاگیریں واپس لے کر خسرو خاں گجراتی کو دیں۔ ان باتوں سے تمام امرار دولت خوف زدہ ہوگئے۔ اور بضرورت زمانہ خاموشی اختیار کر لی۔ جب خسرو خاں نے دیکھا کہ اب زمانہ ہمارے موافق ہوگیا ہے۔ تو اُس نے ۸ا۷ھ میں بادشاہ سے شکایت بیجا کرکے ملک دینار ظفر خاں کو گجرات سے طلب کرا کر قتل کروا دیا۔ اور اس کے بجائے اپنے بھائی (ملک حسام الدین) کو گجرات کا گورنر بنا کر بھجوا دیا۔ یہ کارروائی ایک خاص غرض سے کی گئی تھی جس کی تفصیل یہ ہے کہ خسرو خاں گجراتی نے جب دیکھا کہ جو خود مختاری کا خواب معبر میں دیکھا تھا بدقسمتی سے اُس کی تعبیر غلط نکلی۔ لیکن زمانہ کے موافق ہوتے ہی پھر جنون شروع ہوا۔ اور اس دفعہ اس نے پہلے سے بھی زیادہ دور کی سوچی یعنی گجرات جو وطن ہے۔ اس پر قبضہ کرلیا جائے۔ خیال یہ تھا کہ وہاں دولت حاصل کرکے اور فوجی بھرتی کے ذریعہ خاص وطن میں ہموطنوں کی امداد سے خود مختار سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اور گمان یہ تھا کہ یہ کام بآسانی حاصل ہوجائیگا۔ اور اسی لئے بے چارہ ملک دینار کو قتل کروا دیا۔ اور اپنے بھائی حسام الدین کو دولت اور فوجی طاقت حاصل کرنے کے لئے گجرات کی گورنری دلوائی۔ لیکن نالایق ہونے کے سبب اس کام کو انجام نہ دے سکا۔ بلکہ سچ پوچھو تو نقصان پہونچایا۔ قطب الدین کی آنکھیں ہوتیں۔ تو خسرو خاں گجراتی کے دونوں فریب ظاہر ہو جانے پر کافی بندوبست کرسکتا تھا۔ لیکن وہ بادہ غفلت میں اس طرح مست تھا۔ کہ اس وقت بھی مدہوش رہا۔ اور خسرو خاں گجراتی اور حسام الدین گجراتی پر ایسا ہی بھروسہ کرتا رہا جیسا باپ کو لڑکے پر یا عاشق کو محبوب پر ہوتا ہے۔

خسرو خاں گجراتی نے دیکھا کہ یہ وار بھی خالی گیا۔ اور حسام الدین گجرات میں کوئی خود مختار سلطنت قائم نہ کرسکا۔ جس کی خسرو خاں گجراتی کو دلی خواہش تھی۔ دونوں مرتبہ تجربہ سے ثابت ہوگیا۔ کہ پایہ تخت سے باہر ابھی علائی سردار موجود ہیں جو کام بننے نہیں دیتے ہیں۔ اسلئے اس بار

ذرا زیادہ بلند پروازی سے کام لیا۔ اس نے خیال کیا کہ اس کا حل صرف اسی صورت سے ہو سکتا ہے کہ امرائِ دربار کو ذلیل کرکے دہلی سے باہر نکال دیا جائے۔ یا اپنے ساتھ مل جانے پر مجبور کر دیا جائے۔ اور پھر قطب الدین کو مار کر تخت پر قبضہ کرلے۔ چنانچہ کمر ہمت چست کرکے بلند حوصلگی کے ساتھ دلیرانہ اس کام کو انجام دینا شروع کر دیا۔

پس علاء الدین کے عہد کے بڑے بڑے امراء روزانہ سر دربار ذلیل کئے جانے لگے۔ توبہ نامی گجراتی بھاٹ امرائِ دولت سے ذلیل طور پر مسخری کرتا۔ جس کا انجام آخر کار یہی ہوا۔ کہ کچھ لوگ خسرو خاں سے مل گئے۔ اور کچھ لوگ خانہ نشین ہو گئے اور انھوں نے دربار کی حاضری موقوف کر دی۔ اور ضاجاگیراپنی اپنی جاگیروں پر چلے گئے جب میدان خالی ہو گیا تو دربار میں ادنیٰ درجہ کے لوگ اپنی قوم میں سے بھرنا شروع کر دیا۔ ایک دن موقعہ پاکر بادشاہ سے عرض کیا کہ حضور کی مہربانی سے بڑے درجہ تک پہنچ گیا ہوں۔ دور دراز ملکوں میں اپنے فتوحات کا ڈنکا بھی بجا چکا ہوں۔ لیکن میں دیکھتا ہوں کہ امرائِ دولت مع اپنے خویش واقربا کے جاہ وحشم کے ساتھ باہر نکلتے ہیں۔ اجازت ہو تو میں بھی گجرات سے اپنے رشتہ داروں کو بلا کر حضور کی مرحمت کا سزاوار بناؤں۔ اور اس بہانہ سے اس نے اپنے تمام رشتہ داروں کو طلب کرکے سارا دربار ان سے بھر دیا۔ اسی درمیان بادشاہ شکار کے لئے "سرساوہ" گیا لوگوں کی رائے ہوئی کہ اسی شکار گاہ میں سلطان کا شکار کیا جائے۔ لیکن بہاء الدین دبیر، یوسف صوفی، پسر قرہ قیما روغیرہ نے اس سے منع کیا۔ اور کہا کہ اگر بادشاہ یہاں مارا گیا تو اسلامی لشکر ہم سب لوگوں کا شکار کرے گا۔ اور ایک بھی زندہ نہ بچیگا۔ اور ہم لوگوں کو پناہ کی جگہ نہ ملے گی۔ اس لئے بہتر ہے کہ بادشاہ کو کوشک ہی میں قتل کیا جائے۔ اور بوقت ضرورت کوشک ہزار ستون کو پناہ کا مقام بنایا جائے۔ چنانچہ جب بادشاہ دہلی آیا۔ تو اس کی تیاری شروع کر دی ۷۲۰ھ میں گجرات کی صوبہ داری اپنے نام کرالی۔ اور پھر گجرات اور بھیل واڑ سے فوجی بھرتی میں مشغول ہو گیا۔ یہاں تک کہ چند دنوں میں فوجی طاقت جمع کرکے بڑے تزک واحتشام کے ساتھ باہر نکلنے لگا۔

(باقی دارد)

ہندوستان اور اس کی زبانیں

(مترجمہ جناب مولوی عبدالستار صاحب فاروقی)

(گذشتہ سے پیوستہ)

البتہ بعض زبانیں ایسی ہیں جن کو اس نقص کا احساس ہو گیا ہے، اور وہ اس کو دُور کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ ان سے ہمیں اس امر کے مطالعہ کا بخوبی موقع ملتا ہے کہ کس طرح ایک وحشی قبیلہ اپنی زبان کو ترقی دیتا، اور وسیع بنا کر اعلیٰ اور عام خیالات کے اظہار کے قابل بنا دیتا ہے۔ عام بول چال میں "میرا" اور "تیرا" کی بجائے صیغۂ واحد غائب کی ضمیر زیادہ مستعمل ہے، اسی طرح ان میں کی بعض زبانوں میں "اس کا" کا استعمال بالکل غیر معین طور پر ہوتا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ یہ ایک بے معنی لاحقہ ہے جس کا استعمال ہر اسم عام کے ساتھ غیر معین طور پر جائز ہو گیا ہے۔

اسی طرح ان زبانوں میں کوئی نحوی قاعدہ نہیں ہے جو ضمیر موصول کا قائم مقام کہا جا سکے مثلاً ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ "وہ آدمی جو کل آیا تھا"، تو ہم کو اس طرح کہنا پڑیگا کہ "وہ کل آنے والا آدمی"۔ البتہ بعض وہ زبانیں جن کو آرین زبانوں سے اختلاط کا موقع ملا ہے ضمیر موصول کا ٹھیک انگریزی کی طرح استعمال کرتی ہیں۔ بعض قبائل اس ضمیر کی سہولت کا احساس کرتے ہوئے اپنی زبانوں میں اوسکو اختیار کرنے لگے ہیں۔ وہ طریقہ جس کے ذریعہ اُنھوں نے اس مشکل کو حل کیا ہے ہمارے لئے اس بات کی ایک قابل غور مثال ہے کہ کس طرح دور و دراز ملکوں میں بھی ایک انسانی دماغ اسی مسئلہ زبان بالکل یکساں طریقہ سے حل کر لیتا ہے جیسا کہ ہم نے انگلستان میں ضمیر استفہام (who which) کو ضمیر موصول کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے، ٹھیک اسی طرح آسام کے قبیلۂ لہوتا ناگا (Lhota Naga) نے ہمسایہ قبائل کی زبان کی امداد کے بغیر اس مطلب کو ادا کر لیا ہے۔ اگر انکو یہ کہنا ہو کہ "آپ جو چاہتے ہیں لے لیں"، تو وہ جو کچھ کہیں گے اس کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا:-

"آپ کیا لینا چاہتے ہیں لے لیں"

تبتی برمی کے بالکل برعکس آرین زبانیں ہیں جن کو بائیس کروڑ تیس لاکھ شمالی اور مغربی ہندوستان کے

لوگ (جو تقریباً یورپ کی نصف آبادی کے برابر ہیں) استعمال کرتے ہیں۔ یہ آرین زبانیں جو ہماری یورپین زبانوں سے ایک طرح کی قرابت بعیدہ رکھتی ہیں ہمارے (یورپین) خیال کے مطابق ایک کثیر ذخیرۂ الفاظ اور نحوی قواعد پر مشتمل ہیں۔ اور ہر اس خیال کو جس کا ادراک نفس انسانی کر سکتا ہے، نہایت صفائی اور شستگی کے ساتھ ادا کرنے پر قادر ہیں۔ ان زبانوں کے پھیلنے بلکہ ہندوستان میں داخل ہونے کی صحیح تاریخ بھی ہمیں معلوم ہے۔ آرین زبانیں اس زبردست انڈو یوروپین خاندان کی ایک شاخ ہیں جس کی دوسری شاخیں یورپ کی مختلف زبانیں لاطینی، یونانی، انگریزی وغیرہ ہیں۔ انڈو یوروپین زبانوں کے اصل مسکن کا مسئلہ جہاں سے کہ وہ یورپ اور مغربی و جنوبی ایشیا میں پھیل گئیں، برسوں تک زیر بحث رہا ہے۔ ہم لوگ عام طور پر پروفیسر میکس مولر کی اس محفوظ رائے سے واقف ہیں کہ "انکا مسکن ایشیا میں کہیں ہے"۔ لیکن اس رائے کے بعد اور مقامات کے نام بھی پیش کئے جاتے ہیں، ان میں سے ایک مقام جنوبی روس کا میدانی ملک ہے جس کو بالعموم درست سمجھا جاتا ہے اور جس کی بعض علما اب بھی تائید کر رہے ہیں۔ اس سے متعلق جدید ترین نظریہ کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر پی۔ جائلز نے "کیمبرج ہسٹری آف انڈیا" میں بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ اُن کا یہ نظریہ نباتات اور حیوانات کی تقسیم پر (جن کے نام قدیم الایام سے چلے آتے ہیں) تاریخ طبقات الارض، اور اُن تحقیقات جدیدہ پر مبنی ہے جو حال ہی میں ایشیائے کوچک میں کی گئی ہیں۔ اس بنا پر وہ ان قبائل کے انتشار و افتراق کا مرکز اقصائے شمال مغرب میں ایک ایسے مقام کو قرار دیتے ہیں جسے موجودہ آسٹریا ہنگری سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، اور یہیں سے وہ قبائل شمال، جنوب، اور مغرب، کی جانب پھیل گئے، جن کی زبان کی نمایندگی اس وقت مذکورۂ بالا السنۂ یورپ کر رہی ہیں۔ دوسرے وہ قبائل جو پے در پے حملے کرتے ہوئے درۂ دانیال کو عبور کر کے ایشیائے کوچک پر حملہ آور ہوئے اسی طرح ان یورشوں کا حال جو ان سے پہلے بار بار وقوع پذیر ہوئیں، تاریخ قدیم میں درج ہو چکا ہے۔ ان خانہ بدوش قبائل میں سے بعض کے وجوہ کا شمالی الجزیرہ (میسوپوٹامیہ) تک پتہ چلتا ہے۔ پھر یہ دو ہزار سال قبل مسیح میں قوم متدا (Madamumu) یا میڈیا والوں کے نام سے ایران کے شمالی مغربی میں قدیم شہر بلخ (میڈیا) اور اس کی نواحی میں نظر آتے ہیں۔ یہ مسئلہ ابھی بحث طلب ہے کہ آیا یہ لوگ یہاں براہ راست ایشیائے کوچک سے آئے تھے یا کسی اور راستہ سے۔ لیکن اس بات سے تو انکار نہیں ہو سکتا کہ تاریخ مذکورہ میں یہ قوم یہاں موجود تھی۔ اُن ناموں اور الفاظ سے جو کتبات اور فرمانروایان مصر کے مراسلات

میں پائے جاتے ہیں یہ پتہ چلتا ہے کہ ایشیائے کوچک کی حِتّی (Mitanni) قوم سے بھی ان کا تعلق تھا۔ جدید خیال کے مطابق وہ منڈا یا میڈیا والے ہی تھے جنھوں نے آریاؤں کے نام سے ایران پر تاخت وتاراج کی اور انہی میں سے ایک گروہ آگے بڑھتا ہوا افغانستان کے راستہ سے ہندوستان میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوا۔ ہندوستان کی سکونت سے اس گروہ کے لوگ اپنے ایرانی بھائیوں سے بالکل دور افتادہ اور بے تعلق ہو گئے۔ اور ہر چہار طرف اپنے مخالف قبائل سے گھرے ہوئے تھے۔ تاہم انھوں نے اپنی زبان کو اسی طرح پاک وصاف رکھا جس طرح مکسیکو اور پیرو کی اسپینی زبان موجودہ اسپینی زبان کی بہ نسبت سولھویں صدی کی زبان سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے اور آئرلینڈ کے ادنیٰ طبقہ کی زبان عہد الزابتھ کی انگریزی زبان کو یاد دلاتی ہے۔

منڈا قوم کے ہندوستان میں آنے والے لوگوں کو یہاں کے دراویدیوں اور منڈا قوم کے اُن قبائل سے سخت مقابلہ کرنا پڑا جو ہندوستان میں ان سے بہت پہلے سکونت پذیر ہو چکے تھے۔ اور جنھوں نے ان کی بہت کچھ روک تھام کی لیکن یہ رفتہ رفتہ پنجاب میں پھیل گئے، گنگا کے وسیع میدانوں کو طے کرتے ہوئے بنگال کے قریب تک جا پہونچے، اور مغربی ساحل کی طرف گوا تک پُہنچ گئے۔ مرور زمانہ کے ساتھ ملک کے اصلی باشندوں سے ان کے ازدواجی تعلقات قائم ہوتے رہے یہاں تک کہ بنگال کے ہر باشندہ کے جسم میں آرین خون کی کچھ نہ کچھ مقدار باقی ہے۔ لیکن ان کی زبان یہاں بھی ویسی ہی خالص جس کو اُنھوں نے مفتوح اقوام میں رائج کر دیا۔ تبتی برمیوں کی طرح آریہ بیک وقت ہندوستان نہیں آگئے تھے بلکہ وہ گروہ در گروہ کئی صدیوں تک ہندوستان میں داخل ہوتے رہے۔ اور اس لئے لازمی طور پر بعد میں آنے والوں کی زبان ان کے پیش رَوں کی زبان سے مختلف تھی۔ چنانچہ یہ فرق آج تک بھی برابر قائم ہے جو ان کی اولادوں یعنی ہندوستان کی موجودہ بولیوں میں پایا جاتا ہے۔ بعض زبانیں جیسے ہندوستانی (اردو) وغیرہ انگریزی کی طرح آسان سلیس اور رواں ہیں، اور بعض جیسے مرہٹی وغیرہ قواعد کی زنجیروں میں اسی طرح جکڑی ہوئی ہیں جیسے کہ ہم یورپین زبانوں میں جرمنی کو دیکھتے ہیں۔

ہندوستان کی آرین زبانیں عام طور پر انڈو آرین کہلاتی ہیں اور ان کی قدیم ترین شکل جو ہمیں معلوم ہے وہ سنسکرت زبان ہے۔ قدیم ترین بولیوں میں جو صدیوں تک زبانی منقول ہوتے رہنے کے بعد ویدکے گیتوں میں نمودار ہوتی ہے وہ غالبًا وہی آرین زبان ہے جو آریاؤں کی اولین ہجرتِ ہند

سے پہلے ایران میں بولی جاتی تھی - بعد میں اس زبان نے جو صورتیں اختیار کیں وہ اُس آرین زبان کو پیش کرتی ہیں جو اُس وقت اس مقام کے قرب و جوار میں بولی جاتی تھی جسے اب دہلی کہتے ہیں - اس زبان میں ایک کثیر ذخیرۂ ادب موجود ہے جس کا تذکرہ ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے - اسی زبان اور اُس کی متعلقہ زبانوں سے موجودہ انڈو آرین زبانیں پیدا ہوئی ہیں - ان میں بڑی زبانیں یہ ہیں:-

(۱) **ہندی** - اس میں مختلف بولیاں لکھی جاتی ہیں، مشہور ہندوستانی اُردو زبان بھی اسی میں شامل ہے - پنجاب اور بنگال کے مابین وادی گنگا کے تمام باشندوں کی زبان ہے - اس کے بولنے والوں کی تعداد تقریباً ۹ کرور ۸۰ لاکھ ہے - جو ریاستہائے متحدہ (امریکہ) کی کل آبادی سے زیادہ ہے -

(۲) **بنگالی** - ملک بنگال میں بولی جاتی ہے جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے - اس کے بولنے والے پانچ کرور ہیں -

(۳) **مرہٹی** - بمبئی اور اس کے مشرق اور جنوب کے ملک میں مروّج ہے - اس کے بولنے والوں کی تعداد ایک کرور نوّے لاکھ ہے -

(۴) **گجراتی** - ملک گجرات میں بولی جاتی ہے جو بمبئی کے جنوب میں واقع ہے - ایک کرور آدمی اس کو بولتے ہیں -

(۵) **پنجابی** - ملک پنجاب میں مستعمل ہے - بولنے والوں کی تعداد ایک کرور ساٹھ لاکھ ہے -

ان تمام زبانوں کا اپنا مستقل لٹریچر ہے جس کی ابتدا ہمارے ازمنۂ متوسطہ سے ہوتی ہے - انکا ادب اس زبردست شاعری کو اپنے دامن میں لئے ہوئے، جو خاص ایشیا کی پیداوار ہے نہایت خوشنما اور دلکش معلوم ہوتا ہے -

اس آخری ہجرت ہند کے بعد اُن آریاؤں کی زبان جو ایران میں پیچھے رہ گئے تھے، خود بخود ارتقائی مدارج طے کرنے لگی، اور جس طرح اطالوی زبان لاطینی سے ترقی کرکے بنی ہے اسی طرح وہ آخر کار موجودہ خوبصورت فارسی میں تبدیل ہوگئی - فارسی چونکہ ہندوستان کی زبان نہیں ہے اس لئے سردست ہمیں یہاں اس سے کوئی سروکار نہیں ہے - لیکن ہندوستان کی طرف آریاؤں کی نقل و حرکت مابعد کا ذکر کرنا ضروری ہے - جو مذکورہ بالا ابتدائی ہجرتِ ہند

کے بعد معرضِ وجود میں آئی۔ انڈو آرین قوم کے براہ افغانستان ہندوستان پہونچنے سے کچھ ہی قبل ایران میں ان کی زبان (جبکہ وہ اسوقت بالکل ابتدائی حالت میں تھی) ہنوز موجودہ صورت کی طرف ترقی کر رہی تھی کہ ان کے دوسرے جتھوں نے شمال مشرقی رخ کی جانب بڑھنا شروع کیا اور آخر کار وہ پامِرس (Pamirs) تک پہونچگئے۔ دنیا کے اس ناموافق اور غیر متواضع مقام سے انھوں نے جنوب کی طرف پنجاب کے میدانوں کا رُخ کیا۔ اُن میں سے بعض دریائے سندھ کی وادی تک پُہنچ گئے۔ وہاں وہ اپنے اُن متقدم بھائیوں سے مِل گئے جو ان سے پہلے افغانستان ہوتے ہوئے یہاں آکر آباد ہو گئے تھے۔ بقیہ آرین ہندوستان کی جانب پامِرس کے نشیب میں دَردستان کے پہاڑی ملک میں رہ پڑے جن کی نسل سے آگے چل کر غیر متمدن "کافر" اور چترال اور گِلگِت کے باشندے پیدا ہوئے۔ ان میں سے بعض نے تو کشمیر کی پُرفضا گھاٹیوں کو اپنا مسکن بنایا جن کی نسل کی زبان موجودہ کشمیری ہے۔

اس کے بعد بھی جبکہ موجودہ ایران کی حدود قائم ہو چکی تھیں، ان کی نسلیں ایران سے آکر افغانستان میں اقامت گزین ہوئیں، اور اپنے ساتھ اپنی زبان کو بھی لیتی آئیں جو آگے چل کر پشتو کہلائی۔ اس زبان کو اب وہاں کے پٹھان قبائل استعمال کرتے ہیں۔ پشتو زبان ایک مکمل اور لچکدار زبان ہے مگر اہلِ مغرب کے کانوں کو بے سُری معلوم ہوتی ہے۔ آخر میں ہم ہندوستان کے اس معائنہ لسانی کو، جو غالباً سب سے پہلا معائنہ ہے، اس تاریخی حکایت کے ساتھ ختم کرتے ہیں۔ افغانستان میں یہ قصہ مشہور ہے کہ حضرت سلیمان (علیہ السلام) نے اپنے وزیر آصف بن برخیا کو حکم دیا کہ وہ دُنیا کی تمام زبانوں کے نمونے پیش کرے۔ وزیر موصوف جب اس مہم کو انجام دیکر لوٹا تو اس نے حضرت سلیمان کے دربار میں ہر زبان کا نمونہ پیش کیا۔ جب پشتو کی باری آئی تو اس نے تھوڑی دیر توقف کیا، پھر ایک مٹی کے برتن میں ایک چھوٹا پتھر ڈال کر اس کو زور زور سے ہلا کر کہنے لگا کہ "یہ ہے قریب قریب اس زبان کا نمونہ جسے افغانستان والے بولتے ہیں!" باایںہمہ پشتو زبان سعدی و خیام کی دلکش زبان کی خالہ زاد بہن ہے۔

میرے خیال میں مندرجہ بالا سطور میرے اس دعوی کی شاہد ہیں کہ اُن طریقوں کے مطالعہ کے لئے جن سے انسانوں نے زبان کے مسئلہ کو حل کیا ہے، ہندوستان ایک وسیع میدان ہے۔ یہاں

ایسی زبانیں پائی جاتی ہیں جن کے قواعد صوتی صرف تنوع الفاظ سے زیادہ تلفظ بنانے کی اجازت نہیں دیتے۔ اور وہ بڑی مشکل سے اُن عام خیالات کا اظہار کرسکتی ہیں جو ہمارے نزدیک بالکل معمولی اور عام ہیں۔ بعض ایسی زبانیں بھی ہیں جو انگریزی زبان کے ذخیرۂ لغت سے صفائی اور شستگی میں برابری کرتی ہیں۔ ہم نے ایسی زبانیں دیکھی ہیں جن میں ہر کلمہ ایک لفظ ہوتا ہے، اور ایسی بھی جن میں کلمہ پہ کلمہ لگاکر اس کی صورت ایک عظیم الشان جملہ کی بنادی جاتی ہے۔ ایسی زبانیں بھی یہاں پائی جاتی ہیں جن میں نہ اسم ہے نہ فعل اور ہمارے خیال کے مطابق ان کی صرف ونحو ہی کا پتہ نہیں ہے، اور بعض ایسی بھی جو اپنے نحوی قواعد کے لحاظ سے یونانی اور لاطینی کو ٹکر مارتی ہیں۔ ہندوستان میں بعض مقامات ایسے ہیں جہاں کے ہر پہاڑی قبیلہ کی ایک جداگانہ زبان ہوتی ہے ——— وہ زبان جو ایک یا دو پشتوں کے بعد خود اُس کے بولنے والوں کی اولادیں نہیں سمجھ سکتیں ——— اور دس دس ہزار میل کے رقبہ والے میدان ہیں جہاں صرف ایک زبان صدیوں کے لٹریچر اور تاریخ کے ساتھ شروع سے آخر تک یکساں بولی جاتی ہے۔ باایں ہمہ اس ملک پر مشرقی اسرار کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ ان زبانوں میں، یکے بعد دیگرے، ہمیں ازمنۂ گذشتہ کی غیر مسموع گنگناہٹ سنائی دیتی ہے، اُن ایام قدیمہ کی جبکہ آرین قوم ارض فلسطین کے دریاؤں کے اس پار اپنے گلوں کو چراتی پھرتی تھی، جبکہ انڈوچینی ابھی اپنے مقام یانگ ٹسی کیانگ سے باہر نہیں نکلے تھے، اور جبکہ کوئی قبل التاریخی ہندوستانی ٹیوسر[۵] (Teucer) خلیج بنگال کے اس پار سے لیکر انڈونیشیا تک اپنے ساتھیوں کو لیجانے اور وہاں سے مشرق میں پھرتے ہوئے بحر الکاہل میں آباد ہونے کی جرأت کررہا تھا۔ اور غالباً اسی زمانہ میں لیموریا کا برِ اعظم بھی موجود تھا جس کو بحر الہند کے تلاطم امواج نے دھوکر اس کا نام ونشان مٹادیا۔ آرین، تبتی برمی، آسٹروی یا دراویدی زبانیں اپنے اصل مساکن، اپنے مخصوص تمدن اور اپنی ترقی کے مختلف مدارج کو پیش کرتی ہیں، اور ان میں سے ہر ایک نے آخر کار زبانوں کے اختلاط اور میل جول کے مسئلہ کو حل کردیا ہے۔

زبان خیالات کا آئینہ ہے، بلکہ ایک جملہ میں لفظوں کی ترتیب بولنے والوں کی ترتیب خیالات کی آئینہ دار ہے۔ اور ہندوستان کے مرقع میں ہمیں نفس انسانی کی تصاویر کا ایک سلسلہ تہذیب و

[۵] یونانی بادشاہ کا شاہزادہ اور اجکس اعظم کا بھائی جو محاصرۂ ٹرائے میں تمام متحدہ یونانی افواج کیساتھ شریک جنگ تھا۔ ہومر کی ایلیڈ میں

تمدن کے اکثر مدارج میں دکھائی دیتا ہے ـــــ ایسی تصاویر جو نہایت ناموافق حالات کے موقع پر ان کی طاقت اور نئی ضروریات کے اظہار کے وسائل پر بخوبی روشنی ڈالتی ہیں۔ دریائے ایراوڈی کے کناروں پر بسنے والے خونخوار وحشیوں کا نفس سوائے "خیالات" کے کسی چیز کا تصور کرنے سے عاجز ہونا چاہئے۔ تاہم اسمیں ترقی کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ ضرورت کے مواقع پر وہ قوت ادراک بڑھانے کے لئے وسائل ایجاد کرسکتا ہے اور "خیالاتِ مجردہ" کو ظاہر کرنا سیکھتا ہے۔ وہ پہلا قدم اٹھاتا ہے جو اُسے وحشت و جاہلیت سے تہذیب و تمدن کی طرف لیجاتا ہے۔ اور بہیمیت سے نکال اُسے دنیائے قدیم و جدید کے فلسفوں کی شاہراہ پر گامزن کر دیتا ہے غرضکہ ہندوستان ہمارے سامنے لسانی مسائل، دماغی نشوونما اور ان کے ارتقائی مدارج کی مثالیں بکثرت پیش کرتا ہے۔

قاصدِ امید

(از سید انتظام الدین شاہ قادری کوثر اکبرآبادی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ)

آ۔ اے قاصدِ امید آ۔ تو کیا ہے اور کون ہے؟ مجھے نہیں معلوم۔ تجھکو کس چیز سے تشبیہ دوں؟ یہ بھی نہیں جانتا۔ میں اہل دُنیا سے سوال کرتا ہوں لیکن کوئی ایسا نہیں جو مجھے معقول جواب دے مجھے تمام دنیا بے رحم نظر آتی ہے پس تو آ اور ہلال عید، بن کر آ۔

میری مصیبتوں میں میرا کوئی شریک نہیں۔ میری تکلیف لاعلاج ہے۔ صبح کی ٹھنڈی ہوا جو مرغانِ خوش الحان کے چہچہوں کی دل کش آواز کان میں پہنچاتی ہے۔ سورج کا وہ نظارۂ دلکش جب وہ گوشۂ مشرق سے سر نکال کر اس پُر فضا زمین پر نگاہیں دوڑاتا ہے اور اس کی سُنہری اور رنگین کرنیں جو قطرات شبنم کو موتیوں کی طرح چمکا دیتی ہیں۔ رات کی خاموشی اور بلبل کا ترانہ جان نواز تیرے سوا میرے پژمردہ دل کو شگفتہ نہیں کر سکتے۔

پس آ۔ اے قاصد امید، آ۔

اور

مرکز آرزو بنکر آ۔

جواب استفسار جناب آزاد

(از مولٰنا سید اولاد حسین صاحب شاداں ۔ بلگرامی)

ذیل کا عروضی جواب مولٰنا سید اولاد حسین صاحب شاداں بلگرامی نے مدیر نیرنگ (رامپور) کے استفسار پر لکھا ہے جس کو اگرچہ رسالہ "نیرنگ" ہی میں شائع ہونا چاہئے تھا لیکن ازرہ کرم ہمیں "زبان" کے لئے مرحمت فرمایا ہے جس کو ہم بڑی خوشی سے درج کرتے ہوئے مولٰنائے موصوف سے امید کرتے ہیں کہ اسی طرح آیندہ بھی مستقل طور پر اپنی وسیع معلومات سے قارئین کرام کو مستفید فرمایا کریں گے۔

مولٰنائے موصوف ہندوستان میں مستثنےٰ قابلیت کے بزرگوار ہیں، فن عروض میں آپ کو جو مہارت تامہ حاصل ہے وہ محتاج بیان نہیں رسالہ نیرنگ (رامپور) کے صفحات آپکے علمی کارناموں کے شاہد ہیں جن کو دیکھہ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ فن عروض میں آپ اپنی مثال ہیں۔

ایڈیٹر

جناب منشی عزیز اللہ خانصاحب ایڈیٹر اور پروپرائٹر رسالہ نیرنگ رامپور تحریر فرماتے ہیں کہ جناب آزاد کاکوروی اپنی ایک غزل کے اس مصرع کی بابت

"عالم عالم سوختی و عالم عالم ساختی"

حقیر سے دریافت فرماتے ہیں کہ لفظ عالم ثانی سے عین دونوں جگہ اس مصرع میں کیا تقطیع سے گرتا ہے؟۔ اگر مصرع کی ساخت پر نظر کرکے جو مصنف کو پسند ہے بجنسہ برقرار رکھا جائے تو کوئی ہرج تو نہیں ہے یا مصرع ہی تبدیل کردیا جائے۔

جواب

ایک مصرع کے لکھنے سے اکثر متحقق نہیں ہوتا کہ غزل کس بحر میں ہے ۔ اگر جناب آزاد نے بحر رمل مثمن محذوف میں یہ غزل کہی ہے جس کا وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن دوبار ہوتا

ہے تو ضرور لفظ عالم ثانی کا عین دونوں جگہ اس مصرع میں تقطیع سے خارج ہے لہٰذا عروضیوں کے مسلمات کے موافق بحر مذکور میں یہ مصرع ناموزوں ہوگا کیونکہ عین کا تقطیع سے گرنا ان کے نزدیک ناجائز ہے۔ اس لئے ضرور مصرع تبدیلی کے لایق ہے۔ اگر جناب آزاد کو پسند آئے تو مصرع مذکور کو اس طرح بنا لیں۔

"عالمے را سوختی و عالمے را ساختی"

جو عروضی بجز مسمطات چہار گوشہ میں زحافات اذالہ و تسبیغ۔ حذف و قصر۔ وقف و کشف وغیرہ حشو میں لانا جائز سمجھتے ہیں وہ اس مصرع کو جبکہ واو عطف درمیان "سوختی و عالم" ہو بحر مدید مثمن سالم میں بروزن فاعلاتن فاعلن فاعلاتن فاعلن کہہ سکتے ہیں۔ اور یہ لحاظ حذف درمیانی رمل محذوف بھی کہا جا سکتا ہے گو یہ فرع رمل کی کتب عروض میں مرقوم نہیں۔

جناب قدر بلگرامی مرحوم کو زحافات مخصوصہ عروض و ضرب کو حشو میں نہ لانے کے بارہ میں اسقدر غلو ہے کہ جس کلام میں کسی استاد کے زحافات مذکور درمیان مصرع پائے جاتے ہیں تو جناب قدر ضرور کوئی تاویل فرماتے ہیں جس سے ان زحافات کا حشو میں آنا نہ پایا جائے۔ لیکن پھر بھی مفتعلن فاعلن چار بار کو بحر منسرح مثمن مطوی مکشوف بنایا ہے اور جناب محقق طوسی علیہ الرحمتہ کے اس قول سے کشف درمیانی کو جائز قرار دیا ہے حالانکہ کشف و وقف بھی عروض و ضرب سے مخصوص ہیں۔ قول محقق یہ ہے۔

چوں ایں وزن چہار خانہ شود مسمط یا غیر مسمط رکن دوم ہر مصراع ہم
مطوی مکشوف یا موقوف بکار دارند بر قیاس عروض و ضرب،

تفسیر اس قول محقق کی خود جناب قدر اس طرح فرماتے ہیں کہ جب وزن چہار خانہ ہو جائے تو ہر ایک خانہ قائم مقام ایک مصرع کا ہے۔ یعنی پورا وزن گویا مسطور ہو کر مضاعف ہو گیا ہے۔ بدیں صورت نصف مصرع ایسے وزن کا دراصل ایک مصرع ہو جائیگا۔ جب یہ ہوا تو کشف و وقف بر قیاس عروض و ضرب ٹھیک واقع ہو کر درمیان میں جائز ہوگا۔ یہاں زحافات مخصوصہ عروض و ضرب کے اس تاویل سے حشو میں لانے کے قائل ہو گئے مگر دوسرے مواقع پر بڑے شد و مد سے اس قانون کی مخالفت کرتے ہیں اور ایسی تاویل فرماتے ہیں جس سے ایسے زحافات کا حشو میں آنا نہ پایا جائے۔

کلام اساتذہ میں ایسے زحافات کا وقوع درمیان مصرع میں بکثرت پایا جاتا ہے۔

بدر چاچی
در بحر عمت غواص - لالائے دو چشم ماست
صد لولوئے تر انیک بر طشت زرش غلطاں

باوجودیکہ تین قافیے غیر قوافی قصیدہ نہیں لائے پھر بھی مصرعہ اولیٰ میں تسبیغ درمیانی کو صرف کیا ہے۔

بدر چاچی
آں شاہد تپ لرزہ ار — سرطانش چوں سازو نزار
صفرا بود بر خاک وخار — از تف حمیٰ ریختہ

اس شعر میں تین قوافی غیر قافیہ اصلی قصیدہ ہیں۔ تب اذالہ حشو میں صرف کیا ہے۔ حالانکہ اذالہ بھی عروض وضرب سے مخصوص ہے۔

اذالہ وتسبیغ وغیرہ کے حشو میں لانے پر جواز کی دلیل میرے نزدیک یہ بھی ہوسکتی ہے کہ تعریف قافیہ میں اہل فن یوں رقمطراز ہیں کہ:-

"وہ حرف یا حروف چند جن کو ابیات یا مصاریع کے آخر یا بمنزلہ آخر میں بالفاظ مختلفہ مکرر لائیں۔"

جب تعریف قافیہ میں قید آخر مصرع یا بیت کی تجویز کی جاتی ہے۔ پھر بھی مجوز مستطات چہار گوشہ میں تین قوافی غیر قافیہ اصلی قصیدہ سے آتے ہیں اور قید آخر مصرعہ یا بیت کی پروا نہیں کرتے۔ اس قاعدہ پر قیاس کرکے اگر زحافات مخصوصہ عروض وضرب کو رکن دوم وششم میں لائیں تو ہوسکتا ہے خصوصاً جب عمل اساتذہ اس قاعدہ کا مؤید ہے تو پھر ناجائز کیونکر کہہ سکتے ہیں۔

گو اس بحث کو استفسار سے زیادہ تعلق نہ تھا مگر ضمن بیان میں جب یہ مسئلہ آپڑا تو میں سمجھتا ہوں کہ ناواقف کیلئے افادہ سے خالی نہ ہوگا۔ اب میں پھر اصل سوال کیطرف رجوع کرتا ہوں۔

بہت سے اساتذہ اردو وفارسی گو کو الف وصل کے دھوکے میں عین کو تقطیع سے گرانے میں سہو ہوا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ عین کا تلفظ اہل زبان اردو وفارسی مثل الف کرتے ہیں۔ اہل عرب ہی عین کو اس کے مخرج کے ساتھ ادا کرنے کے عادی ہیں اس لئے غیر عرب عین میں دھوکا کھاجاتے ہیں۔ لیکن ایسا سہو عروضیوں کے نزدیک قابل معافی نہیں۔ چنانچہ میر شمس الدین فقیر علیہ الرحمۃ حدائق البلاغۃ میں

لکھتے ہیں۔

"مولانا ظہوری بیتے ازیں باب آوردہ و مورد طعن شدہ و آں بیت ایں ست ؎

بدستم دہ آں رشک یاقوت را

کہ سازم علاج عقل فرتوت را

عقل کا عین تقطیع سے خارج ہے۔ لیکن جناب میر غلام علی آزاد بلگرامی خزانہ عامرہ میں مصرع ثانی اس طرح تحریر فرماتے ہیں ؎ کہ سازم جواں عقل فرتوت را۔

ظاہر ہے کہ فرتوت کے مقابل" جواں" مناسب ہے نہ عقل

عاقل شاہجہان آبادی

ناتوانی تختہ بند یک مقام عاقل مباش　خاک بر سر میکند در خانۂ آئینہ آب

لفظ عاقل کا عین تقطیع میں نہیں آتا۔ جناب قدر فرماتے ہیں اگر مقام کی جگہ "مکان" ہو تو یہ عیب طرف ہو جاتا ہے

ولہ　اے بنقاب عارضت شعلۂ بال نگاہ　عکس تو در آئینہ یوسف مصری بچاہ

یہاں بھی عارض کا عین تقطیع سے خارج ہے اور کوئی تاویل بھی نہیں ہوتی۔

ناصر علی سرہندی　اے رگ جاں بہار ایں ہمہ بیرحمی چیست

خاک از مقدم تو خوں شدن عادت دارد

عادت کا عین تقطیع میں حذف ہو جاتا ہے۔

اہل ایران سے بھی یہ تسامح واقع ہوا ہے۔ خواجہ باقر عزت شیرازی

مرا پند خردمنداں بحال خود نمی آرد　بایں افسانہا مجنون عشق عاقل نمیگردد

عاقل کا عین خارج از تقطیع ہے۔

خاقانی　خاقانی عید آمد و خاقان بہ یمن جود　ہر کار کز خدائے بخواہد روا شود

عین لفظ عید کا تقطیع سے خارج ہے۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ عین باقی ہے مگر یائے تحتانی لفظ خاقانی کی تقطیع سے گر گئی۔ خواہ عین ساقط ہو یا یائے تحتانی دونوں کا سقوط ناجائز قرار دیتے ہیں۔ میر حسن دہلوی ؎

"اُس عہدے سے کوئی بھی نکلا نہیں" لفظ عہدے کا عین تقطیع میں نہیں آتا۔

باوجود ان امثلہ کے ان شواہد سے تمسک کرکے سقوط عین جائز نہیں ہو سکتا ہے یہی مسئلہ اہل فن ہے واللہ اعلم بالصواب۔

مترجمات

مسیح علیہ السلام کے وجود سے انکار

مندرجہ بالا عنوان سے ولایت کے مشہور اخبار نیشن نے اپنی تازہ اشاعت میں ایک مقالہ شائع کیا ہے جس کا ملخص حسب ذیل ہے:-

امریکہ کے ایک شخص جارج برانڈس نے (Jesus a myth) کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت مسیح کی شخصیت بالکل موضوع اور من گھڑت ہے، جیسے کہ ہرقلیس اور پرامیتھس کی شخصیتیں لوگوں نے وضع کرلی ہیں۔ یہ کوئی جدید نظریہ نہیں ہے، تنقید بائبل کے آغاز سے ہی اس کی ابتدا ہوچکی ہے جبکو تقریباً ڈیڑھ سو سال ہوچکے ہیں اور اس نظریہ کی ترقی یافتہ صورت کو پچاس سال سے زاید عرصہ نہیں گزرا۔ یقیناً یہ مسئلہ ارتقاء مسیحیت کے مطالعہ کی راہ میں حائل ہونے والی مشکلات کے لئے بہت جلد حل طلب ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ عہد نامہ جدید تاریخی حیثیت سے بالکل پایۂ استناد سے گرا ہوا ہے، اور کئی صدیوں تک اس کی صحت کے متعلق کوئی سوال پیدا نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ تاریخی تنقید کے اصول مدون ہونے سے پہلے کلیسائے عیسوی کا اقتدار و اثر پورے عروج پر تھا، اور صدیوں تک جو لوگ اس بات کو ماننے کے عادی ہوچکے تھے کہ ہومر کی الیڈ کی تلخیص جنگ ٹروجن (Trojan) کو برائے العین مشاہدہ کرنے والے ایک شخص نے تیار کی ہے (اور جو قسطنطین کے موضوع "عطیہ" کو بلاچون وچرا تسلیم کرتے رہے) وہ کبھی اس اساسی دستاویز پر اعتراض نہیں کرسکتے تھے جو ان کے مذہب کا مؤید تھا۔ حتیٰ کہ مارٹن لوتھر نے بھی اناجیل اربعہ کے اتحاد مضامین پر اپنے عدم اطمینان کو صاف طور پر ظاہر کردیا۔

۱۸۳۰ء میں جرمنی عالم کارل فرانڈرخ ہبردت نے اس نظریہ کو ترقی دی کہ مسیح فرقہ

آیسینز (Essenes) [۵] کی ایک پوشیدہ جماعت کے ہاتھ میں کٹ پتلی کی طرح تھا، جس کے ذریعہ سے وہ یہودیوں کو اپنی مادی رسم "مسیح" کے خیال سے ہٹانا چاہتی تھی۔

پونی صدی کے بعد برونو باور حیاتِ مسیح سے متعلق پختہ معاصرانہ شہادت کی عدم موجودگی میں کوئی معقول عذر تلاش کر رہا تھا۔ اس نے "مخفی انجمن" کے اس نظریہ کو ایک نئی تحریک دی، اور بڑی جرات سے اناجیل کی تاریخ تصنیف دوسری صدی عیسوی میں مقرر کرتے ہوئے اس بات کو ظاہر کیا کہ مسیح کا قصہ یزد بادشاہ روم کے عہد میں ایجاد ہوا ہے۔ اور اس پر آج تک حاشیہ آرائی ہوتی رہتی ہے۔ اس نے یہ استدلال کیا کہ عہد جاہلیت (قبل مسیح) کے فلاسفر، خصوصاً سینیکا (Seneca) عیسائیت کے ان اخلاقیات کی تدوین بہت پہلے کر چکے تھے۔ البتہ وہ اپنے خیالات کی عام اشاعت نہیں کر سکتے تھے اس لئے لوگوں نے ان کو ایک ایسی شخصیت سے منسوب کرنا چاہا جس میں "مافوق الفطرۃ" ہونے کی دلکشی پائی جائے۔ چنانچہ انھوں نے مسیح کا اسطورہ (myth) وضع کر لیا۔

اس میں شک نہیں کہ اس قسم کے نظریات تاریخی مشکلات کو حل کر دیتے ہیں، لیکن وہ اس "مافوق الفطرۃ مصنوعی شخصیت" سے تو بہر حال کچھ کم ہی قابل اعتماد ہوتے ہیں۔ معجزات کی اُن عقلی تاویلات کی طرح جو مسیح کو ایک طرح کا ہوڈینی بنا دیتے ہیں (جو دھوکہ بازی اور فریب دہی کی وجہ سے بہت ہر دلعزیز بنگیا تھا) یہ لوگ ان معجزات کی بہ نسبت اپنے نظریوں کے لئے زیادہ اعتماد کے خواہاں نظر آتے ہیں۔ اور اس بات کو یاد دلاتے ہیں جو کسی عقیدت مند نے ایک مشہور معقولی سے طعناً کہی تھی کہ "وہ ہر بات کو ماننے کے لئے تیار ہے بشرطیکہ وہ بائبل میں نہ ہو!" دساطیر دراصل اسقدر موضوع اور محدث نہیں ہوا کرتے جسقدر کہ ان کی روایت کا طریقہ ہوتا ہے یعنی کہ وہ ایک کے منہ سے نکل کر دوسرے کے منہ تک پہونچتے پہونچتے کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔ اگر مسیح کی شخصیت ایک قصہ کہانی ہے تو وہ کسی مخفی انجمن کی وضع و اختراع نہیں ہے بلکہ رفتہ رفتہ انسانی ضرورت اس کو وضع کرنے کی داعی ہوئی ہے۔

یقیناً عیسائی یا ملحد علما کی ایک کثیر جماعت اس بات پر اتفاق کرے گی کہ "روایات کا مسیح"، "تاریخی مسیح" سے بالکل جداگانہ ہے اور اکثر لوگ اس کو تسلیم کریں گے کہ یہ اس طور خواہ کتنا ہی غلط اور قابل اعتراض

[۵] یہودیوں کا وہ فرقہ جو مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں تھا۔ ۱۲

ہوتاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ ضرور کوئی تاریخی شخصیت ہونی چاہیے جس کے متعلق لوگوں نے بعد میں مبالغہ کر دیا ہے ۔ ع

تا نباشد چیزکے مردم نگویند چیز ہا

مسیح کے وجود سے متعلق کوئی اطمینان بخش شہادت ہمارے پاس موجود نہیں ہے ۔ اور اگر یوسیفوس کا دستیاب شدہ ترجمہ، جس میں مسیح کا ذکر موجود ہے، (اور جسے عام طور پر زمانۂ مابعد کی تفسیر سمجھا گیا ہے) فی الحقیقت اتنا ہی قدیم ہو جتنا کہ کہا جاتا ہے تو مسیح کے تاریخی وجود کا یہ ایک بیّن ثبوت ہو سکتا ہے۔

برنرڈ شا کی تھیوری

انگریزی کا مشہور ڈراما نویس اور ادیب برنرڈ شا انگلستان کا ایک سربرآوردہ شخص ہے جس نے حال ہی میں اپنے علمی کارناموں کے صلہ میں "عطیۂ نوبل" حاصل کیا ہے، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی اشاعتِ جدیدہ میں برنرڈ شا پر ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں سوانح حیات کے علاوہ اس کے علمی و ادبی کارناموں کا تذکرہ ہے ۔ اسی مضمون میں شا کی تھیوری مندرجۂ ذیل الفاظ میں اجمالاً بیان کی گئی ہے:۔

"امراض، مفلسی، اور جنگ ۔ یہ سب افعال خدا کے خلاف کئے جاتے ہیں اگر دنیا نے اس سیلاب کو نہ روکا اور خدا کے مقصد کو پورا کرنے کی کوشش نہ کی تو وہ بہت جلد نسل انسانی کو دنیا سے ناپید کر دیگا جیسا کہ ان سے پہلے اس نے شعرانی حیوانات (Mammoth) کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دیا ہے ۔

"تمھیں ایسی زندگی بسر کرنی چاہیے کہ جب مرنے لگو تو خدا پر تم اپنا قرض چھوڑ جاؤ" کیا یورپ کے مادہ پرست اس صدائے حق نیوش پر گوش برآواز ہوں گے ؟

لفظ میمن انگریزی زبان میں

کاٹھیاواڑ کے مسلمانوں میں ایک متمول تاجر قوم میمن کہلاتی ہے ۔ ہمیں نہیں معلوم کہ یہ

کس زبان کا لفظ ہے اور کسطرح اختیار کیا گیا۔ مگر انگریزی ادبیات میں اس کو استعمال ہوتے دیکھ کر تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ اسی کا ہمنوا لفظ (mammon) ہے جس کے معنی سُریانی زبان میں دولت وثروت کے ہیں! (ملاحظہ ہو ملٹن کی فردوس گم شدہ باب پہلا)

اسپنسر کی نظم فری کوئین (پریوں کی ملکہ) میں میمن ایک کیرکٹر ہے جس کی زبانی یہ الفاظ منقول ہیں:-

"اگر سر گایون میری اطاعت کریگا تو وہ دنیا میں سب سے بڑا دولتمند آدمی ہوگا"

(دیکھو کتاب مذکور باب ۲ فصل ۷)

گویا یہاں پر میمن کو "دولت کا دیوتا" بتایا گیا ہے!

بین جانسن اپنی کتاب "دی آلکیمسٹ" (کیمیاگر) میں "سر اپیکیور میمن" اُس آدمی کے لئے استعمال کرتا ہے جو "لذات دنیوی کا حریص" ہو۔

اسی طرح لوقا کی انجیل (۱۶ : ۹) میں مال و دولت کو "ناراستی کا میمن" بتایا گیا ہے۔

اگر یہ صحیح ہے کہ اسم کا اثر مسمی پر ہوتا ہے تو تسلیم کرنا چاہیے کہ (خواہ اس کی اصلیت اور وجہ تسمیہ کچھ ہی ہو) ہمارے میمن بھائیوں کی قابل فخر دولتمندی اور خوشحالی پر اس کا اثر ضرور پڑا ہے۔ اور اُنکے ترقی کو دیکھتے ہوئے یہ بات ذرا بھی حقیقت سے بعید نہیں معلوم ہوتی۔

ادبیات

مصوّر فطرت

اقبال جسطرح ذوق شعری میں بے مثل تھا، اسیطرح وہ مصوری میں بھی اپنی نظیر نہیں رکھتا تھا۔ اگر وہ ایک طرف جذبات و محاکات سے کسی شعر کا ایک مجسمہ قائم کر دیا کرتا تھا۔ تو دوسری طرف کاغذی پیرہن پر وہ مناظر فطرت میں اس حسن و خوبی کیساتھ رنگ آمیزی کرتا تھا کہ اصل و نقل میں تمیز نہیں ہو سکتی تھی۔ جب کبھی وہ کسی پھول یا کسی کلی کا نقش کھینچتا تھا تو اظہار رنگ کے ساتھ ہی، بو کا نمودار کر دینا بھی اسی کا کام ہوتا تھا۔

ایک بار اس نے موسم برشکال کا منظر کھینچا، جس میں کالی گھٹاؤں کا اُٹھنا، بجلی کا چمک کر چھپنا، اور پانی کا برس کر بند ہونا تو ایک معمولی بات تھی۔ لیکن اس وقت حیرت و استعجاب کی انتہا نہ رہتی تھی جبکہ اس منظر کو بغور دیکھنے سے ایسا یقین ہونے لگتا تھا کہ بجلی کی کڑک اور بادل کی گرج سے کان متاثر ہو رہے ہیں اور ٹھنڈی ہوا چلتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ اس تیقن میں اس وقت اور بھی اضافہ ہو جایا کرتا تھا جبکہ شدید موسم گرما میں اس منظر کو پیش نظر رکھنے سے ایسا معلوم ہونے لگتا تھا کہ صدائے برق و برودتِ ہوا، سامعہ و لامعہ سے مس ہو کر روح کو ایک گونہ فرحت بخش رہی ہے۔ غرضکہ وہ فطرۃً شاعر بھی تھا اور مصور بھی۔ ایسا مصور جو اپنے فن میں یکتائے زمانہ تھا۔ لیکن اس شغل سے اس کی کبھی تسکین نہیں ہوئی بلکہ ایک نامعلوم کاوش و جستجو میں مبتلا ہو گیا۔

شہر سے کچھ فاصلہ پر ایک گاؤں تھا۔ جہاں چند کچے مکانوں کے علاوہ، ایک نیم پختہ مکان بھی تھا جس کے دروازہ کے سامنے قریب تر ایک چھوٹا سا باغیچہ لگا ہوا تھا۔

نمود صبح کی فضائے لطیف میں ٹھنڈی ہوا کی عطر بیزی میں صحرائے غنچے حسب معمول زیر لفافہ رہا کرتے تھے، اور ہر صبح منتظر ہوتے تھے کہ وہ اپنے گل بیگانہ کو دیکھیں اور اس ذرکو اُس پر سے نچھاور کریں اور خود بھی گلے کا ہار بن کر نثار ہو جائیں۔

اقبال ایک صبح اس منظر سے لطف اندوز ہو رہا تھا، اور چاہتا تھا کہ اس بہترین منظر کا نقش صفحۂ قرطاس پر قائم کرلے، کہ دفعتہً اس کی غیر متحرک و ساکن نگاہ میں ایک چشمک پیدا ہوئی، اسنے یہ محسوس کرکے کہ شاید سورج کی یہ شعاع اولین میری نگاہ میں پیوست ہو رہی ہے، آنکھیں بند کرکے گردن موڑی ہی تھی کہ دفعتہً سامنے باغیچہ میں ایک کیفیت نورانی، مافوق حسن انسانی، اور اعجاز حقیقت نسوانی یعنی کہ ایک زندہ جادو، یا ایک صحرائی حسن تھا، جس کی بوئے دوشیزگی بوئے گل کے ساتھہ مل کر گاؤں کی ساری فضا کو معطر کرنے لگی۔ لیکن وہ اس سے گاؤں کے رہنے دلبے والے بالکل بیخبر تھے۔

یہ غزال رعنا و آہوئے دشت ایک سفید ساری میں (جو کچھ میلی تھی) ملبوس تھی، اور ہرن کی طرح اس باغیچہ میں کلیلیں بھر رہی تھی۔ اس کا قد بلند قیامت زا تھا۔ اس کی شہلائے چشم بادہ ریز تھی۔ اس کے سیاہ و دراز گیسوں کے بیچ میں اس کا حسین وضو فشاں چہرہ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کالی گھٹاؤں کے درمیان آفتاب چمکنے لگتا ہو تناسب اعضا کے ساتھ کہربائی حصہ جسم کے نشیب و فراز میں کشش سحر زا تھی۔ اور معصوم حسن کا چشمہ، پھوٹ پڑنے والے شباب کے دریا میں گر رہا تھا۔ یا یہ کہیے کہ بادۂ تند مینائے خام میں بھری جا رہی تھی۔ ایک طرف یہ دوشیزہ پھول توڑکر ہار بنانے میں مشغول تھی۔ اور دوسری طرف مصور فطرت اقبال اسکی تصویر کھینچنے میں منہمک۔ اقبال کے ہاتھہ کانپ رہے تھے۔ اس کے قلم میں لرزش تھی۔ اور اس کی ساری روح اس کے جسم سے نکل جانا چاہتی تھی۔ دفعتہً یہ سنبھلا اور ہوش قائم کئے۔ سب سے پہلے اسنے قلم کی باریک نوک سے اس کے تمام جسم کا ایک نقش قائم کیا، اس خیال سے کہ کہیں یہ لڑکی اپنا ہار گوندھکر چل نہ دے۔ اس کے بعد جب اس کا قلم گھنے و سیاہ گیسو بنانے میں مصروف ہوا تو اسے خود محسوس ہونے لگا کہ آسمان پر کالی گھٹائیں چھا گئی ہیں۔ پھر جب اس نے آنکھیں بنانی شروع کیں اور غشاوۂ بصر پر جب باریک و نازک رگوں میں ارغوانی رنگ بھرنا شروع کیا تو اسپر سکر طاری ہونے لگا۔ لیکن جب اس نے دوشیزہ کے اس پرشباب حصہ جسم پر قلم کو جنبش دی، جسمیں فطرت نے کوٹ کوٹ کر بجلیاں بھر رکھی تھیں جس میں قوت کہربائی پوشیدہ تھی۔ اور جس کا برقی انجذاب قوت بصر کو جذب کر رہا تھا، یعنی کہ جسم کا وہ فراز حصہ جو مخزن برقیات و معدن کہربائیات تھا، اور جس کا تصور اقبال کی روح کو تحلیل کر رہا تھا تو اس وقت نشہ کی فراوانی سے یہ جھومنے لگا۔ اور شدت سرور سے اسپر ہذیان طاری ہونے لگا۔

بالآخر جب یہ پاؤں کی نازک و رنگین انگلیاں بنانے میں مشغول تھا تو اس وقت اس کا قلم اور یہ خود سکتہ میں گر گیا، اور اس کے منہ سے مسرت انگیز صدا نکلی، جس کا مفہوم یہ تھا۔

"میں نے مقصدِ زندگی پالیا۔ اب اس دنیا میں مجھے کسی شئے کی ضرورت نہیں پھر کیا دیر ہے"؟

یہ کہا اور اس پر حیرت و سکوت طاری ہوگیا۔ اُسکی نگاہیں تصویر پر جم کر رہ گئیں اب اسے محسوس ہونے لگا کہ تصویر نے ابھر کر ایک جسم اختیار کرلیا ہے۔ اس سے اس کی روح میں ایک نوع کا ارتعاش پیدا ہونے لگا۔ لیکن آہستہ آہستہ اس نے اس کو گلے سے لگا کر ایک مدید بوسہ لیا۔ جس سے اسے محسوس ہونے لگا کہ اسکی پیشانی عرق ریز ہے اور صورت سے اظہار انفعال۔

کچھ وقفہ کے بعد یہ اس دوشیزہ کے پاس گیا، اس خیال سے کہ یہ تصویر اس کو دیدے۔ اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر تصویر لڑکی کو دی۔ لڑکی نے تصویر دیکھ کر ایک تبسم نگاہ اقبال پر ڈالی دفعتہ اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور یہ بے ہوش ہو کر گر پڑا اور خون منہ سے جاری ہونے لگا۔

لڑکی سہم کر اس کے پاس آئی۔ اور ایک محبت بھری نظر اس پر ڈالی ہی تھی کہ گرم آہ کے ساتھ خود بھی پھول کی طرح کُملا کر رہ گئی۔

امام اکبر آبادی

مناظرِ قدرت

از سید انتظام الدین شاہ قادری کوثر اکبر آبادی مسلم یونیورسٹی (علی گڈھ)

آج صبح سویرے۔ اتنے سویرے کہ چڑیوں نے اپنا صبح کا گیت بھی شروع نہیں کیا تھا میں باہر نکلا، اندھیرا اور اجالا اس طرح دست و گریبان ہو رہے تھے کہ یہ امتیاز کرنا مشکل تھا کہ اسوقت تک پالا کس کے ہاتھ رہا۔ لیکن پانچ منٹ کے اندر روشنی اچھی طرح نمودار ہوئی اور اندھیرا زائل ہوگیا یہ وقت بھی عجیب وقت ہے صبح کی فرحت بخش ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے سپیدہ صبح کا نمودار ہونا بھی دلفریب ہے۔ مرغان خوش الحان کے چہچہے بھی دلکش معلوم ہوتے ہیں۔ شاعر بھی اسکی خوبیوں اور لطافتوں سے واقف ہے اسکا ذکی الحس دماغ اس کیفیت سے متاثر ہوتا ہے اور وہ باتیں ہمکو بتلاتا ہے جو کبھی ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں آئی ہونگی یہ وقت سونے کیلئے نہیں یہ وقت نیچر کے بننے سنورنے کا ہے وہ رات بھر کی اوس سے اپنا منہ صاف کرتی ہے اور اپنے محبوب (سورج) کے نکلنے سے قبل ہی آراستہ و پیراستہ ہو جاتی ہے —— میرے کانیں ہزاروں آوازیں پرندوں کیڑے مکوڑوں اور پتوں کی آرہی تھیں میں اس عالم میں تھا جب خوشی کے خیالات انتہا پر پہنچ کر رنج و غم کے خیالات دلمیں پیدا کر دیتے ہیں —— میری روح نیچر کے مناظر سے دلچسپی رکھتی ہوئی معلوم ہوتی تھی بلکہ مجھے خیال تھا کہ میں بھی پرندوں اور نیچر کی تمام خوشنما چیزوں کیطرح خوش ہوں —— یکایک مجھے خیال آیا کہ انسان ایک دوسرے کا دشمن ہے اور اسی باعث نیچر کی دوسری اشیا کیطرح اسمیں ہمدردی

حقیقتِ مجاز

(جناب ابو الخیال قاضی امانت علی صاحب تسکین ٹبالوی)

(گذشتہ سے پیوستہ)

(۶)

خط ملا سرسری نگاہ سے دیکھا اور پھینک دیا۔ محمود کے لئے ان لفظوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی جو انہیں بار بار پڑھتا۔ سوچتا۔ سمجھتا کہ اس خط میں کیا لکھا ہے اور صغرا کہانتک درست کہتی ہے۔

"مجھے اُس صغرا کی کیا پرواہ۔ اُس سے بدرجہا بہتر۔ حسینہ۔ باسلیقہ۔ پڑھی لکھی اور علم موسیقی سے واقف عذرا موجود ہے اور وہ سب خوبیاں جو ایک شریف نوجوان مرد کی بیوی بننے کے لئے ایک عورت میں ہونی چاہئیں وہ سب عذرا میں ہیں۔ اگر مکان بک گیا۔ جائداد تباہ کردی تو بلا سے۔ آخر میں نے بُرا کیا کیا۔ روپیہ تھا اُس طرح نہیں اسیطرح صرف کر دیا۔ لوگ شادیوں میں گھر بار بیچ کر لگا دیتے ہیں اور پھر اون کی مرضی کے موافق بیوی نہیں ملتی اور اگر میں نے عذرا کے لئے اس تمام جائداد کو ان معنوں میں استعمال کرلیا تو کیا ہرج ......؟"

چٹھی رساں کی آواز نے محمود کو ان خیالات سے جلد رہائی دلا دی۔ وہ فوراً نیچے گیا اور ایک بیرنگ خط وصول کرلیا۔

"______ قدرت کا فیصلہ ہمیشہ اٹل رہا ہے۔ اور یہ وہ فیصلہ ہے جسے دُنیا کی کوئی طاقت نہیں توڑ سکتی۔ میرا یہ خط تمہارے دل پر میری طرف سے بہت شکوک پیدا کریگا۔ مگر دیکھنا یہ ہے میں کہانتک درست ہوں۔ میں جب دہلی پہنچی تو نواب اکرم بیگ کا چھوٹا بھائی نواب اکمل بیگ مجھے دیکھتے ہی ہزار جان سے مجھ پر فریفتہ ہوگیا۔ اُس کے لفظوں کی صداقت نے میرے دل پر وہ گہرا اثر کیا جو تمہاری محبت گذشتہ چھ ماہ کے عرصہ میں نہ کرسکی۔ میرے دل نے اس امر کی گواہی دیدی کہ نواب صاحب کسقدر پاک خصلت اور صاف دل ہیں۔ ان کی ایک ایک بات میرے پسند خاطر ہے تمہیں اچھی طرح معلوم ہو

کہیں بازاری رقاصہ کہلوانے کے نام سے کسقدر نفرت کرتی تھی - اور میری شروع ہی سے یہ خواہش تھی کہ کسی شریف نوجوان آدمی کے گھر بیٹھ جاؤں الحمدللہ میں اپنے ارادوں میں کامیاب ہوگئی - میرے دل وجان کے مالک و مختار بس وہی نواب صاحب ہیں جنھوں نے آگرہ پہنچکر میرے ساتھ شادی کرلی - دہلی سے مجھے لکھنؤ آنا تھا اور وہاں سے اسی غرض کے لئے آگرہ جانا پڑا - میری بھی تمنا ہے کہ اپنے خاوند کے آغوش محبت میں جان دیدوں - میرے لئے اُن کی ہستی قابل پرستش اور بہترین نعمت ہے اور میں ہی جانتی ہوں کہ وہ مجھے کہانتک عزیز ہیں - اُن میں وہ صفات اور وہ خوبیاں موجود ہیں جو مجھے تم میں دکھائی نہیں دیتیں - میرے دل میں اگر صاف کہوں اور تم بُرا نہ مانو تو تمہاری محبت بالکل نہ تھی - وہ بھی فقط امی جان کے کہنے پر تمہاری محبت کا جواب دیدیا کرتی تھی - میرے دل نے تمہیں مطلقاً قبول نہیں کیا اور نہ ہی تم میں اسقدر دلفریب خوبیاں تھیں جو مجھے گرویدہ کرسکتیں - بس اب یہی اچھا ہوگا کہ تم مجھے بھول جاؤ اور ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ - اب میں وہ نہیں ہوں جو کبھی رقاصہ تھی - میرا نام بھی اب بازاری لفظوں میں نہیں آسکتا - میں یہ سب کچھ جانتی ہوں کہ یہ خط پڑھکر تم پر کیا کچھ نہ گذرے گی مگر حق گواہ ہے کہ میں مجبور ہوں جس چیز کو میری آنکھیں پسند نہیں کرتیں جس کو میرا دل قبول نہیں کرتا اوس کو لیکر میں کیا کروں گی - جس کے پاس ایک لمحہ کے لئے بیٹھنے کو طبیعت نہیں چاہتی اُس کے پہلو میں تمام عمر کس طرح بسر کردوں - مگر خدارا میرے ملنے کی ہرگز سعی نہ کرنا ورنہ نواب صاحب تمہیں تکلیف پہنچائیں گے - لکھنے والی بس وہی جو کبھی عذرا تھی"

(۷)

ناامیدی کی گھٹا بند تاریکیوں میں چھپنے والا - مرکزِ یاس کے نقاط تک ختم ہوجانے والا - میری زیست اور مابعد کی زیست کو بدنام کرنے والا تو ہی فقط تو ہی ایک جنس ہے جس کی ایک ایک رگ میں عذرا کی محبت ہے - تو برباد ہو کہیں غارت ہو - ڈوب مر تاکہ تیرے ساتھ عذرا کا خیال بھی غارت ہوجائے تونے مجھے کہیں کا نہ رکھا - دُنیا اور آخرت دونو میری آنکھوں میں اندھیر ہیں اے عذرا.............اے خوبصورت عذرا.............میں مستقبل کی توقع میں تھا - میں سوچتا تھا کہ آنے والے متبرک دور میں اپنی زندگی تمہاری معیت میں گذار دوں گا - اور یہی خواہش تھی کہ میرا جام زرین حیات تیرے سامنے موت کے ہاتھوں چھلک کر تمام ہوجائے مگر.............مگر افسوس.............یہ

سب امیدیں خاک میں مل گئیں جس طرح صبح کے وقت شبنم کے باریک قطرے طلوع آفتاب سے فنا ہو جاتے ہیں اسی طرح میں اپنی آرزوؤں امیدوں کے حصول کی ناکام کوشش کی وجہ سے اپنے آپ کو اس صفحۂ ہستی سے ہمیشہ کے لئے کھو بیٹھا ہوں - اب مجھے کامل یقین ہو گیا کہ باہمی محبت سے متحد ہونے میں اس دنیا کی کوئی طاقت اتفاق نہیں کر سکتی اور جو کچھ عشق و محبت کے افسانے سننے جا رہے ہیں وہ یقیناً واقعات سے خالی ہیں - جب اسے عذرا .... اسے خوبصورت عذرا .... ایک پاک روح کی محبت تیرے دل پر اتنے عرصہ میں اثر نہ کر سکی تو کب امید ہو سکتی ہے کہ محبت کا پاک اور استوار رشتہ اس دنیا میں کسی کے ساتھ منسلک ہو سکے گا؟

آہ! عذرا !! .... یہ وہی پتھر ہے جس پر ہم دونوں کبھی آ کر پہروں بیٹھا کرتے تھے .... یہ وہی پتھر ہے .... جس تک دریا کے پانی کی لہریں مست ہو ہو کر تیرے پاؤں کو مس کیا کرتی تھیں .... جب تک .... بیشک یہ وہی پتھر ہے جس پر ہم دونوں ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈال کر اپنی محبت کے پرانے واقعات کو دہرایا کرتے تھے .... آج میں ہوں اور یہ اکیلا پتھر .... عذرا، آ، دیکھ .... دیکھ عذرا یہ کہ دریا کا پانی کس بیتابی سے مجھے اپنے آغوش میں لینے کے لئے میری طرف بڑھ رہا ہے، آہ .... یہ درست ہے کہ میں اب زندہ نہیں رہ سکتا، مجھے یہ دریا کا پانی وہاں پہنچا دیگا جہاں میری پلید روح بھی دُرکار دیجائیگی مگر کسی متبرک دہلیز سے ڈھاسنا لگائے تیری آمد کا آخری منتظر .... منتظر رہونگا جہاں تجھے معلوم ہو جائیگا کہ میں ....

....

....

———— دریا کا پانی اس وقت زوروں پر تھا ایک خفیف جھٹکا محمود کے لئے کافی ہوا - پانی کی لہروں میں اضطراب نمودار ہوا - بہتے ہوئے پانی کی سطح پر پہلے چھوٹا پھر لمبا سا دائرہ پیدا ہوا - پھر اور بڑھا - وسیع ہوا - یہانتک کہ پانی کی لہروں میں بہت جلد پنہاں ہو گیا -

حسنِ بیان

مقصدِ سعیِ حیاتِ ناتواں بر آئے کاش
حاصلِ صد خرمنِ دل ہے نگاہِ برق پاش

اوس کا ذوقِ جستجو بھی ہے جنونِ جستجو
جس کو منزل پر پہنچکر پھر ہو منزل کی تلاش

دشت میں بھی لے رہا ہوں میں گلستاں کے مزے
دستۂ گل بن گئی ہے تن پہ کانٹوں کی خراش

گو رہا میں خشک لب، پھر بھی نہ دامن بچ سکا
دستِ ساقی کا کوئی دیکھے تو حسنِ ارتعاش

دل، جسے کہتے تھے نزہت گاہ حسن و عشق سب
آج وہ دل ہے شبابِ آلودہ امیدوں کی تلاش

اب تو گھر بھی اک بیاباں کا نمونہ بن گیا
اے جنونِ کار فرما تا قیامت زندہ باش

درد بھی تا حدِّ امکانِ تحمل دل میں ہے
تا نہ ہو جائے کہیں دُنیا میں رازِ حسن فاش

دل سی نازک چیز کا ہر وقت کھٹکا ہے مجھے
انکی نظروں سے کہیں گر کر نہ ہو یہ پاش پاش

سرد مہری سے زمانہ کی طبیعت بجھ گئی
دل ہے پہلو میں کہ گویا برف کی ہے کوئی قاش

قیصر (بھوپال)

چشم جانان

کیا کہوں اس کی کیسی آنکھیں ہیں | جھیل کی سطح جیسی آنکھیں ہیں
یہ وہ جادو بھری ہیں آنکھیں ہاں | جن میں شوخی ہے اور شرم نہاں
شرم کے ساتھہ جذبۂ الفت | ہے سرور اس کا مایۂ راحت
ہے ان آنکھوں میں اک کشش ایسی | کیسی ہی رات کی ہو تاریکی

اپنی جانب یہ کھینچ لیتی ہے
مانع اسکی نہیں ہے کوئی شے

خوشنما آنکھیں یہ سمندر ہیں | ولولے ایسے اس کے اندر ہیں
کوشش وسعی لاکھہ کیجے، مگر | دیکھہ سکتی نہیں ہے اُن کو نظر
جس طرح موسم بہاری میں | آسماں ہو۔یہ ہیں ویسی ہی آنکھیں
ان رسیلی نشیلی آنکھوں سے | کیوں نہ ہو جائے بڑھکے عشق مجھے
ہیں یہ آنکھیں بصد شکوہ و شان | مثل توام ستاروں کے تابان
روشنی کا منارا انہیں کہئے | منتظر ان کے دید کے رہیے
رکھتا ہوں ان کو اپنی نظروں میں | تاکہ نکلیں مری تمنائیں

ایسے روشن منار ہیں ہادی
پھر تو گھبرا نہ جاؤں گا میں کبھی

ہچکچاتا ہوں آنکھیں کہنے سے | اِن کو۔یہ تو ہیں صاف آئینے
عکس ان آئینوں میں الفت کا | دیکھہ لو صاف ہے نظر آتا
ہاں، مجھے خوب ہی یاد وہ دن | بھول جاؤں اُسے نہیں ممکن
نظریں دونوں کی جب ملیں باہم | ساتھہ ہی روحیں ہو گئیں ہمدم
آنکھہ سے اُسکی میری آنکھہ ملی | نکلی دل سوز اک چنگاری

اُف! نظر، ہائے وہ ترے غمزے
وہ کچوکے تری کٹاری کے
ابرُوؤں اور پلکوں میں سے تری
مدہ بھری آنکھیں ہیں غضب ڈھاتی

رقص کرنے پہ جب وہ آتی ہیں
ہر گھڑی بجلیاں گرا تی ہیں

آنکھ سے اُس کی آنکھ میری ملی،
ہوئی بوچھاڑ پھر تو تیروں کی
غلط اندازی کی جو اُس نے نگاہ
دفعتًہ دل سے میرے نکلی آہ

نگہ لطف سے جو پھر دیکھا
ہوگیا پھر میں جیسے کا تیسا،

کیا زیارت مجھے ان آنکھوں کی
اے خدا پھر نصیب بھی ہوگی
وہ کن انکھیوں سے دیکھنا اُس کا
اُسکا دیکھکر آنکھیں پھر چرا لینا
کیا کہوں کیسی اُس کی ہے یہ ادا
دل یہ کہتا ہے کیجے جان فدا

اے خدا! کاش پھر وہ وقت آئے
دل کی حسرت مری نکل جائے

(ماخوذ از انگریزی)
شاکر (میرٹھی)

بیاض حضرت کوثر اکبر آبادی (علیگ)

ہر جنبش نظر میں ندامت کی اک جھلک (لا اعلم) اس اعتراف جور کے قربان جائیے
ہزار بار ہے دیکھا کہ ان کے چہرے سے (لا اعلم) نظر جو ہٹ گئی آنکھوں میں روشنی نہ رہی
نشۂ مے آنکھ میں کچھ نیند کچھ بیداریاں (دلگیر) پھر کسی کو بزم میں یوں جلوہ آرا دیکھئے
میرے رونے کا جسمیں قصہ ہے (جوش) عمر کا بہترین حصہ ہے
نیچی نظروں سے گذر جائیں گذرنے والے (فانی) دل کی ٹھہری ہوئی دُنیا تہ و بالا نہ کریں
منہ چھپانا تھا انہیں پہلے ہی روز (لا اعلم) اب کیا پردہ تو کیا پردہ کیا

نیرنگ زمانہ

لاتی ہے رنگ کیا کیا نیرنگیِ زمانہ — پیشِ نظر کرشمے رہتے ہیں اس کے کیا کیا
اک نقش بوالعجب ہے یہ عالمِ طلسمی — جادو بھرا ہوا ہے اسکا ہر اک تماشا
حیرت فزائے دیدہ اس کا ہر ایک منظر — رنگ فریب ہر دم اس کا ہر ایک جلوا
تارا بنا ہوا ہے آنکھوں کا ہر بشر کی — پنہاں نظر نظر میں ہے نورِ حسن اس کا
وہ دلفریبیاں ہیں اس کی ادا ادا میں — ہر دل فدائے صورت ہر چشم دید شیدا
دل سینکڑوں اڑائے آنکھیں ملا ملا کر — ہے چشم سحرفن میں جادو کسی پری کا
چالوں سے اسکی فتنے اٹھتے ہیں ہر قدم پر — رفتار ہے مقرر محشر کا اک نمونا
حیرت میں ڈالتا ہے رنگت بدل بدل کر — بازی گری ہے اسکی ادنیٰ سا اک کرشما
ممکن نہیں نکلنا دامِ بلا سے اس کے — ہر رشتہ محبت ڈالے ہوئے ہے پھندا
رکھتا ہے گردشوں میں ذرات ہر کسی کو — گردوں سے کم نہیں ہے کچھ اسکا دور دورا
لا ڈالتا ہے سب کو گرداب نیستی میں، — یہ موج بحرِ ہستی ہے اسی کا اک کنارا
بربادیاں لگی ہیں ہر سو قدم قدم پر — دشوار ہے بشر کو اسمیں سنبھل کے چلنا
جو سر ابھارتا ہے ہوتا ہے سرنگوں وہ — یکساں نگاہ میں ہے پست و بلند اسکا
حاصل غم توام ہے اسمیں ہر اک بشر کو — پاتے نہیں خوشی کا نام و نشان اصلا
نقشہ ہے راحتوں کا تصویر رنج و غم کی — آلام نے اڑایا عیش و طرب کا خاکا
آغاز شادمانی انجام صد الم ہے، — ہنسنا کوئی گھڑی کا ہے عمر بھر کا رونا
محلوں کے جو یہاں پر کل خواب دیکھتے تھے — ظالم نے آج انکو زیرِ زمیں سلایا
سب کو مٹا مٹا کر اک دن مٹے گا خود بھی — ہستی میں اس کی پنہاں ہے رنگ نیستی کا
تصویر اس جہاں کی اک نقش ہے خیالی — دھوکے میں ڈالتا ہے انساں کو اسکا نقشا
بہتر یہی ہے اس سے دل کو بچائے رکھئے — اچھا نہیں ہے رونق چالوں میں اسکی آنا

رونق (دہلوی)

یا للعجب

سمجھتا ہوں دم بھر میں یہ دم نہیں ہے مگر پھر بھی خوش ہوں کوئی غم نہیں ہے
تعجّب تعجب تعجّب تعجّب

لحد کا بھی ڈر ہے مگر ہنس رہا ہوں سفر کا خطر ہے، مگر ہنس رہا ہوں
تعجّب تعجّب تعجّب تعجّب

ہے پیش نظر انقلاب زمانہ ہر اک آج کی بات کل ہے فسانہ
ہر اک قافلہ ہو رہا ہے روانہ نہیں اس ٹھکانے کا کوئی ٹھکانہ
سمجھتا ہوں، دنیا میں، میں چند دن ہوں مگر پھر بھی بے فکر ہوں مطمئن ہوں
تعجّب تعجّب تعجّب تعجّب

میں کوشش میں خاک جہاں چھانتا ہوں پھر اس پر مقدر کو بھی مانتا ہوں
تعجّب تعجّب تعجّب تعجّب

اُسی لغویت میں، میں خود پھنس رہا ہوں مگر غیر کے فعل پر ہنس رہا ہوں
تعجّب تعجّب تعجّب تعجّب

کوئی کام نیکی کا کرتا نہیں ہوں خدا کو سمجھتا ہوں ڈرتا نہیں ہوں
تعجّب تعجّب تعجّب تعجّب

امجد (حیدرآباد)

غزلیات

از جناب منشی سید مہدی حسن صاحب احسن ڈرامسٹ لکھنوی

خودکشی کا مسئلہ گو موردِ الزام تھا
اتفاقاً میں وہ کر گذرا جو تیرا کام تھا

ہستیٔ فانی کا اک جلوہ برائے نام تھا
میں چراغ صبح تھا یا آفتاب شام تھا

فطرتاً احکام واعظ سے مجھے نفرت نہ تھی
عشق سے فرصت اگر ملتی تو اچھا کام تھا

تھی خلل انداز خلوت میں کشاکش نزع کی
روح کو گہوارۂ دل میں بہت آرام تھا

ہمسے ناحق ہے ہماری سخت جانی کا گلہ
آپ خنجر دیکھ لیتے یہ تمہارا کام تھا

لفظ کے معنی سمجھنے میں غلط فہمی ہوئی
موت یعنی عشق کا اک دوسرا بھی نام تھا

اک بیہوشی سے وابستہ رہی امید و بیم
چارہ گر خطرہ سمجھتے تھے مجھے آرام تھا

ہجر کی شب دیدۂ خونبار کے کام آگیا
وہ جو اک قطرہ لہو دل میں برائے نام تھا

احسن ارباب حسد کی ہمنے کچھ پروا نہ کی
دوست وہ کرتے رہے جو دشمنوں کا کام تھا

ازجناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی

نہیں ہے نام کو مہر و مروت مہ جبینوں میں
ادائے جانستاں کے اور کیا ہے ان حسینوں میں

وہ ظاہر ہوں کہ مخفی ہوں وہ ہر حالت میں ہیں دلکش
انوکھے ہیں، نرالے ہیں جہاں کے نازنینوں میں

ستم کوشی دل آزاری، جفا جوئی، وعیاری
بھری ہیں خوبیاں اس قسم کی لاکھوں حسینوں میں

خدا کی دین ہے یہ ہر کسی کو مل نہیں سکتی،
محبت گھر بناتی ہے ہمیشہ پاک سینوں میں

ہے باہر سرحد ادراک سے تیرا تصور بھی،
نظر آتی نہیں تصویر تیری دوربینوں میں

کیا کرتا ہے جو کسب ضیائے مہ لقاؤں سے
کہ اختر بھی ازل سے ہے تمہارے خوشہ چینوں میں

ازخاکسار عبدالرحمٰن خوشتر منگرولی مدیر رسالہ ہٰذا

شغل ہے عشق آدمی کے لئے
دل ہے سینہ میں دردہی کے لئے

رنج و فرقت ہے وصل ہی کے لئے
غم زمانے میں ہے خوشی کے لئے

گذر اپنا وہیں نہیں ہوتا
خاک اُڑاتے ہیں جس گلی کے لئے

بے قراری پہ میری کہتے ہیں
جان کیوں دے کوئی کسی کے لئے

کیا خبر تھی کہ جان جائے گی
دل لگایا تھا دل لگی کے لئے

لاگ ہو یا لگاؤ کچھ ہو ضرور
دہر میں لطف زندگی کے لئے

تم کو زیبا ادائے محبوبی،
ہم ہیں اے جان عاشقی کے لئے

ہم ہوں یا خضر یا ہوں عزرائیل
موت ہے ایک دن سبھی کے لئے

ہے شراب اک دوائے روح فزا
اس بڑھاپے میں شیخ جی کے لئے

کہتے ہیں وہ کہ لے ہم آئے ہیں
آج خوشتر تری خوشی کے لئے

تنقید و تبصرہ

اردو رسالے

الناظر (لکھنؤ) یہ رسالہ کم و بیش پندرہ سولہ سال سے برابر پابندی کیساتھ بزیرادارت جناب ظفر الملک صاحب علوی لکھنؤ سے نکلتا ہے شروع شروع میں یہ رسالہ نہایت شاندار نکلتا تھا ملک کے لائق اہل قلم اس کے خصوصی مقالہ نگار تھے ہر وقت اسکو اعلیٰ ترین بنانے میں کوشاں رہتے تھے۔ "نظرے خوش گذرے" کے پُر از معلومات اور چبھتے ہوئے فقرے دلوں کو تڑپا دیتے تھے ایک عرصہ تک اس کا یہی رنگ رہا لیکن افسوس کہ حوادث روزگار نے اسکو بھی ایک حالت پر نہ رہنے دیا تاہم اب بھی اس میں ایک نہ ایک علمی مضمون ضرور ہوتا ہے چنانچہ اگست ۲۶ء کے نمبر میں پروفیسر معتضد ولی الرحمن صاحب ایم۔اے کا طویل مضمون "منطق شہادت" نہایت پر مغز و کار آمد ہے اور خود ایڈیٹر صاحب کا مسلسل مضمون "سفر حجاز کی مختصر روداد" بھی روزنامچہ کی صورت میں خوب ہے۔

ستمبر نمبر میں جناب محمد خلیل الرحمن صاحب (صاحب اخبار الاندلس) کا تاریخی مضمون "تاریخ عرب" نہایت محققانہ ہے "شمع بے نور کا درد و ٹیپوں کا نزع" دلچسپ ہے سید محی الدین صاحب قادری زور (صاحب روح تنقید) نے بڑی تحقیق و تلاش سے "میرانیس کی شاعری کا ایک زبردست عنصر" ظاہر کیا ہے۔

غرضکہ الناظر اب بھی اردو اور ملک کی خدمات انجام دیتا رہتا ہے ہر سال ایک انعامی مضمون بھی ہوتا ہے جس میں اہل قلم کو اپنی محنت کا کافی معاوضہ مل جاتا ہے۔

الناظر میں سب سے زیادہ جو بات ہمیں نئی اور قابل تقلید نظر آئی وہ یہ ہے کہ اس میں "پچھلے مہینے کے رسالے" کے مستقل عنوان کے تحت موقت الشیوع رسائل کے اعلیٰ علمی مضامین کا اخذ و اقتباس یا اُن کی روح کھینچکر قارئین الناظر کو بھی مستفید کیا جاتا ہے۔

لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی ضخامت ۸۰ صفحے قیمت للعہ، پتہ الناظر پریس لکھنؤ۔

نگار (بھوپال) اس رسالہ کے بہترین ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے جبکہ اسکی عنان ادارت ملک کے ایک ایسے ادیب وانشا پرداز کے ہاتھ میں ہے جس کی جادو بیانی کا ایک عالم معترف اور جس کے اعلیٰ علمی وادبی ذوق نے ملک سے خراج تحسین وصول کرکے اپنی قابلیت کا لوہا منوا لیا ہے۔

حضرت نیاز فتحپوری ملک کے ان مستثنیٰ انشا پردازوں میں سے ہیں جن کا ادب اردو پر دست احسان ہے آپ کے ادبی شہ پارے اس قابل ہیں کہ تاریخ ارتقائے ادب میں زریں حروف سے لکھے جائیں ہم یہ دیکھ کر بیحد خوش ہیں کہ ملک نے ان کی علمی و ادبی خدمات کی قدر بھی ویسی ہی کی جیسکے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔

چار پانچ سال کا عرصہ ہوا جب "نگار" اپنے آتشیں رخسار کی ضیا پاشیاں کرتا ہوا دنیائے ادب میں جلوہ افگن ہوا تھا عناصر نگار میں چند ایسے نفوس بھی تھے جن کے ادبی مضامین نے دنیائے ادب میں ایک تازہ ہلچل اور نئی روح پھونک دی تھی خصوصاً صاحب لالرخ (لطیف الدین احمد) کے لازوال ادبیات نگار کی حیات وشہرت کے اصلی باعث ہیں۔ لیکن اب مدت سے حضرت نیاز ان سے بے نیاز ہو گئے ہیں اس کی وجہ غالباً یہ ہو کہ اب نیاز صاحب نگار کو ادبی رنگ (ادب لطیف) سے پاک رکھنا چاہتے ہیں جیسا کہ اکثر انکے گذشتہ "ملاحظات" سے ظاہر ہے وہ چاہتے ہیں بلکہ محسوس کرتے ہیں کہ ادب لطیف کا اردو کے خزانہ میں اسقدر سرمایہ جمع ہو گیا ہے کہ اب ملک کو اس کی قطعی ضرورت نہیں ہے بلکہ اب ٹھوس مضامین کی طرف عوام کو رغبت دلائی جائے اور ایسے علمی مضامین صفحات نگار میں پیش کئے جائیں جس سے ناظرین کو جائز طور پر فائدہ پہنچے اگرچہ ایک حد تک نگار کو اس میں کامیابی ہو رہی ہے مگر اس میں صرف ٹھوس اور علمی مضامین ہی کا انبار نہیں ہوتا بلکہ اس میں اس امر کا التزام بھی کیا جاتا ہے کہ ٹھوس مضامین کے پڑھنے کے بعد دماغ کی تکان دور کرنے کے لئے ایک دو دلچسپ فسانے عمدہ نظمیں متین ظرافت، اور کبھی کبھی طنزیات پر بھی کوئی مضمون بہم پہنچایا جاتا ہے۔

زیر نظر نمبر (اکتوبر و نومبر) بھی اپنی گوناگوں خوبیوں سے مالامال ہے "مطالعہ شاعری"۔ "محمد بن ابی عامر" اور "لارڈ ریڈنگ کا عہد حکومت"، خوب مضمون ہیں "روح تنقید کی ضرورت اور مخالفین کے اعتراضات کا جواب بھی محنت سے لکھا گیا ہے فسانوں میں شکست عہد اعانت مجرمانہ اور "مرتضیٰ جاسوس"، اپنی نوعیت کے لحاظ سے اچھے ہیں نومبر نمبر میں "میر تقی میر کے خارجی حالات کی ترجمانی"، خوب کی گئی ہے "اثر دہلوی"، اور "بدیہہ گوئی"، بھی ادبی مضمون اچھے ہیں تاج محل (آگرہ) کے متعلق مسٹر اولڈوس ہکسلے کے اعتراض کا جواب اگرچہ

تشنہ ہے لیکن ایک متعصب انگریز کے جواب کی طرف اُردو میں سب سے پہلے نگار نے اعتنا کی اُمید کا اسکے متعلق واقفیت رکھنے اور فن تعمیر سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب ایڈیٹر صاحب کی درخواست پر توجہ فرماکر اس مشرق کی بہترین عمارت کی نسبت معترض کے اعتراض کا مدلل و شافی جواب دینگے

اس نمبر کے فسانوں میں ایڈیٹر صاحب کا فسانہ "نقاب اُٹھ جانیکے بعد،، ہمارے ہندوستانی پیران طریقت کی توجہ کے قابل ہے۔ یہ اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہے امید کہ ایڈیٹر صاحب اس سلسلہ کو جاری رکھکر پیری مریدی کی بے تکلف مگر شرمناک رسومات کو اور بھی بے نقاب کرینگے

نگار کی قبولیت عام کی سب سے بڑی وجہ "استفسارات،، ہے جسمیں ایڈیٹر صاحب کیطرف سے نہایت قابلانہ اور محققانہ جوابات ہوتے ہیں یہ سلسلہ اب ادبی داعلی طبقہ میں اسقدر پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے کہ جس نمبر میں ایڈیٹر صاحب کی مصروفیتوں کے باعث یہ مستقل عنوان نہیں ہوتا تو ناظرین کو سخت ناگوار گذرتا ہے۔ ہم ایڈیٹر صاحب کو صلاح دینگے کہ نگار نے باوجود چند سالہ عمر کے اپنے دامن میں جن جواہر پاروں (اشعار و جوابات) کو جمع کیا ہے وہ اسقدر اہم اور ضروری ہیں کہ اُنہیں علیحدہ علیحدہ فنون کی حیثیت سے ترتیب دیکر بہت جلد کتابی صورتمیں شائع کرادیئے جائیں تاکہ خواص و عوام کی معلومات کیلئے ادب اردو میں ایک بیش بہا سرمایہ فراہم ہوجائے۔

سائز ۲۰×۳۰ لکھائی چھپائی خاصی حجم ۹۶ صفحات سالانہ صرف جو اتنے بڑے رسالہ کیلئے بہت کم ہے۔ پتہ نور محل بھوپال۔

نظر۔ یہ چھوٹا سا مگر خوشنما رسالہ پہلے پہل ترچھی نظر بنکر نکلا تھا اور اب صرف "نظر،، ہو کر دار الادب لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے اس کے مدیر اعزازی جناب سید فدا حسین صاحب بی۔ اے ہیں اور اراکین ادارت خصوصی ہیں چار نام اور ہیں یہ پانچوں نظر کے حواس خمسہ ہیں اور انہیں کی مساعی جمیلہ سے نظر اپنی نظر فریبیوں سے شائقین ادب کے دلوں کو لبھاتا رہتا ہے۔

اس رسالہ میں اگرچہ ادبی مضامین کا عنصر غالب ہوتا ہے تاہم بعض دفعہ اچھے مضامین بھی نظر آجاتے ہیں چنانچہ اگست نمبر میں جناب ایم۔ ایس عبدالرحمن صاحب وارثی کا مضمون "تعلقات ازدواجی،، اور ستمبر نمبر میں الف لیلی کے متعلق جناب مسعود الرحمن صاحب ندوی کا محققانہ مضمون اچھا ہے۔

لیکن ہم مدیران خصوصی میں سے جناب آمین سلونوی کو یہ ہدایت ضرور کرینگے کہ وہ ادبی زادب لطیف، مضامین کے انتخاب میں ذرا سختی سے کام لیں اور ایسے مضامین اول تو قابل اندراج ہوتے ہی نہیں ہیں اور اگر اس سے رسالہ پورا کرنا ہی مقصود ہو تو اور بات ہے۔ ایسے ادبی مضامین غائر نظر سے دیکھے جانے کے محتاج ہوتے ہیں کیونکہ ان میں بیشتر حصہ مہملات اور بھاری بھاری الفاظ کے استعمال پر مشتمل ہوتا ہے چنانچہ "وفائے عہد،، میں لفظ چکاں کا کوئی دس بارہ جگہ استعمال کیا گیا ہے اور ہر جگہ عجیب وغریب ترکیبوں

کے ساتھ مثلاً ترنم چکاں - فردوس چکاں - گریہ چکانی - سیم چکانیوں - بہار چکاں - قمر چکاں - علم چکاں تنویر چکانیاں وغیرہ اسی طرح لرزش اور لرزاں کا بھی جا بجا استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ جدت کیا تھہ لہذا حضرت آمین صاحب سلونوی کا فرض ہے کہ حتی الوسع ایسے مسموم لٹریچر سے نظر کو بچائے رکھیں - لکھائی چھپائی اور کاغذ اوسط ضخامت ۴۸ صفحے سالانہ تین روپے ' ذرنظر'

پیمانہ (آگرہ) یہ رسالہ شروع میں جناب ساغر صاحب کی زیرادارت چھوٹی تختی پر نکلتا تھا اب کچھ عرصے سے ۲۰×۲۶/۸ سائز پر با تصویر نکلنا شروع ہوا ہے جسکے مدیر اعلیٰ حضرت سیماب اکبرآبادی اور مدیر ثانی ساغر صاحب ہیں ابتداءً ایڈیٹر صاحب کی جدت آفرین طبیعت سے "رنگریات" کے رنگ میں نہایت عریاں اور حیاسوز جذبات نکلتے تھے جس میں علاوہ مہملات کے غیر مانوس الفاظ اور نئی نئی لایعنی ترکیبوں کی بھرمار ہوتی تھی - جس پر معاصرین نے بہت کچھ تنقید کی خصوصاً اودھ پنچ کی سال گذشتہ کے فائل میں "ساغر و پیمانہ" پر کئی مسلسل مضامین شائع ہوئے ہیں مضمون نگار نے پیمانہ کی بعض ایسی فاحش غلطیاں تبلائی ہیں جنکو تسلیم نہ کرنا ہٹ دہرمی ہے اگر اسکے اس حصہ کو جس میں ساغر و سیماب پر بعض بیجا حملے اور فحش الزامات عائد کئے گئے ہیں نظر انداز کر دیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ مضمون نگار نے بعض ایسے وقیع لٹریری اعتراضات کئے ہیں جو پیمانہ کی پیشانی پر ہمیشہ کلنک کے ٹیکے کی طرح روشن رہیں گے۔

چند ماہ ہوئے پیمانہ کو آگرہ سے لاہور منتقل کیا گیا تھا لیکن وہاں کی آب و ہوا راس نہ آنے پر پھر آگرہ آ گیا ہے جہاں سے زیر نظر مشترکہ نمبر (ستمبر و اکتوبر) نکلا ہے۔

مستقل عنوانات میں سے "جرعات" "ساغر و پیمانہ کی رعایت سے" بجائے ایڈیٹوریل یا شذرات کے ہے ہر مستقل عنوان کے مضامین کی علیحدہ علیحدہ فہرست ہوا کرتی ہیں جس میں فضول ایک ایک صفحہ رکا جاتا ہے شاید ایڈیٹر صاحب پیمانہ کے نزدیک زبان کے تمام مکتوبی سوا ادبیات میں شامل ہیں اسی لئے "دل اتحاد کے تقاضے اور دنیا کا مستقبل" "قانون تمدن اور سیاسات مدن" اور "شاہجہاں کا یومیہ پروگرام" "ادبیات کے مستقل عنوان کے تحت میں آ گئے ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر اچھے ہیں - لسانیات میں بھی تمام مضامین اچھے ہیں - نظموں میں ساغر صاحب کی نظم "چاند کا تبصرہ ماضیات عالم پر" جدید طرز پر لکھی گئی ہے جو طویل ہونے کے باعث دو نمبروں میں ختم ہوئی ہے اور آٹھ نو صفحوں پر حاوی ہے "شاعری" پر جناب محمود صاحب اسرائیلی کی نظم خوب ہے اسی طرح ملکہ شعریت، عورت کا دل، موجوں کے ساز پر ملاح کا گیت وغیرہ اچھی نظمیں ہیں الہامات کے تحت میں بھی تمام غزلیں اساتذہ حال کی فراہم کی گئی ہیں۔

ادیب مرحوم کی طرح تصویر کے متعلق ایک نظم بھی تی ہے چنانچہ شروع میں ایک یورپین لیڈی کی مغربی مذاق کی تصویر ہے جو "بہار شباب" سے موسوم کی گئی ہے اور جس پر جناب منظر صاحب صدیقی نے نظم میں اظہار خیال فرمایا ہے۔ دوسری تصویر "کابل کی عیدگاہ کا دروازہ" ہے جو افغانستان کے جدید دور تمدن کا ثبوت ہے۔ رسالہ میں ایک کارٹون بھی دیا گیا ہے جو ایک ادبی رسالہ کے لئے کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتا۔ بہر حال رسالہ اچھا ہے۔

لکھائی چھپائی اور کاغذ خاصہ ہے ضخامت ۸۰ صفحات سالانہ قیمت ۱ (پتہ: دارالادب آگرہ سے ملسکتا ہے)

نیرنگ (رامپور) یہ رسالہ بھی پہلے چھوٹی تختی پر جناب محمد عزیزاللہ صاحب عزیز۔ ایچ۔ پی کی ایڈیٹری میں نکلتا تھا اب بڑی تختی ۴۸ صفحات پر برابر پابندی کے ساتھ رامپور سے شائع ہوتا ہے اس میں زیادہ تر شاعرانہ چھیڑ چھاڑ اور تنقیدی مضامین ہوا کرتے ہیں چنانچہ زیر تبصرہ نمبر اگست ستمبر و اکتوبر میں بالترتیب استحکام شکوک، اشعہ حقیقت، عروض واقف، دور حاضرہ کی شاعری، اور ایک عروضی تحقیق، وغیرہ مضامین شائقین شعر و سخن کے لئے بہ کار آمد ہیں بعض مضامین کا لہجہ ذرا سخت ہے کیا اچھا ہو اگر اعتراضات نیک نیتی پر مبنی ہوا کریں اور کسی ذاتی مخاصمت کی بنا پر خواہ مخواہ کسی کو نشانہ ملامت نہ بنایا جائے کہ اس سے بجائے فائدہ پہنچنے کے ناظرین خصوصًا مبتدی شعراء کے اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے۔

حضرت شوق قدوائی کی مثنوی "حسن" پر ہمارے زبردست اور پورانے انشا پرداز خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب کا مسلسل تنقیدی مضمون بھی خوب ہے۔

اکثر نظمیں بہت اچھی ہیں خصوصًا جناب سید کلب احمد صاحب مانی جالسی کی نظم "مناظرہ حسن و عشق" لیکن سخت تعجب ہے کہ ہم اسی نظم کو یہ تیسری مرتبہ چھپی ہوئی دیکھ رہے ہیں اول اول العصر (لکھنو) میں پھر اس کے دو تین سال بعد نقاد (آگرہ) میں اور اب کئی سال کے بعد نیرنگ میں دیکھ رہے ہیں۔ نیرنگستان (شذرات نیرنگ) کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید ایڈیٹر صاحب نیرنگ نے مانی صاحب کے صاحبزادہ سے مانی صاحب کے کلام کی درخواست کی ہوگی اور انہوں نے مانی صاحب کی بیاض سے نقل کر کے یہ نظم روانہ کر دی ہوگی اس میں بظاہر ایڈیٹر صاحب نیرنگ کا کوئی قصور نہیں ہے مضامین بھیجنے والے حضرات اس کے ذمہ دار ہیں انہیں ایسے مطبوعہ مضامین کے دوبارہ چھپوانے سے احتیاط کرنا چاہیے

رسالہ میں اکثر شعراء کے خطوں کے عکس بھی دیئے جاتے ہیں۔ مضامین کے لحاظ سے رسالہ برا نہیں لکھائی چھپائی اور کاغذ معمولی قیمت سالانہ ۸ ہے۔

پتہ: منیجر رسالہ نیرنگ ریاست رامپور،

دل (آگرہ) یہ چھوٹا سا دلکش و دیدہ زیب رسالہ جناب حکیم سید وصی حسن صاحب شباب اکبر آبادی نے اپنی ادارت میں محض ادبی خدمات کو سرانجام دینے کی غرض سے جاری کیا ہے اور ایک حد تک اسکو اسمیں کامیابی ہو رہی ہے۔ آگرہ کے مشہور ادیب جناب لطیف الدین احمد صاحب، حافظ امام الدین صاحب، شفیع احمد صاحب شفیع اکبر آبادی اور مخمور صاحب ایسی مقتدر و مستند ہستیاں اس کو بہترین ادبی رسالہ بنانے میں کوشاں ہیں نقاد مرحوم کے بھی بعض خصوصی مقالہ نگار گاہے ماہے اسمیں نظر آجاتے ہیں یعنی مولوی محمود الرب صاحب خالد بنگالی اور مولوی نذیر علی صاحب درد کاکوروی وغیرہ۔ کتابت و طباعت اور کاغذ بہتر حجم ۳۲ صفحے سالانہ عہ

پتہ۔ گڈھیا حکیمان آگرہ سے طلب فرمائیے۔

ظل السلطان (بھوپال) دار الاقبال بھوپال کا یہ زنانہ لٹریچر کا ماہانہ رسالہ برابر دس سال سے اپنی مسلسل خدمات انجام دے رہا ہے زنانہ لٹریچر کے اور بھی بہت سے رسالے نکلے اور ناقدردانی فرمانے کے ہاتھوں فنا ہوگئے اب بھی کئی رسالے نکلتے ہیں اور آئے دن نکل رہے ہیں لیکن اس نے خواتین ہندوستان کے کار آمد مضامین کا بسقدر ذخیرہ بہم پہنچایا ہے کسی نے نہیں پہنچایا۔ نیز یہ فخر بھی اسی رسالہ کو حاصل ہے کہ اس کی ناظرات اور مسلسل پڑھنے والیاں آج ملک کی اچھی انشاپردازوں میں شمار کی جاتی ہیں۔

آجکل بعض زنانہ رسائل میں اکثر انشاپرداز خواتین کے قلم سے نکلے ہوئے نہایت مخرب اخلاق اور پایہ ارتقا سے گرے ہوئے مضامین بھی ہوتے ہیں لیکن ظل السلطان کی یہ خوبی خصوصیت سے قابل ذکر ہے کہ اس نے اپنے دامن کو ان آلودگیوں سے ہمیشہ پاک و صاف رکھا اور اپنے سنجیدہ معیار سے ذرا بھی ہٹنے نہیں پایا اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس میں ابتداً جن چند متبرک و مقتدر ہستیوں کے مضامین نکلتے تھے اب ان سے محروم ہے لیکن اس سے رسالہ کی شان میں کوئی فرق نہیں آنے پایا خصوصاً جب سے جناب سید محمد یوسف صاحب قیصر نے اس کی ادارت کا بار اپنے ذمہ لیا ہے رسالہ کو چار چاند لگ گئے ہیں۔

زیر تنقید ستمبر نمبر میں "تعیمہ کی سرگذشت" ناظم زادہ نے خوب لکھی ہے اور افادات رسکن سے "عورت" کے متعلق محمد عبدالجلیل صاحب نے بڑی محنت سے اقتباس کیا ہے اور عباسی بیگم صاحبہ کا "صحرا کا پھول" بھی سبق آموز (فسانہ) خوب ہے جو مسلسل ہے اکتوبر کے رسالہ میں "حفظ الاطفال" حکیم محمد ابراہیم صاحب کا حکیمانہ مضمون بار بار پڑھنے اور یاد رکھنے کے قابل ہے "مسلمانوں میں تعلیم نسواں کی ترقی کی تدبیریں" بمحترمہ فاطمہ بیگم صاحبہ کا وہ انعامی مضمون ہے جو ایڈیٹر اخبار "دربار" کے مضمون نگار خواتین کی ہمت افزائی کے خیال سے اسی

موضوع پر انعامی مقابلہ کے اعلان پر لکھا گیا تھا اور جس پر بعد انتخاب موصوفہ اور رخیر النساء صاحبہ نے انعامات حاصل کئے تھے اس مضمون میں نہایت مفید اور قابل عمل تجاویز پیش کی گئی ہیں۔ "والدین اولاد کی شادی کرتے وقت کن باتوں کا لحاظ کرنا چاہئے"، اور "اسلام میں عورت کا درجہ" اہلیہ مولوی سعد الدین حیدر صاحب اور اہلیہ نصیر الدین صاحب ہاشمی نے اچھے مضمون لکھے ہیں اس کے علاوہ حضرت قیصر صاحب ہر ماہ کشکول میں نایاب جواہر پارے جمع کرتے ہیں۔ اور کبھی عالم نسواں کی خبروں سے بھی ناظرات ظل السلطان کو واقفیت بہم پہنچایا کرتے ہیں

غرض کہ رسالہ اپنی خوبیوں کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ ہندوستان کے ہر خواندہ اور ناخواندہ مرد و زن کو اسکا پڑھنا اور سننا نہایت ضروری ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ برا نہیں حجم ۸۴ صفحے سالانہ تین روپئے۔

پتہ :۔ مینیجر رسالہ ظل السلطان بھوپال

اقتباس (بمبئی) یہ دیکھ کر کہ اب بلدۂ بمبئی جہاں دنیا بھر کے اسباب تعیش کی فراوانی۔ دولت کی ارزانی اور ہر قسم کے لہو و لعب کی افراط ہے وہاں اب علمی مذاق کی بھی روز افزونی ہے، بے اندازہ مسرت حاصل ہوتی ہے اگرچہ آج سے بہت پہلے یہاں سے بہت سے ادبی رسالے نکلتے تھے لیکن وہ یا تو تمام تر شاعرانہ مطارحات پر مبنی ہوتے تھے یا شعراء بمبئی کے باہمی مجادلہ کا میدان ہوتے تھے جسمیں اس مبحث سے ہٹ کر ایک دوسرے پر نہایت شرمناک حملے کئے جاتے تھے۔

اگر ہماری یادداشت غلطی نہیں کرتی تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ بمبئی کے ابتدائی گلدستوں میں برق، منور شفاعت، ارمغان فرخ، غنچہ جاوید، آفتاب، معلومات الوارث، شکسپیر، اور لبرل اپنے مقاصد و اغراض باحسن الوجوہ ادا کرتے تھے، موخر الذکر دو تین رسالے مخزن کے تتبع میں بہت کچھ علمی خدمات انجام دیتے تھے خصوصاً حضرت ناظم لکھنوی کا لبرل اور ان کے استاذ حضرت ناطق سرسوی کا معلومات الوارث صحیح معنوں میں علم و ادب کی خدمت کرتے تھے اس کے بعد ایک طویل عرصے تک اہل بمبئی پر ایک جمود کا عالم طاری رہا اور اگر اس درمیان میں کوئی گلدستہ نکلا بھی تو اس کا عدم و وجود یکساں رہا۔

لیکن مسرت کا مقام ہے کہ اب اسی مقام سے طویل خاموشی کے بعد چند بہترین رسالے نکل رہے ہیں چنانچہ انوار القدس (صوفیانہ) انجمن اشاعت اردو کی طرف سے اقتباس، انجمن معین الادب کی جانب سے ادبستان علمی و ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ان میں **اقتباس** سب سے چھوٹی اور چار جزو کا رسالہ ہے جس کی عنان ادارت جناب شبر صاحب بدایونی کے ہاتھ میں ہے اقتباس کا ساتواں نمبر بابت ستمبر سنہ ۲۶ء ہمارے پاس بغرض تنقید موصول ہوا ہے۔ اس میں پہلا مضمون "ہماری چند انشا پرداز خواتین" جناب حامد اللہ صاحب افسر بی۔ اے میرٹھی کا لکھا ہوا ہے

فاضل مضمون نگار نے چند مضمون نگار خواتین کے اُن جذبات عریاں پر جو انشائے لطیف کے نام سے ملک کے بعض ادبی رسائل میں رہتے ہیں تہدید کی ہے اور جا بجا ان کے ان حیا سوز مضامین کے نمونے بھی درج فرمائے ہیں جن سے نہ صرف خواتین کو احتراز کرنا چاہئے بلکہ ہمارے شعرا اور ادب لطیف کے شیدا ادیبوں کو بھی پرہیز کرنا چاہئے۔ یہ مضمون "نگار" سے اقتباس کیا گیا ہے لیکن اس کا حوالہ نہیں دیا گیا اسیطرح حضرت نیاز کا فسانہ "فریب خیال" بھی نگار سے بلا حوالہ نقل کیا گیا ہے "بیحجابی اور تعلیم نسواں کا چوتھا نظارہ" میں جناب فصیح الزماں صاحب نے مرد کے مقابلہ میں عورت کی عدم افضلیت کا نہایت عالمانہ اور محققانہ ثبوت پیش کیا اس مضمون کے تین نظارہ اگلے نمبروں میں نکل چکے ہیں۔

ایڈیٹر صاحب اقتباس کی خدمت میں کیا ہم یہ مشورہ پیش کرسکتے ہیں کہ انتخاب و اقتباس مضامین میں بلند حوصلگی سے کام لیں کہ مضامین اقتباس کے لئے بہت وسعت ہے

بہرکیف رسالہ کی ابتدائی حالت اچھی ہے سالانہ ۸ر

پتہ: ۔ تادر بلڈنگ بمبئی نمبر ۸

ادبستان ۔ یہ بھی بمبئی کا ایک باتصویر ادبی رسالہ ہے جو جناب رشید صاحب صدیقی کی ادارت میں ستمبر ۱۹۲۶ء سے نکلنا شروع ہوا ہے پہلے نمبر میں جناب قمر احمد صاحب بی۔اے ال۔ال۔بی۔ مدیر روزنامہ خلافت بمبئی نے "مذاق شاعری" خوب لکھا ہے "اسلام ملوکیت" پر راجہ غلام حیدر خانصاحب نے نتیجہ خیز مضمون ملک نامور انشا پرداز جناب سلطان حیدر خانصاحب جوش نے اپنے مخصوص رنگ میں "دعائے نیم شبی" میں ایک فرضی آنریبل ایم سی (ممبر آف دی کالنسل) کا مضحکہ خیز خاکہ اڑایا ہے۔ باقی تمام مضامین مبتذل اور غیر مفید ہیں نظموں میں جناب محمود اسرائیلی کی نظم کوئل اور مولینا وحیدالدین صاحب سلیم کی غزل خوب ہے۔

اکتوبر نمبر میں "اردو رسائل کا کیا نصب العین ہونا چاہئے" راجہ غلام حیدر خانصاحب نے خوب لکھا ہے بلکہ سارے رسالے میں یہی ایک کام کا مضمون ہے۔

کیا اچھا ہو اگر ایڈیٹر صاحب مضامین نظم و نثر کے انتخاب میں وسیع النظری سے کام لیں کہ نوآموز مضمون نگاروں کی رعایت اور حوصلہ افزائی سے رسالہ اپنے معیار سے گرجاتا ہے۔

تیسرا نمبر اگلے دو نمبروں سے اچھا نکلا ہے اسمیں مضامین بھی اچھے ہیں چنانچہ "انگلستان کے سیاح" "سلطان صلاح الدین" اور "تنظیم کے چار پہلو" قابل مطالعہ ہیں امید ہے کہ اسیطرح آیندہ نمبر میں بھی کام کے مضامین فراہم کئے جائیں گے۔

تصاویر کی نسبت بھی اتنی عرض ضرور کریں گے کہ نظر انتخاب سے کام نہیں لیا جاتا اکتوبر نمبر میں "نور محل" کے نام سے جو رنگین تصویر زیب ادبستان کیگئی ہے وہ بمبئی کے ایک ہفتہ وار گجراتی رسالہ "بیسویں صدی" کے دیوالی نمبر سے لیگئی ہے جسمیں شہنشاہ جہانگیر کا کیرکٹر اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ لب جو ہے رقص و سرود کی بزم گرم ہے اور جہانگیر "رام رنگی" کے مزے اڑا رہا ہے اسی طرح نومبر نمبر میں "نغمہ" غالباً کسی رنڈی کی تصویر ہے جو ادبستان کے لئے کسی طرح بھی زیبا نہیں ہوسکتی۔

اگر ایڈیٹر صاحب ان فروگذاشتوں کے دور کرنے کی

کوشش فرمائیں گے تو ادبستان واقعی "ادبستان" کہلائے جانیکا مستحق ہو جائیگا۔

لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ سائز ۲۰/۲۶ ضخامت ۴ جزو سالانہ للعہ، پتہ :- مینیجر صاحب ادبستان داور مین روڈ بمبئی نمبر ۱۴

حرم (پیلی بھیت) ضرورت تھی کہ ملک سے ایک ایسا رسالہ جاری کیا جائے جو نسوانی علاج معالجات پر مشتمل ہو تسکین کہ اس غرض کو لیڈی ڈاکٹر بیگم عبدالغفور صاحب ایل۔ ایم۔ پی نے بخوبی پورا کر دیا ہے اس میں تمام تر ایسے مضامین ہوتے ہیں جن کا جاننا عورتوں اور مردوں کے لئے نہایت ضروری ہے چنانچہ نمبر ۳ بابت ماہ جون میں "طویل العمری" اور "تشنج اور حمل" ایڈیٹرس صاحبہ کے "قلم سے نکلے ہوئے مضامین نہایت مفید و کار آمد ہیں علاوہ ازیں ادبی، اخلاقی، اقتصادی اور امور خانہ داری پر بھی بعض اچھے مضمون ہیں خصوصاً "اردو شاعری اور ہندو عورتیں" "مصر کی ترقی و اقتصادی حالت پر ایک اجمالی نظر" خوب ہیں اخیر میں بطور ضمیمہ ڈاکٹر عبدالغفور صاحب کا تکمیل تاریخ طب اسلامیہ پر مسلسل لکچر نہایت محققانہ اور پر از معلومات ہے۔

جولائی و اگست کے مشترکہ نمبر میں بھی "پیدائشی آشوب چشم" "عسرت الطمث" اور ایام حمل طبی مضمون قابل قدر ہیں جناب مدیرہ صاحبہ کی جانب سے طبی معلومات بھی خوب بہم پہنچائی گئی ہیں، ملک کی قابل فخر اور مشہور ادیبہ جناب نذر سجاد حیدر صاحبہ کا اخلاقی فسانہ "شادی خانہ بربادی" قابل قدر ہے۔ ب۔ ج صاحبہ کا "ایک عجیب خط" ادبی رنگ آمیزیوں سے بھرا ہوا ہے جس کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ بعض ادب لطیف کے شائق "جنس گریخت" کی طرح "جنس لطیف" میں بھی ایسی رنگین عبارت آرائی کرنے والی موجود ہیں۔ مدیرہ فاضلہ نے اس خط کو محض اس غرض سے شائع کیا ہے کہ "یہ طرز تحریر عورتوں کیلئے کہاں تک قابل تقلید ہو سکتا ہے؟" جہانتک ہمارا خیال ہے عورتوں اور مردوں کو ایسی ناکارہ عبارت آرائی سے جسمیں مطلب کم اور غیر ضروری الفاظ کی بھرمار ہو پرہیز کرنا چاہیے کہ اس سے ملک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا ہمیشہ مفید مطلب اور کام کی باتیں لکھنا چاہیئیں۔

ستمبر نمبر میں بھی بعض مضامین بہت اچھے ہیں۔ بچوں کی صحت و ذہنیت، دودھ، گندہ دہنی، اور عورتوں کے لئے کام کی باتیں، اس نمبر کے طبی مضامین ہیں "ہمارے رہنماؤں کی پست خیالی" پر جناب نذر سجاد حیدر صاحبہ کی بلند خیالی قابل داد ہے اور کلکتہ میں ایک لاکھ زنان بازاری، اور ملک کی ترقی عورت کے ہاتھ میں ہے، قابل عمل و مطالعہ مضمون ہیں۔

یہ دیکھ کر ہمیں بڑی مسرت حاصل ہوتی ہے کہ اس رسالہ کا مقصد اجرا یہ ہے کہ :-

"اس رسالہ سے جو کچھ آمدنی ہوگی وہ غریب اور بیمار عورتوں کے علاج پر صرف کیجائیگی" ہم بزور سفارش کرتے ہیں کہ ملک کے تمام خواندہ اور ناخواندہ افراد اس کے خریدار بن جائیں کہ اس سے اپنا اور دوسروں کا بھی بھلا ہو گا۔

تختی چھوٹی ضخامت ۳ جزو لکھائی چھپائی بھی بری نہیں سالانہ تین روپیہ۔

پتہ :- دفتر حرم محلہ کھہان پیلی بھیت (یو۔ پی)

اخبار علمیہ

درختوں کو رنگنے کی صنعت

جرمن کے مشہور سائنسداں فرٹز وان بہر (Fritz - von - Behr) نے درختوں کو مختلف رنگوں سے رنگنے کی عجیب و غریب صنعت ایجاد کی ہے - وہ پوشیدہ طریقے سے عمل کرکے ایک معمولی (Beech) کے درخت کو گلاب کے پیڑ میں اور بھوج پتر کے درخت کو مہاگنی (Mahogany) میں تبدیل کرلیتا ہے - تجربہ کار رنگ سازوں اور فرنیچر بنانے والوں کو باوجود تحقیق و تفتیش کے اسکا راز معلوم نہیں ہوسکا - یہ رنگ سطحی نہیں بلکہ درخت یا لکڑی کے اندر پیوست ہوکر پھر کبھی زائل نہیں ہوتا - اس قسم کی رنگین لکڑیوں سے کئی اشیا رتیار کی گئی ہیں -

عصبی امراض کا سبب

امریکہ کے نامی اطبار نے، جو عرصۂ دراز سے اپنی تحقیقات میں مصروف تھے، معلوم کرلیا ہے کہ تمام امراض عصبی مثلاً التہاب اعصاب، ضعف اعصاب، ذیابیطس، عرق النسا، وجع القطن، وجع العصب وغیرہ زیادہ تر اعصاب کی میکانکی حرکت سے پیدا ہوتے ہیں، اور اس حرکت و تہیج کا مرکز وہ ہڈی ہے جو کمر کے نیچے اس جگہ واقع ہے جہاں کولہے کی ہڈیاں (ایک حلقہ میں) جڑی ہوئیں ہیں - انھوں نے اس کا تجربہ کرکے دکھایا کہ اس ہڈی کے اپنی جگہ سے ذرہ بھر ہٹنے پر ان جوڑوں کے ذریعہ تمام اعصاب پر دباؤ پڑتا ہے جس سے یہ امراض پیدا ہوتے ہیں - اگر اس ہڈی کو اپنی اصلی جگہ پر بٹھا دیا جائے تو ان کا دعویٰ ہے کہ مریض کو جلد آرام ہوجائیگا -